امیر المومنین امام علی علیہ السلام

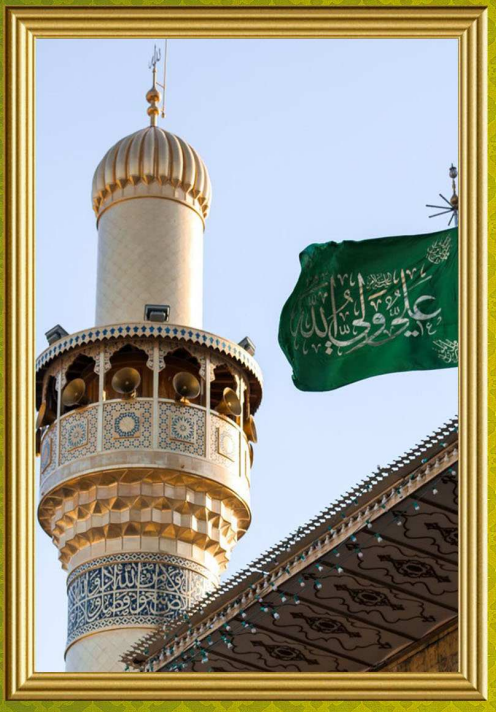

سیّد حماد رضا بخاری

امیر المومنین امام علی علیہ السلام

سیّد حماد رضا بُخاری

نام کتاب	امیر المومنین امام علی علیہ السلام
مؤلف	سیّد حماد رضا بخاری
ناشر	بخاری پبلی کیشنز، فیصل آباد
کمپوزنگ	سیّد حماد رضا بخاری
پروف ریڈنگ	سیّد محمد ابوذر بخاری
	سیّد محمد ابوتراب بخاری
طبع اوّل	اپریل ۲۰۲۴ء
تعداد	۱۰۰۰
ای میل مؤلف	hrbukhari@hotmail.com
فون نمبر	+923009655650

فہرس

ہدیہ	۱۴
انتساب	۱۵
تمہید	۱۶
ولادت علی ابن ابی طالب علیہ السلام	۱۷
خانہ کعبہ میں ولادتِ علی علیہ السلام سے متعلق اہل سنت اکابرین کے اقوال	۱۸
نسبِ علی علیہ السلام	۲۶
آباؤ اجداد	۲۷
حضرت ابراہیم علیہ السلام	۲۷
حضرت اسماعیل علیہ السلام	۲۸
حضرت فہر قریش	۲۸
حضرت قُصی	۲۹
حضرت عبد مناف	۳۰
حضرت ہاشم	۳۰
حضرت عبدُ المُطلب شَیبۃُ الحمد علیہ السلام	۳۱
والد گرامی حضرت ابُو طالب بن عبد المطلب علیہ السلام	۳۳
والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام	۳۶
علی علیہ السلام کے نام اور القاب	۳۸
پرورش امیر المومنین علی علیہ السلام	۴۰
حلیہ مبارک امیر المومنین علی علیہ السلام	۴۳
لباسِ امیر المومنین علی علیہ السلام	۴۴

طعامِ امیر المومنین علی علیہ السلام	۴۵
اوصافِ امیر المومنین علی علیہ السلام	۴۷
ولایتِ علی علیہ السلام اہل سنت علما کی نظر میں	۴۹
پہلی باجماعت نماز (امام سیّد الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماموم امیر المومنین علیہ السلام)	۵۲
دعوتِ ذوالعشیرہ	۵۴
معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۵۸
شجرہ طوبیٰ	۶۲
مقصدِ معراج	۶۴
کیا حضرت علی علیہ السلام شریکِ معراج تھے؟	۶۸
معاشرتی مقاطعہ	۷۱
حضرت ابوطالب علیہ السلام کی وفات	۷۵
حضرت ابوطالب علیہ السلام کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قریش کی دست درازیاں	۷۹
ہجرتِ مدینہ	۸۰
حضرت علی علیہ السلام بسترِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر	۸۰
مدینہ طیبہ	۸۵
مسجد نبوی میں گھر	۸۵
مواخات	۸۷
غزوۂ بدر	۸۹
حضرت علی علیہ السلام کی علم برداری	۹۲
معرکہ حق و باطل	۹۲
علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی شجاعت	۹۵
علی علیہ السلام کے ہاتھوں تہِ تیغ ہونے والے چند مشہور کافر	۹۵
غزوۂ قرقرۃ الکدریٰ یا غزوۃ الکُدر	۸۹

امیر المومنین علی علیہ السلام اور سیّدۃُ نساء العالمین علیہا السلام کا عقد	۹۸
حضرت علی علیہ السلام کی زبانی شادی کی روایت	۱۰۱
خاتونِ جنّت علیہا السلام کا حق مہر	۱۰۳
سیّدہ کونین علیہا السلام کی رُخصتی	۱۰۴
حضرت اُمّ سلمہ کا رَجز	۱۰۵
حضرت عائشہ کا رَجز	۱۰۵
حضرت حفصہ کا رَجز	۱۰۵
ملکہ کونین سیّدہ فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کا جہیز	۱۰۸
ولادتِ امام حسن علیہ السلام	۱۱۰
غزوۂ اُحد	۱۱۱
عینین کا دَرّہ	۱۱۵
آغازِ جنگ اور علی علیہ السلام	۱۱۵
حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت	۱۲۰
مالِ غنیمت کا لالچ اور دَرّہ عینین والوں کی غلطی	۱۲۱
لَا فَتیٰ اِلاَّ عَلِی لَا سَیْفَ اِلاَّ ذُوْالْفِقَار	۱۲۴
انجام	۱۲۷
نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کی تلواریں حضرت فاطمہ علیہا السلام کے سپرد	۱۲۹
جنگ میں مسلمان خواتین کی خدمات	۱۳۰
حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا پس منظر	۱۳۰
ولادتِ امام حسین علیہ السلام	۱۳۲
وفات حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام	۱۳۲
غزوۂ خندق	۱۳۳
خندق	۱۳۵

بنو قریظہ کی بغاوت	۱۳۵
بغاوت کا تدارک	۱۳۷
مقابلہ	۱۳۷
عمرو بن عبدوَد	۱۳۸
اسد اللہ کی جنگ	۱۴۰
عمرو بن عبدوَد کے ساتھی	۱۴۶
علی علیہ السلام کے ہاتھوں ایک اور پہلوان کا قتل	۱۴۷
مشرکین کی خفت	۱۴۸
غزوۂ بنو قریظہ	۱۵۰
بنو قریظہ کا انجام	۱۵۳
سریۂ علی مرتضیٰ علیہ السلام یا سریۂ فدک	۱۵۶
حدیبیہ کا معرکہ	۱۵۷
بَیعَتِ رضوان	۱۶۱
صلح نامہ حدیبیہ کے نِکات	۱۶۶
حضرت زینب علیہا السلام کی ولادت	۱۶۹
خیبر	۱۷۰
ابتدائی ناکامی	۱۷۳
فاتح خیبر کا انتخاب اور عطائے علم	۱۷۳
جناب امیر علیہ السلام کا اندازِ وُرُود	۱۷۷
حضرت صفیہؓ بنت حیی بن اخطب	۱۸۱
مرحب کا قتل محمد بن مسلمہ کے کھاتے میں	۱۸۲
آفتابِ امامت کے لئے آفتابِ فلک کی واپسی	۱۸۴
فدک	۱۸۵

فتح مکہ	۱۸۹
مدینہ سے روانگی	۱۹۱
مکّہ کے نواح میں پڑاؤ	۱۹۱
ابوسفیان کی گرفتاری	۱۹۲
مکّہ کی طرف پیش قدمی	۱۹۶
عام معافی	۱۹۹
بُت شکنی اور تطہیرِ کعبہ	۲۰۰
حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان	۲۰۲
مکّہ میں مختصر قیام	۲۰۲
غزوۂ حنین	۲۰۳
غزوۂ تبوک	۲۰۷
علی علیہ السلام کو مدینہ میں چھوڑنے کی وجہ	۲۰۸
خانہ کعبہ میں مشرکوں کے داخلے پر پابندی، ایک تاریخی اعلان	۲۱۱
مباہلہ	۲۱۳
حدیثِ کساء اور آیتِ تطہیر	۲۱۶
حدیثِ ثقلین	۲۲۰
فتح یمن	۲۲۴
غدیرِ خم	۲۲۷
علی علیہ السلام کی جانشینی کا اعلان اہل سُنت کی نظر میں	۲۳۰
غدیرِ خم کے بعد بھی اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں تاکید	۲۳۸
سریہ حضرت اُسامہ بن زید حارثہ	۲۳۹
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری ایامِ حیات	۲۴۱
حدیثِ قرطاس	۲۴۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری خطبہ	۲۴۴
وصیّت برائے تجہیز و تکفین	۲۴۵
بھائی اور بیٹی سے آخری گفتگو	۲۴۶
ہزار ہا ابوابِ علم	۲۴۹
سپردگی میراث	۲۵۱
ملکُ الموت	۲۵۳
رِحلتِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۲۵۴
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غسل	۲۵۵
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ	۲۵۶
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفن	۲۵۷
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد	۲۵۹
سیّدۃ النساء العالمین (علیہا السلام) کی رِحلت	۲۶۰
حضرت اُمّ البنین علیہا السلام سے شادی	۲۶۳
حضرت عباس علیہ السلام کی ولادت	۲۶۴
خلافت ثلاثہ کا زمانہ	۲۶۶
حضرت علی علیہ السلام کے چند فیصلے اور علمی جوابات	۲۶۸
شترمرغ کے انڈے	۲۶۸
دینار	۲۶۸
امین ضامن نہیں ہوتا	۲۶۸
فریب کار	۲۶۹
جو تم چاہو اُسے دے دینا	۲۶۹
ہیجڑے کی میراث	۲۷۰
دوسرا اور ایک دھڑ والے کی میراث	۲۷۰

کم سے کم مدتِ حمل	۲۷۱
ایک مرحوم بوڑھے کا بچہ	۲۷۱
کس کا بیٹا کس کی بیٹی	۲۷۲
جرم ایک سزائیں مختلف	۲۷۲
گالی پر تعزیر	۲۷۳
بچے کا کیا قصور ہے؟	۲۷۴
لاعلمی میں گناہ کا ارتکاب	۲۷۴
غلام کون؟	۲۷۴
حقیقی ماں	۲۷۵
جھوٹے گواہ	۲۷۵
سترہ (17) اُونٹ	۲۷۶
آٹھ (8) روٹیاں	۲۷۶
ایک دفعہ تو مجھے قتل کیا جا چکا ہے، دوبارہ کیوں؟	۲۷۷
یہودی کے سوالات	۲۷۸
عبادت بھی گناہ اور ترکِ عبادت بھی گناہ	۲۷۸
شاہِ روم کے سوالات	۲۷۸
غیر جن وانس پر نزولِ وحی	۲۷۹
وہ کون تھا جس نے اپنی قوم کو ڈرایا مگر وہ انسان تھا نہ جن؟	۲۷۹
صاحبِ قبر کو ساتھ لے کر گھومنے پھرنے والی قبر	۲۸۰
ایک ہی دن پیدا ہونے اور مرنے والے مگر عمروں میں سو سال کا فرق	۲۸۰
باپ کی عمر کم اور بیٹے کی زیادہ	۲۸۰
روزی کہاں سے آئے گی؟	۲۸۰
زمین وآسمان کا درمیانی فاصلہ؟	۲۸۱

امام علی علیہ السلام کی حاضر جوابی	۲۸۱
خلافت	۲۸۲
جنگ جمل	۲۸۴
جنگ صفین	۲۸۶
جنگ نہروان	۲۸۸
امام علی علیہ السلام کی شہادت	۲۸۹
ماخذ	۲۹۳

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

امیر المومنین امام علی علیہ السلام

سیّد حماد رضا بُخاری

ہدیہ

میں اس کتاب کو
بصد عقیدت و مودّت امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی بارگاہ میں
پیش کرتا ہوں۔



انتساب

والد گرامی سیّد حیدر علی بُخاری کے نام



تمہید

دُرود وسلام اور سیرتُ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لکھی گئی میری کتب کا اجرِ عظیم ہوگا اور فیضِ مدینۃُ العلم جناب رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو آج یہ گیارہویں کتاب بابُ العلم امیر المومنین امام علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی بارگاہ میں پیش کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ ابتدائی زمانے میں لکھی گئی میری چار کتب جو کہ ادب اور معاشرتی موضوع پر ہیں، کو چھوڑ کر باقی سب اُسی نُور سے منور ہیں جس کا منبع اللہ ربُ العزت اور اُس کی وہ خاص ہستیاں ہیں جنہیں اُس نے تخلیق فرما کر انسانیت پر احسانِ عظیم کیا۔ زیرِ نظر کتاب لکھنا میرے لئے بہت مشکل تھا کیونکہ میری نزدیک اسے چند سو صفحات میں سمونا ممکن نہیں، ذکرِ علی علیہ السلام تو مختصر طور پر بیان کرنے کے لئے بھی دفتر درکار ہیں کجا یہ تین سو صفحات؟ اور پھر علی علیہ السلام سے متعلق بات کرنے کے لئے جو علم و عرفان اور معرفت و وجدان چاہیے وہ ہم سے طفلِ مکاتب میں کہاں؟ تاہم میں نے اپنی استعداد کے مطابق اس کارِ عظیم کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بے شمار کوتاہیاں ہوں گی جنہیں کتاب کے مقصد اور موضوع کے پیشِ نظر، نظر انداز کر دیجئے گا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ میری گذشتہ کتب کی طرح اس میں بھی کوئی ایسا مواد شامِل نہ ہو جو کسی کی دل آزاری کا سبب بنے کیونکہ مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام دل آزاری کی بجائے دل جوئی کا درس دیتا ہے۔ والسّلام

سیّد حماد رضا بخاری، فیصل آباد
۲۳ رمضان، ۱۴۴۵ھ
۳ اپریل ۲۰۲۴ء

فون: +923009655650
ای میل: hrbukhari@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطّٰہِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ○

ولادتِ علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام

(۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل/ ۶۰۰ء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی، جانشین اور جاں نثار بھائی علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی ولادت ۱۳ رجب سنہ ۳۰ عامُ الفیل (۶۰۰ء) بروز جمعۃ المبارک خانہ کعبہ میں ہوئی۔ مؤرّخین میں آپ کی خانہ کعبہ میں ولادت پر کوئی اختلاف نہیں بلکہ بالاتفاق کہتے ہیں کہ آپ (علیہ السلام) سے پہلے کوئی خانہ کعبہ میں پیدا ہُوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ [1]

منقول ہے کہ آپ کی والدہ جناب فاطمہ بنتِ اسد علیہا السلام کو جب ولادت کے آثار نظر آئے تو وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر خانہ کعبہ کے قریب تشریف لے گئیں اور اُس کا طواف کرنے کے بعد دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئیں، پھر بارگاہِ الٰہی میں عرض پرداز ہوئیں، ''خدایا! میں مومنہ ہوں، تجھے خانہ کعبہ کے بانی ابراہیم (علیہ السلام) اور اِس مولود کا واسطہ جو میرے بطن میں ہے، میری مشکل دُور فرما۔'' ابھی دُعا کے جملے ختم نہیں ہُوئے تھے کہ دیوارِ کعبہ شق ہوگئی اور جناب فاطمہ بنتِ اسد علیہا السلام خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوگئیں۔ دیوارِ کعبہ پھر جُوں کی تُوں ہوگئی۔ [2] پس خانہ کعبہ کے اندر علی علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ آپ دُنیا میں تشریف لائے مگر آنکھیں نہیں کھولیں۔ جناب فاطمہ بنتِ اسد علیہا السلام سمجھیں کہ بچّہ بے نُور ہے لیکن تیسرے دن سیّد

---

[1] علامہ باقر مجلسی (متوفی: ۱۱۱۰ ہجری، اصفہان) جلاء العیون (اردو ترجمہ علامہ عبدالحسین)، ناشران عباس بک ایجنسی، لکھنؤ، انڈیا، ج ۱، باب ۳ ص ۲۶۲
محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (متوفی: ۱۰۱۴ء، نیشاپور) مستدرک، ج ۳ ص ۴۸۴
شیخ مفید (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد) الارشاد، اردُو ترجمہ سیّد موسیٰ رضا، ناشران نظامی پریس بک ڈپو، لکھنؤ، ص ۴۳

[2] عبدالرحمٰن ابن جوزی (متوفی: ۱۲۰۱ء، بغداد) سیرتِ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ترجمہ الوفا باحوال المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص ۳۲۳ بحوالہ: صحیح بخاری؛ صحیح مسلم؛ مستطاب مجمع الفضائل ترجمہ مناقب ابنِ شہر آشوب (متوفی: ۵۸۸ ہجری، حلب) اردُو ترجمہ: مولانا سید ظفر حسن، ظفر شمیم پبلی کیشنز، کراچی، ج ۱ ص ۴۳

الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور علی علیہ السلام کو آغوش میں لیا تو اُنہوں نے آنکھیں وا کیں اور پہلی نظر جمالِ رِسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ڈالی، سلام بجالائے اور تلاوتِ صحف آسمانی شروع کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گلے لگایا اور یہ کہہ کر کہ اے علی! جب تم میرے ہو تو میں بھی تمہارا ہوں، اپنی زَبانِ اطہر دَہنِ علی علیہ السلام میں دے دی۔ علامہ اربلی لکھتے ہیں کہ زَبانِ رِسالت سے دَہنِ اِمامت میں بارہ چشمے جاری ہو گئے اور علی علیہ السلام خوب سیراب ہُوئے اسی لیے اِس دن کو "یوم الترویہ" کہتے ہیں کیونکہ "ترویہ" کے معنی سیرابی کے ہیں۔[1] حضرت علی علیہ السلام خانہ کعبہ سے چوتھے روز باہر لائے گئے۔ آپ پاک و پاکیزہ، طیب وطاہر اور مختون پیدا ہُوئے تھے۔[2]

خانہ کعبہ میں ولادتِ علی علیہ السلام سے متعلق اہلِ سنت اکابرین کے اقوال

آلوسی: عبدالباقی عمری افندی (جو خلیفہ دوم کی اولاد میں سے ہے) کی "شرح اشعار عینیہ" پر آلوسی نے ایک شرح لکھی جس کا نام "شرح الخریدۃ الغیبیۃ فی شرح القصیدۃ العینیۃ" ہے۔ اس میں انھوں نے افندی کے شعر کو نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یوں ہے:

"آپ وہ علی (علیہ السلام) ہیں کہ آپ (علیہ السلام) کا مقام اللہ نے بلند کیا ہے اور آپ (علیہ السلام) رفعت کے عروج پر ہیں، خدا نے آپ (علیہ السلام) کو مکہ میں اور کعبہ کے اندر قرار دیا اور آپ (علیہ السلام) اس مقام پر پیدا ہوئے۔"

آلوسی نے آگے چل کر افندی کے ابیات کی شرح میں لکھا ہے، "علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) کا خانۂ خدا میں پیدا ہونا ایک مشہور اَمر ہے جو شیعہ اور اہلِ سنت کتب میں وارد ہُوا ہے۔"[3]

ابنِ صباغ مالکی: اہلِ سنت عالم ابن صباغ مالکی رقم طراز ہیں، "علی (علیہ السلام) مکہ مکرمہ میں بیتُ الحرام

---

[1] علی بن عیسیٰ اربلی (متوفی: ۶۹۲ تا ۶۹۳ ہجری، بغداد) کشفُ الغُمَّۃ، ص ۱۳۲

[2] نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۱۱۹، ۱۲۰
بحوالہ: ابن حجر مکی (متوفی: ۹۷۴ ہجری، مکہ) الصواعق المحرقۃ، ص ۷۲
علی بن عیسیٰ اربلی (متوفی: ۶۹۲ تا ۶۹۳ ہجری، بغداد) کشفُ الغُمَّۃ؛
شیخ مومن بن حسن شبلنجی (متوفی: ۱۲۹۰ ہجری، مصر) نُور الابصار، ص ۷۶

[3] وکی فقہ مذہبی انسائکلو پیڈیا (https://ur.wikifeqh.ir) بحوالہ: آلوسی، شرح الخریدۃ، ص ۳ اور ۱۵

کے اندر بروز جمعۃ المبارک شہر اللہ یعنی ماہِ رجب کی تیرہ تاریخ بمطابق تیس عام الفیل کو اور ہجرت سے ۲۳ برس قبل پیدا ہوئے۔ آپ سے پہلے کوئی بھی کعبہ میں پیدا نہیں ہُوا اور یہ وہ فضیلت ہے جس سے اللہ نے اُنہیں خاص کیا، اُن کی تجلیل، مقام و مرتبے کی بلندی اور اُن کی کرامت کے اظہار کیلئے۔ [1]

ابنِ مغازلی: اہلِ سنت عالم ابنِ مغازلی شافعی، امام سجاد علیہ السلام سے یوں نقل کرتے ہیں، ''موسیٰ (علیہ السلام) بن جعفر (علیہ السلام) اپنے والد امام صادق (علیہ السلام) سے اور وہ امام سجاد (علیہ السلام) سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن میں اپنے والد کے ہمراہ اپنے نانا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر کی زیارت کے لئے گیا۔ وہاں بہت سی خواتین بھی موجود تھیں جن میں سے ایک خاتون ہماری طرف متوجہ ہوئی۔ میں نے اُن سے کہا، ''آپ پر خدا کی رحمت ہو، آپ کون ہیں؟ کہنے لگیں، ''میں زیدہ بنت قریبہ بن عجلان قبیلہ بنی ساعدہ سے ہوں۔'' میں نے کہا، ''کیا آپ کچھ بیان کرنا چاہتی ہیں؟'' کہنے لگیں، ''ہاں! خدا کی قسم میری ماں اُمّ العارہ بنت عبادہ بن نضلہ بن مالک بن عجلان الساعدی ایک دن عرب کی خواتین کے ہمراہ بیٹھی تھیں کہ ابوطالب (علیہ السلام) پریشانی کی حالت میں وہاں آئے۔ میں نے اُن سے پوچھا، ''اے ابوطالب (علیہ السلام)! کیا ہُوا ہے؟'' کہنے لگے، ''فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) کو شدید دردِ زہ ہے اور پھر ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔'' اتنے میں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے اور فرمایا، ''چچا جان! کیا ہُوا؟'' ابوطالب (علیہ السلام) نے کہا، ''فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) وضع حمل کی سختی کی شدت سے گری پڑی ہیں۔'' پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابوطالب (علیہ السلام) کا ہاتھ تھاما جبکہ وہ فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ وہ کعبہ میں آئے، اُنھیں کعبہ کے اندر لے گئے اور کہا، ''بسم اللہ! بیٹھ جائیں۔'' وہ خاتون کہنے لگیں، ''پھر اُسی پہلی درد کے دوران ہی ایک انتہائی خوبصورت، پاک اور پاکیزہ بچے کی ولادت ہوئی۔ میں نے اتنا خوبصورت چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پس ابوطالب (علیہ السلام) نے اُس کا نام علی (علیہ السلام) رکھا اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گھر تک اُن کے ہمراہ رہے۔ امام سجاد (علیہ السلام) فرماتے ہیں، ''خدا کی قسم! میں نے بہت خوبصورت بات سنی تھی۔'' [2]

ابوزکریا الازدی: اہلِ سنت عالم ابوزکریا الازدی لکھتے ہیں، ''امیر المومنین علی بن ابی طالب (علیہ السلام)

---

[1] ابن صباغ مالکی (متوفی: ۸۵۵ ھجری، یروشلم) الفصول المهمة فی معرفة احوال الآئمه، ص۲۹

[2] ابن مغازلی شافعی (متوفی: ۴۸۳ ھجری، بغداد) مناقب حضرت علی (علیه السّلام)، ص۵۹-۵۸

کعبہ میں پیدا ہوئے اور اُن کے علاوہ کوئی بھی خلیفہ کعبہ میں پیدا نہیں ہوا ہے۔''[1]

ابو مصطفیٰ جنابی: دسویں صدی کے اہلِ سنت عالم ابو مصطفیٰ بن حسن جنابی، امیر المومنین علی (علیہ السلام) کی ولادت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں،''کہا جاتا ہے کہ آپ (علیہ السلام) کی ولادت کعبہ میں ہوئی۔''[2]

امیر صنعانی: امیر صنعانی بھی اہلِ سنت علما میں سے ہیں۔ وہ، امیر المومنین علی (علیہ السلام) کی ولادت کے بارے میں لکھتے ہیں،''آپ (علیہ السلام) کی ولادت مکہ مکرمہ اور خانۂ خدا میں عامُ الفیل کے تیسویں سال بروز جمعہ تیرہ رجب کو ہوئی۔''[3]

برہان الدین حلبی شافعی: برہان الدین حلبی شافعی لکھتے ہیں،''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے تیسویں سال علی بن ابی طالب (کرم اللہ وجہہ) کعبہ میں پیدا ہوئے۔''[4]

بُستی: اہلِ سنت معتزلی عالم بستی نے لکھا ہے،''تمام اہل بیت (علیہم السلام) کے نزدیک موجود صحیح روایات کی تحقیق سے ہم نے جان لیا کہ فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) نے فرمایا کہ بنی ہاشم کی خواتین کی عادت یہ تھی کہ خانۂ خدا میں جا کر اپنا شکم دیوارِ کعبہ کے ساتھ مس کیا کرتی تھیں تا کہ اُن کا وضع حمل آسان ہو جائے۔ (پھر اپنے گھر میں وضع حمل کیا کرتی تھیں) مگر جب علی (علیہ السلام) کی ولادت کا وقت نزدیک آیا تو میں اپنے بچے کے ساتھ (خانہ کعبہ) سے باہر آئی۔ کوئی مکان کعبہ سے بالاتر نہیں ہے اور فرزند پاک (یعنی حضرت علی علیہ السلام) سب سے عظیم مقام پر پیدا ہوئے۔ یہ ایسی فضیلت ہے جو صرف علی (علیہ السلام) پر انعام ہوئی اور جو اساتذہ اور مشائخ میں سے کسی ایک کو بھی نصیب نہیں ہوئی کہ جن کو ہم پہچانتے ہیں۔ پھر آپ (علیہ السلام) کے لئے مسجد میں ایک خاص اہمیت اور مقام ہے کہ ان کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں تھا اور یہ آپ (علیہ السلام) ہی کا خاصہ ہے۔ آپ (علیہ السلام) پہلی شخصیت ہیں جن کی ولادت کعبہ میں ہوئی۔''[5]

---

[1] ابو زکریا الازدی (متوفی: ۳۳۴ ھجری، موصل) تاریخ موصل، کتاب الثالث عشر، ص۵۸

[2] مصطفی بن حسن جنابی (متوفی: ۹۹۹ ھجری، حلب) البحر الزخار والعیلم التیار، ص۲۵۵

[3] محمد بن اسماعیل امیر صنعانی (متوفی: ۱۱۸۲ ھجری، صنعاء یمن) الروضة الندیه، ص۳۶

[4] علی بن برہان الدین حلبی (متوفی: ۱۶۳۵ء، قاہرہ) السیرۃ الحلبیہ، ج۳ص۵۲۰

[5] ابو القاسم بُستی (متوفی: ۴۲۰ ھجری، گیلان) المراتب فی فضائل امیر المومنین، ص۱۵۱

بسنوی: بسنوی نے کعبہ میں ولادت کے حوالے سے لکھا ہے، ''وہ پہلے مسلمان صحابی ہیں کہ بچپن میں جنہیں شیر کا نام دیا گیا۔ وہ ہمارے آقا و مولیٰ علی بن ابی طالب (علیہ السلام) ہیں۔ ولادت کے وقت آپ کے نانا موجود نہیں تھے۔ آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) ہیں جنہوں نے آپ کا نام حیدر اپنے والد کے نام اسد کی مناسبت سے رکھا۔ آپ بنو ہاشم کے بزرگان میں سے تھے۔ فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) پہلی ہاشمی خاتون تھیں کہ جن کے ہاں ہاشمی بچے کی ولادت ہوئی [1] اور حضرت علی (علیہ السلام) نسب کے اعتبار سے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نزدیک ترین خلیفہ، چچازاد اور اُن کی عظیم ترین دختر کے شوہر تھے۔'' [2]

جوینی: اہلِ سنت شافعی مذہب کے عالم جوینی لکھتے ہیں، ''مروی ہے کہ جب وضع حمل کا وقت ہُوا اور آپ (حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام) کا درد شدید ہو گیا تو ابو طالب (علیہ السلام) نے رات کے پہلے حصّے میں اُنہیں کعبہ میں داخل کیا، اور علی (علیہ السلام) وہاں پر پیدا ہوئے، اور کہا جاتا ہے کہ علی (علیہ السلام) کے علاوہ کوئی اور کعبہ میں پیدا نہیں ہُوا۔'' [3]

حاکم نیشاپوری: حاکم نیشاپوری بھی اہلِ سنت کے بزرگ عالم تھے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی کعبہ میں ولادت کے بارے میں لکھتے ہیں، ''متواتر روایات وارد ہوئی ہیں کہ فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) سے امیر المومنین (علیہ السلام) کی ولادت کعبہ کے اندر ہوئی ہے۔'' [4]

خواجہ نصیر اللہ ہندی: خواجہ نصیر اللہ ہندی نے امام علی علیہ السلام کی کعبہ میں ولادت سے متعلق لکھا ہے، ''ہم اہلِ سنت کے نزدیک امیر المومنین کی ولادت کے بارے میں مشہور ہے کہ اہلِ جاہلیت کے آداب میں سے ایک یہ تھا کہ ۱۵ رجب کو کعبہ کا دروازہ کھولا جاتا تھا اور لوگ زیارت کے قصد سے اُس میں داخل ہوتے تھے اور فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) اُنھیں میں شامل تھیں جو داخل ہوئیں اور اُسی دن آپ کا وضع حمل ہُوا۔'' [5]

---

[1] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۳۷، بحوالہ: المعارف، ص ۸۸

[2] ابن مغازلی شافعی (متوفی: ۴۸۳ ہجری، بغداد) مناقب حضرت علی (علیہ السلام)، ص ۵۹-۵۸

[3] صدر الدین ابراھیم بن محمد جوینی (متوفی: ۷۲۲ ہجری، عراق)
فرائد السمطین فی فضائل المرتضی والبتول والسبطین، ج ۱ ص ۴۲۶-۴۲۵

[4] حاکم نیشاپوری (متوفی: ۴۰۵ ہجری، نیشاپور) المستدرک علی الصحیحین، ج ۳ ص ۵۵۰

[5] نصیر الدین، السیوف المشرقۃ ومختصر الصواقع المحرقۃ، ص ۲۰۴

دیار بکری: دیار بکری اپنی کتاب تاریخ الخمیس میں اس طرح رقم طراز ہے، ''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے تیس سال بعد علی بن ابی طالب (علیہ السلام) کعبہ میں پیدا ہوئے۔''[1]

زرندی حنفی: زرندی حنفی لکھتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب (علیہ السلام) خانہ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے۔ اور آپ کی والدہ فاطمہ (علیہا السلام) بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف پہلی ہاشمی خاتون تھیں کہ جن کے ہاں ہاشمی بچے کی ولادت ہوئی۔ روایت ہے جب اُنھیں دردِ زہ ہُوا تو ابوطالب (علیہ السلام) نے اُنھیں رات کے پہلے حصّے میں کعبہ میں داخل کر دیا جہاں علی بن ابی طالب (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی۔[2]

سبط ابنِ جوزی: سبط ابنِ جوزی حضرت امام علی علیہ السلام کی ولادت با سعادت کے بارے میں لکھتے ہیں، ''مروی ہے کہ فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) حاملگی کی حالت میں خانۂ خدا کا طواف کر رہی تھیں کہ دردِ زہ شروع ہو گیا اور آپ پر خانہ کعبہ کا دروازہ کھل گیا۔ پس آپ خانہ کعبہ میں داخل ہو گئیں اور وہیں بچے کی ولادت ہوئی۔''[3]

سیف اللہ مدرس گرجی: سیف اللہ مدرس گرجی جو اہلِ سنت معاصرین میں سے ہیں اپنی کتاب ''مختصری از باورہای اہل سنت'' میں جناب علی علیہ السلام کی خانہ کعبہ میں ولادت سے متعلق لکھتے ہیں، ''آپ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے تیس سال بعد ۱۳ رجب (۶۰۱ء) کو بیت اللہ میں پیدا ہوئے۔''[4]

شاہ ولی اللہ: شاہ ولی اللہ نے بھی نقل کیا ہے کہ متواتر روایات سے ثابت ہے کہ امیر المومنین علی (علیہ السلام) روز جمعہ، تیرہ رجب، تیس عامُ الفیل کو وسطِ کعبہ میں حضرت فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) کے بطن سے پیدا ہوئے اور آپ کے علاوہ نہ آپ سے پہلے اور نہ ہی آپ کے بعد کوئی خانہ کعبہ میں پیدا ہُوا۔[5]

صالح الغامدی: معاصر سلفی عالم صالح بن عبداللہ الغامدی امیر المومنین علی علیہ السلام کی ولادت کے بارے

---

[1] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۹۸۲ ھجری، مکہ) تاریخ الخمیس، ج۱ ص۳۷۹

[2] محمد بن یوسف زرندی حنفی (متوفی: ۷۵۰ ھجری، شیراز) معارج الوصول، ص۴۹

[3] یوسف بن فرغلی سبط ابن جوزی (متوفی: ۶۵۴ ھجری، دمشق) تذکرۃ الخواص، ص۱۰

[4] سیف اللہ مدرس گرجی، مختصری از باورہای اہل سنت، ص۹۸

[5] علامہ مفتی جعفر حسین، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج۱ ص۱۳۷ بحوالہ: المعارف، ص۱۴۲؛ ازالۃ الخفاء، ج۲ ص۲۵۱

میں لکھتے ہیں، ''آپ کی والدہ فاطمہ (علیہا السلام) بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف ہیں۔ اُنھوں نے امیر المومنین (علیہ السلام) کو کعبہ کے اندر جنم دیا اور آپ پہلی ہاشمی خاتون ہیں جن سے ہاشمی بچے کی ولادت ہوئی۔ [1]

صفوری شافعی: صفوری شافعی بھی ایک سنی عالم دین ہیں جنھوں نے اپنی کتب میں امیر المومنین علی علیہ السلام کی کعبہ میں ولادت کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے، ''میں نے کتاب ''**فصول المهمة فی معرفة الائمة بمكة المشرفة**'' کہ جس کا مؤلف ابوالحسن مالکی ہے، میں دیکھا کہ علی (علیہ السلام) کی والدہ نے کعبہ کے اندر وضع حمل کیا اور یہ ایسی فضیلت ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف اُنہیں دی ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) کو دردِ زہ ہو گیا، ابوطالب (علیہ السلام) آپ کو کعبہ کے اندر لے گئے اور وہاں آپ نے بچے کو جنم دے دیا۔ یہ ولادت بروز جمعہ ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل کو ہوئی۔ [2] اسی طرح وہ کتاب ''**مختصر المحاسن المجتمعة**'' میں مذکورہ بالا متن کے مطابق یہ لکھتے ہیں، ''میں نے ایک مالکی مذہب کے عالم کی کتاب ''**الفصول المهمة**'' میں دیکھا ہے کہ منقول تھا، ''فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) نے علی (علیہ السلام) کو کعبہ کے اندر جنم دیا اور یہ ایسی فضیلت ہے جو خدا نے اُنہیں عنایت کی ہے۔ یہ اس طرح ہُوا کہ جب آپ کی والدہ پر دردِ زہ کا غلبہ ہُوا تو ابوطالب (علیہ السلام) کہ جن کا نام عبد مناف ہے، اُنہیں کعبہ کے اندر لے گئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اور درد کا احساس ہُوا اور اُنہوں نے بروز جمعۃ المبارک، تیس عام الفیل اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضرت خدیجہ (علیہا السلام) کے ساتھ ازدواج کے تین سال بعد اُنہیں جنم دیا۔'' [3]

عبدالعزیز دہلوی: عبدالعزیز دہلوی نے امیر المومنین علیہ السلام کی کعبہ میں ولادت کی تصریح کی ہے، ''صحیح یہ ہے کہ اہلِ جاہلیت کی عادت یہ تھی کہ پندرہ رجب کو کعبہ کا دروازہ کھولا جاتا تھا، تمام لوگ زیارت کے قصد سے داخل ہو جاتے تھے اور خواتین کی یہ عادت تھی کہ مردوں سے ایک یا دو دن قبل وارد ہوتی تھیں اور فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) کا وضع حمل نزدیک تھا اور اتفاق سے بھیڑ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہیں وضع حمل ہو گیا۔'' [4]

---

[1] صالح بن عبداللہ غامدی، الاکتفاء فی اخبار الخلفاء، ج۱ ص۴۸۰

[2] عبدالرحمن بن عبدالسلام صفوری شافعی (متوفی: ۸۹۴ ھجری) نزهة المجالس، ج۲ ص۱۵۹

[3] عبدالرحمن بن عبدالسلام صفوری شافعی (متوفی: ۸۹۴ ھجری) المحاسن المجتمعه، ص۱۵۶

[4] شاہ عبدالعزیز دھلوی (متوفی: ۱۲۳۹ ھجری، دھلی) تحفة اثنا عشریة، ص۴۴

عباس محمود عقاد: عباس محمود عقاد بھی معاصرین اہلِ سنت میں سے ہیں جو امیر المومنین علیہ السلام کی ولادت کے بارے میں لکھتے ہیں، ''حضرت علی (علیہ السلام) کعبہ کے اندر پیدا ہوئے۔''[۱]

عبدالرحمن محبی: مولوی محمد زکریا کی تالیف کردہ کتاب فضائل حج جو عبدالرحمٰن محبی کے ترجمے اور مولوی عبد الحمید کی تقریظ کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس کے حاشیے میں مصنف نے شیعہ وسنی علما سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے، ''حضرت علی (علیہ السلام) کی ولادت کعبہ میں ہوئی ہے جبکہ اکثر شیعہ وسنی علما نے حضرت علی (علیہ السلام) کی ولادت جوفِ کعبہ میں ذکر کی ہے۔''[۲]

گنجی شافعی: شافعی مذہب کے عالم حافظ گنجی ''کفایۃ الطالب'' میں لکھتے ہیں، ''امیر المومنین (علیہ السلام) تیرہ رجب کی شب جمعہ تیس عامُ الفیل کو بیتُ اللہ کے اندر پیدا ہوئے۔ نہ کوئی حضرت سے پہلے اور نہ ہی کوئی حضرت کے بعد خانہ کعبہ کے اندر پیدا ہُوا ہے اور یہ حضرت کے مخصوص فضائل میں سے ہے جو اللہ نے اُن کے مقام کی تجلیل کی غرض سے اُنہیں عطا فرمائے ہیں۔[۳]

محمد بن اسحاق فاکہی مکی: محمد بن اسحاق فاکہی مکی اخبار مکہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں، ''بنی ہاشم اور مہاجرین میں سے پہلی شخصیت جن کی کعبہ میں ولادت ہوئی، علی بن ابی طالب (علیہ السلام) ہیں۔''[۴]

محمد حسیب قادری: محمد حسیب قادری بھی معاصر اہلِ سنت علما اور مؤلفین میں سے ہیں۔ یہ رقمطراز ہیں، ''حضرت علی (علیہ السلام) خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت علی (علیہ السلام) کی ولادت کے وقت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا لعابِ دَہن حضرت علی (علیہ السلام) کے دَہن مبارک میں قرار دیا اور آپ کا نام علی (علیہ السلام) رکھا۔ جب حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اعلانِ نبوت کیا اُس وقت حضرت علی (علیہ السلام) کا سن مبارک دس برس کا تھا۔''[۵]

محمد بن عبدالواحد موصلی: محمد بن عبدالواحد موصلی نے امیر المومنین علی (علیہ السلام) کی کعبہ میں ولادت کو

---

[۱] عباس محمود عقاد (متوفی: مارچ ۱۹۶۴ء قاھرہ) عبقریۃ الامام علی، ص۴۳

[۲] عبدالرحمن محبی، فضائل حج، ص۱۱۲

[۳] حافظ محمد بن یوسف گنجی شافعی، (متوفی: ۶۵۸ ھجری، دمشق) کفایۃ الطالب، ص۴۰۶-۴۰۵

[۴] محمد بن اسحاق فاکھی (متوفی: ۲۷۲ تا ۲۷۹ ھجری، سعودیہ) اخبار مکہ، ج۳ ص۲۲۶

[۵] محمد حسیب قادری، سیرت حضرت سیدنا علی المرتضی علیہ السلام، ص۲۷

ان الفاظ میں بیان کیا ہے، ''حضرت علی (علیہ السلام) کا مقامِ ولادت کعبہ شریفہ میں ہے اور کعبہ میں آپ کے علاوہ کوئی پیدا نہیں ہُوا۔ پہلے دردِزہ کے ساتھ ہی آپ کی ولادت ہوگئی تھی۔''[1]

محمد عمر سر بازی: محمد عمر سر بازی بزرگ اہلِ سنت عالم تھے۔ وہ لکھتے ہیں، ''حضرت علی المرتضی (علیہ السلام) جو رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچازاد تھے، تیرہ رجب کو اور امام جعفر صادق (علیہ السلام) کی روایت کے مطابق ہجرت سے ۲۳ برس قبل سات شعبان کو بیتُ الحرام میں پیدا ہوئے۔''[2]

مسعودی: اہلِ سنت عالم مسعودی ''اثبات الوصیہ'' میں لکھتے ہیں، ''مروی ہے کہ فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) جب حاملہ تھیں اور خانہ کعبہ کا طواف کر رہی تھیں، اچانک اُن کا درد بڑھ گیا تو وہ کعبہ میں داخل ہوگئیں اور اپنے بیٹے علی (علیہ السلام) کو کعبہ کے اندر جنم دیا۔'' مسعودی نے ''مروج الذھب'' میں بھی لکھا ہے، ''علی (علیہ السلام) کا مقامِ ولادت خانہ کعبہ ہے۔''[3]

مومن بن حسن شافعی: مؤمن بن حسن شافعی ''نور الابصار'' میں لکھتے ہیں، ''حضرت علی (علیہ السلام) خانہ کعبہ کے اندر ایک قول کی بنا پر ۱۳ رجب بروز جمعہ تیس عام الفیل کو ہجرت سے ۲۳ برس قبل پیدا ہوئے۔''[4]

مصطفیٰ سباغی: مصطفیٰ سباغی نے ''زندگانی حضرت علی (علیہ السلام)'' کے نام سے اپنی کتاب میں اہلِ سنت منابع کی بنیاد پر حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی ولادت کے بارے میں لکھا ہے، ''رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت کے بتیس سال بعد حضرت علی (علیہ السلام) کعبہ میں پیدا ہوئے۔''[5]

ولی اللہ دہلوی: ولی اللہ دہلوی بھی اُن بزرگ اور مشہور اہلِ سنت علما میں سے ہیں جنہوں نے حضرت علی (علیہ السلام) کی کعبہ میں ولادت کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں، ''ولادت کے وقت آپ سے جو مناقب ظاہر ہوئے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ جوفِ کعبہ میں (یعنی کعبہ کے اندر) پیدا ہوئے۔''[6]

---

[1] محمد بن عبد الواحد موصلی، النعیم المقیم لعترۃ النبا العظیم، ص۵۵

[2] محمد عمر سر بازی (متوفی: ۱۳۸۵ ق، پادیك) پرسش و پاسخ‌های ارزشمند برای جوانان، ص۱۰۴

[3] علی بن حسین مسعودی (متوفی: ۹۵۶ء، قاھرہ) اثبات الوصیہ، ص۱۴۲؛ مروج الذھب، ج۲ص۲۷۳

[4] مؤمن بن حسن شبلنجی (متوفی: ۱۲۹۰ھجری، شبلنجا، مصر) نور الابصار، ص۱۵۸

[5] مصطفی سباغی (متوفی: ۱۳۶۱ھجری، ایران) زندگانی حضرت علی (علیہ السلام)، ص۸

[6] شاہ ولی اللہ دھلوی (متوفی: ۱۷۶۲ء، دھلی بھارت) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، ج۴ص۲۶۲

نسبِ علی علیہ السلام

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سگے چچا زاد بھائی تھے یعنی آپ کے والد حضرت ابوطالب علیہ السلام اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد حضرت عبداللہ علیہ السلام، حقیقی بھائی تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام، حضرت ہاشم بن عبد مناف کی پوتی تھیں چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نجیت الطرفین ہاشمی تھے کیونکہ ماں باپ دونوں بنی ہاشم تھے۔[1] چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کا نسب گرامی بھی وہی ہے جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے اپنے اس صلبی و خلقی اشتراک کے سلسلہ میں فرمایا، ''خدائے بزرگ و برتر نے ہمیں حضرت آدم علیہ السلام کے صلب سے پاکیزہ صلبوں اور پاکیزہ شکموں کی طرف منتقل کیا۔ جس صلب سے میں منتقل ہُوا اُسی صلب سے ایک ساتھ علی علیہ السلام منتقل ہوئے، یہاں تک کہ خداوند عالم نے مجھے آمنہ (علیہا السلام) کے شکم اطہر میں اور علی علیہ السلام کو فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) کے پاکیزہ شکم میں ودیعت فرمایا۔''[2] پس امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا شجرہ نسب یوں ہے: علی بن ابُو طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عَبدِ مُناف بن قُصی بن کِلاب بن مُرۃ بن کَعب بن لُوی بن غالب بن فِہر بن مالِک بن نَضر بن کِنانہ بن خُزیمہ بن مُدرکہ بن الیاس بن مُضر بن نَزار بن مَعد بن عَدنان[3] جناب عدنان تک آپ کے نسبِ گرامی میں مکمل اتفاق ہے جبکہ اِس کے بعد اختلاف ہے تاہم اِس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عدنان کا نسب حضرت اسماعیل علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے اُوپر سلسلہ نسب اس طرح بیان کیا گیا ہے: اسماعیل علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام بن تارُخ بن ناحور بن سروج یا ساروع بن رَعو یا راعو یا ارغو بن فاہج یا فالغ بن عابِر بن شالخ یا شالح بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام بن لامِک یا لمک بن متوشائح یا متوسالخ یا متوشلخ بن اخنوخ یا ادریس علیہ السلام بن یارد یا یرد بن مہلائیل بن قینان بن آنوش یا انوش بن شیث علیہ السلام بن آدم علیہ السلام۔[4]

---

[1] علامہ باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۹ء، اصفہان) جلاء العیون (اردو ترجمہ)، ج ۱، باب ۳ ص ۲۶۲

[2] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۳۸، بحوالہ: کفایۃ الطالب، ص ۲۶

[3] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۲۷

[4] قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری (متوفی: ۱۹۳۰ء) رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۲ باب اوّل، ص ۲۸۹

آباؤ اجداد

حضرت ابراہیم علیہ السلام

''روضۃُ الصفا'' کے حوالے سے علامہ نجم الحسن کراروی لکھتے ہیں کہ طوفانِ نوح کے ۱۰۸۱ سال بعد اور عہدِ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے عرصہ دراز کے بعد، حضرت ابراہیم علیہ السلام، بابل یا کوفہ کے علاقہ ''کوثا'' میں پیدا ہُوئے۔ آپ کے والد کا نام ''تارُخ'' تھا اور ''کشفُ الغُمّۃ'' کے مطابق والدہ کا نام ''تونا'' تھا۔[۱]

حافظ ابنِ عساکر نے اپنی کتاب ''تاریخ'' اور اسحٰق بن بشیر الکاہلی نے ''المبتدا'' کے حوالے سے آپ کی والدہ کا نام ''اُمیلہ'' بتایا ہے لیکن کلبی نے آپ کی والدہ کا نام بونا بنت کربنا بن کرثی لکھا ہے اور اُنہیں بنی ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام کے خاندان سے بتایا ہے۔[۲]

بعض لوگ آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد کہتے ہیں لیکن واضح ہو کہ یہ خیال قطعی غلط ہے۔ آزر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا اور بت ساز و بت پرست تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عرصہ تک اُس کے ساتھ رہے تھے شاید یہی وجہ ہو کہ اُسے آپ کا باپ سمجھ لیا گیا۔

آپ کا لقب خلیل اللہ تھا اور آپ اولوالعزم پیغمبر تھے۔ آپ صاحبِ شریعت تھے اور اللہ کی بارگاہ میں آپ کا مقام یہ تھا کہ خاتمُ الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کی شریعت کے باقی رکھنے کا حکم دیا گیا۔ آپ کی ولادت خدائی کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے بادشاہ نمرود کے دَور میں ہوئی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب نمرود نے خواب میں ایک ایسا ستارہ دیکھا جس کی ضیاء چاند اور سورج کی روشنی پر غالب آ گئی تھی۔ اُس کے نجومیوں اور کاہنوں نے اُس خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ اُس کی مملکت میں عنقریب ایک ایسا بچّہ پیدا ہو گا جس کی شان و عظمت سے اُس کی سلطنت اور خدائی ختم ہو جائے گی۔ وہ بچّہ نئے دِین اور شریعت کا آغاز کرے گا، بتوں کو توڑے گا اور اُس کی سلطنت کو مٹا دے گا۔ نمرود نے اُس بچّے کی ممکنہ پیدائش کو روکنے کے لیے تمام تر غیر اخلاقی، غیر انسانی اور ظالمانہ طریقے اختیار کر ڈالے لیکن مشیّتِ الٰہی کے آگے بے بس ہو گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس کی نام نہاد خدائی کا بُت پاش پاش کرنے دُنیا میں تشریف لے آئے۔[۳]

---

[۱] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) تاریخ اسلام، ج ۱ ص ۱۹۹

[۲] ابوالفداء عماد الدین ابن کثیر (متوفی: ۷۳ ۱۳ء، دمشق) تاریخ ابن کثیر (البدایۃ والنہایۃ)، ج ۱ باب اوّل ص ۱۵۹

[۳] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) تاریخ اسلام، ص ۲۲۰

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے والد گرامی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جانشین تھے۔ آپ کی پرورش مکّہ میں ہوئی اور یہیں پر قبیلہ جرہم کے ایک معزز گھرانے میں شادی ہوئی۔ علامہ مجلسیؒ کا بیان ہے کہ وہ بیوی ''عمالقہ'' میں سے تھی اور اُس کا نام ''اسامہ'' تھا۔[1] ایک روایت کے مطابق وہ بیوی قبیلہ جرہم میں سے تھی اور اس کا نام ''عمادہ'' تھا جسے بعد میں طلاق دے دی گئی تھی۔[2] اس کے بعد آپ نے ''حیفا بنت مضاض'' سے شادی کر لی اور اُنہیں کے ساتھ ہی ایامِ حیات گذارے۔ ''روضة الصفا'' میں ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ''حیفا بنت مضاض'' کی موجودگی میں کوئی اور شادی نہیں کی۔[3]

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاؤں کے صدقے مکّہ کے بے آب و گیاہ علاقے میں آبِ زم زم کا چشمہ پھوٹا تھا جو آج بھی جاری ہے۔ آپ ہی کے ذریعے مکّہ آباد ہُوا اور حجِ کعبہ کا آغاز ہُوا۔ صفا اور مروہ کے دوران سعی کر کے آپ کی والدہ محترمہ کی سُنّت کی ادائیگی ہر حاجی پر واجب ہے۔ اِسی طرح ۱۰ ذی الحج کو عیدِ قربان کی سُنّت آپ کے والد بزرگوار کی جانب سے پیش کی جانے والی آپ کی جان کی قربانی کی وجہ سے ہے اور اسی لیے اس قربانی کو سُنّتِ ابراہیمی کہتے ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۳۷ سال کی عمر میں ہُوا۔ آپ حجرِ اسماعیل (مکّہ) میں مدفون ہیں۔

حضرت فہر قریش

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تیسری صدی عیسوی میں حضرت فہر کی ولادت ہوئی۔ آپ بے حد صاحبِ کمال تھے۔ علامہ طریحی کے بقول اِنہی فہر یا اِن کے دادا نضر بن کنانہ کو قریش کہا جاتا ہے کیونکہ اُنہوں نے بحرِ ہند سے ایک بہت بڑی مچھلی شکار کی تھی جس کو ''قریش'' کہا جاتا تھا، وہ مچھلی مکّہ میں رکھی گئی تھی اور دُور دُور سے لوگ اُسے دیکھنے آتے تھے۔[4]

''فہر'' عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ''پتھر'' ہے اور ''قریش'' قدیم عربی میں ''سوداگر'' کو کہتے

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیاتُ القلوب، ج ۱ ص ۱۰۶

[2] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیاتُ القلوب، ج ۱ ص ۱۰۷

[3] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) تاریخ اسلام، ص ۲۳۵

[4] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۳۶ بحوالہ: علامہ طریحی

ہیں۔ بعض محقق کہتے ہیں کہ قریش اُنہی کا لقب ہے اور قریش کی نسبت اُنہی کی جانب کی جاتی ہے۔ پس جو فہر کی نسل سے نہیں ہوتا اُسے قریشی نہیں کنانی کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قریش، نضر بن کنانہ کا لقب ہے اور اُن کی اولاد کو قریشی یا قرشی کہتے ہیں۔ قریش نام کی مُتعدِّد وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک مشہور وجہ یہ ہے کہ قریش ایک بہت بڑا آبی جانور ہے جو مچھلیوں کو کھاتا ہے جب کہ کوئی دوسرا آبی جانور اُسے نہیں کھا سکتا اور یہ تمام دریائی جانوروں پر غالب و برتر رہتا ہے۔ صراح میں اِس کی شہادت میں زمانہ قدیم کے بعض شعراء کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ کچھ یہ کہتے ہیں کہ متفرق اور منتشر ہو جانے کے بعد حرم پاک میں وہ لوگ دوبارہ مجتمع ہُوئے تھے اور ''تقرش'' کے معانی جمع ہونے اور اکٹھے ہونے کے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ یہ لوگ اہلِ تجارت اور صاحبِ ہُنر تھے اور قرش کے معانی کسب و ہُنر اور اکٹھا کرنے کے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب لوگ حج کے لیے آتے تو یہ فقراء و مساکین کی تفتیش یعنی احوال پُرسی کرتے اور اُن کی امداد کرتے تھے، یہاں ''تقریش'' کا معنی ''تفتیش'' لیا گیا ہے۔ صراح میں ''تقریش'' کا مفہوم غالب آنا اور ''اقراش'' کا مطلب کسی کے لیے سعی و کوشش کرنا ہے۔ [1]

حضرت قُصی

حضرت فہر کی نسل سے حضرت قُصی (Qussay) کی ولادت پانچویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام کلاب اور ماں کا نام فاطمہ بنت سعد تھا۔ آپ کا پورا نام قُصی زید ابو مغیرہ تھا۔ آپ بہت با کردار، بُلند حوصلہ اور عظیم الشان بزرگ تھے اور قبیلے میں نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کو خانہ کعبہ کی تولیت کا شرف بھی حاصل تھا۔ آپ نے بیتُ اللہ کی مرمت کروائی، مکّہ میں عجول نامی کنواں کھدوایا، دارالندوہ بنوایا اور ہمیشہ سماجی خدمات انجام دیں۔ بعض روایات کے مطابق آپ ہی کو قریش کہا جاتا تھا مگر اکثر علماء اِس سے اتفاق نہیں کرتے۔ آپ کا عقد عاتکہ بنت خالخ بن لیک سے ہُوا۔ ایک بیوی کا نام حبی تھا جو بنو خزاعہ کے سردار خلیل خزاعی کی بیٹی تھیں۔ آپ کا انتقال ۴۸۰ء میں ہُوا۔ آپ کا مدفن حجون میں ہے۔ [2]

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی، بھارت) مدارج النبوت (اردو)، ج ۲ ص ۲۲

[2] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۳۶

حضرت عبدِ مناف

آپ کا نام مغیرہ ابوعبدِ شمس تھا۔ آپ کی والدہ کا نام حبی بنت خلیل تھا۔ آپ حضرت قُصی کے چھ بیٹوں میں سب سے چھوٹے اور لائق بیٹے تھے یہی وجہ تھی کہ آپ قریش کے مسلّم الثبوت سردار بن گئے۔ آپ نے بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح کبھی بُت پرستی نہیں کی۔ آپ اپنے والد بزرگوار کی طرح بے حد فضائل ومناقب کے حامل تھے اور ہمیشہ صلۂ رحمی اور تقویٰ کی تلقین کیا کرتے تھے۔ آپ کی شادی عاتکہ بنت مُرَّۃ بن ہلال سے ہوئی جو اپنے حسن و جمال کی وجہ سے ''قمر'' کے لقب سے مشہور تھیں۔ آپ نے ملک شام میں غزہ کے مقام پر انتقال فرمایا۔ [1]

حضرت ہاشم

آپ کا نام عَمْرَوْ ابو نفلہ تھا۔ آپ کے والد کا نام عبدِ مناف اور والدہ کا نام عاتکہ بنت مُرَّۃ بن ہلال تھا۔ آپ اور آپ کا جڑواں بھائی عبدُالشّمس اس طرح پیدا ہُوئے کہ دونوں کے جسم باہم جُڑے ہُوئے تھے جنہیں تلوار کے ذریعے الگ کیا گیا۔ بروایتِ طبری اور ابنِ اثیر، پیدائش کے وقت حضرت ہاشم کی انگلی یا انگوٹھا اُن کے بھائی عبدشمس کی پیشانی سے چپکا ہوا تھا۔ جس وقت انگوٹھے کو پیشانی سے جدا کیا گیا تو بہت زیادہ خون بہا اور لوگوں نے اس خون کو فال بد سے تعبیر کیا تھا۔ [2] علامہ نجم الحسن کراروی لکھتے ہیں کہ حضرت ہاشم کے پاؤں کا پنجہ عبدُالشّمس کی پیشانی سے چپکا ہُوا تھا جسے تلوار کے ذریعے الگ کیا گیا۔ اُس دَور کے دانشوروں نے اِسے دونوں بھائیوں کے درمیان خون ریزی سے تعبیر کیا جو بعد ازاں سچ ثابت ہُوا۔ دونوں کے خاندانوں کے درمیان ہمیشہ خون ریزی ہوتی رہی جس کا اختتام ۱۳۳ ہجری میں حضرت ہاشم کی اولاد بنوعباس اور عبدُالشّمس کی اولاد بنواُمیّہ کے درمیان ایسی جنگ پر ہُوا جس نے بنواُمیّہ کے اقبال کا چراغ بالآخر بجھا دیا۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ واقعہ کربلا، اس سے پہلے اور بعد میں آلِ رسول علیہم السلام پر ڈھائے جانے والے مظالم بھی بنواُمیّہ کی بنوہاشم کے ساتھ ازلی عداوت ہی کا نتیجہ تھے۔

حضرت ہاشم بہت دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت رحم دِل اور سخی بھی تھے۔ روایت ہے

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۳۷

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ ص ۳۱
عزالدین ابوالحسن علی بن محمد بن عبدالکریم الجزری ابنِ اثیر (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) تاریخ کامل، ج ۲ ص ۱۷

کہ قحط سالی کے دوران آپ شام سے ایک بہت بڑا کیک خرید کر لائے اور اُسے توڑ کر لوگوں میں تقسیم کیا۔ ''ہشم'' کا مطلب توڑنا ہے اس لیے ''ہاشم'' یعنی ''توڑنے والا'' مشہور ہو گئے۔ آپ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قریش کی معاشی حالت سدھارنے کی خاطر اُن کے لیے گرمی اور جاڑے کے سالانہ تجارتی سفروں کا آغاز کیا۔ آپ ہمیشہ بیتُ اللہ کا حج کرنے والوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ آپ کی ایک شادی اپنے خاندان کی ایک نہایت باوقار خاتون سے ہوئی جن کے بطن سے حضرت اسد پیدا ہُوئے۔ حضرت اسد نہایت رحم دِل اور ہمدرد انسان تھے۔ وہ مفلسوں کے گھروں میں راشن بھجواتے تھے۔ اُن کی اولاد بہت کم تھی۔ بعض روایات کے مطابق تو اُن کی واحد اولاد حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام تھیں جو حضرت علی علیہ السلام کی والدہ ماجدہ تھیں اور جنہیں خانہ کعبہ میں ولادتِ علی علیہ السلام کا شرفِ عظیم حاصل ہُوا۔ حضرت ہاشم کی دوسری شادی خزرجیوں کے ایک مشہور قبیلے بنی عدی بن نجار یثرب (مدینہ) کی نجیبُ الطرفین بیٹی سے ہوئی۔ اس خاتونِ ذی وقار کے بطن سے نہایت ہی بُلند کردار اور اعلیٰ مرتبہ شخصیت حضرت عبدُالمطلب شَیبۃُ الحمد کی ولادت ہوئی۔ حضرت عبدالمطلب کے بچپن میں ہی ۵۱۰ء میں بمقامِ غزہ شام حضرت ہاشم کا انتقال ہو گیا۔ [1]

حضرت عبدُالمُطلب شَیبۃُ الحمد علیہ السلام

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علی علیہ السلام کے دادا تھے۔ آپ کا نام عامر اور لقب شَیبۃُ الحمد تھا۔ آپ کی کنیت ابوالحارث تھی۔ آپ کے سر کے بال سفید اور خوبصورت تھے۔ ''شَیب'' سفیدی کو کہتے ہیں اِس لیے آپ کو شَیبہ اور بہت ممدوح ہونے کی وجہ سے شَیبۃُ الحمد کہا جاتا تھا۔ آپ کی ولادت ۴۹۷ء میں ہوئی۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام سلمیٰ/سلمہ تھا۔ وہ نہایت پرہیز گار اور جلیل القدر خاتون تھیں۔ آپ بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے، باپ کے انتقال کے بعد ننھیال میں رہے پھر آپ کے چچا حضرت مُطلب آپ کو اپنے پاس لے آئے۔ روایت ہے کہ لوگوں نے آپ کو اُن کا بھتیجا کہنے کی بجائے ''عبد'' کہنا شروع کر دیا اور اس طرح ''عبدُ المطلب'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔

آپ بہت متقی، پرہیز گار، جلیل القدر اور نامور انسان تھے اور اپنے اعلیٰ اوصاف اور قابلیت کی بنا پر عرب کے سردار بنے۔ آپ بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح شراب کو حرام سمجھتے تھے۔ آپ پہروں غارِ حرا

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۳۷

میں عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ بہت بڑے دسترخوان کا اہتمام فرماتے تھے جس پر انسانوں کے علاوہ حیوانوں کو بھی خوراک فراہم کی جاتی تھی۔ آپ مصیبت زدہ لوگوں اور اپاہجوں کی خاص طور پر مدد کیا کرتے۔

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ حضرت عبدالمطلب نے جاہلیت کے زمانے میں پانچ سُنتیں مقرر کیں جن کو خدا نے اسلام میں جاری وقائم رکھا۔

اوّل یہ کہ سوتیلی ماؤں کو بیٹوں پر حرام قرار دیا جس کے بارے میں خدا نے فرمایا ہے کہ اُن عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے آباؤ اجداد نے نکاح کیا ہو۔ ''وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ''[1]

دوم یہ کہ اُنہوں نے خزانہ پایا تو اُس میں سے پانچواں حصّہ راہِ خدا میں دے دیا جس سے متعلق خدا فرماتا ہے:[2]

''وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ'' (اور جان لو کہ جو چیز بھی تمہیں بطورِ غنیمت حاصل ہو اُس کا پانچواں حصّہ اللہ کے لیے، رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے، (اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے) قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔)

سوم یہ کہ چاہِ زمزم کھودا تو اُسے حاجیوں کا سقایہ قرار دیا، پس اللہ نے ارشاد فرمایا: ''اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'' (حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا۔)[3]

چہارم یہ کہ آدمی کے قتل کا خون بہا سو اُونٹ مقرر کیا، پس ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:[4] ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ'' (کسی مسلمان کے لیے روا نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر غلطی سے۔ اور جو کوئی کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کرے (تو اس کا کفّارہ یہ ہے کہ) ایک مؤمن غلام

---

[1] سورۃ النساء، آیت نمبر ۲۲
[2] سورۃ انفال، آیت نمبر ۴۱
[3] سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۱۹
[4] سورۃ النساء، آیت ۹۲

آزاد کیا جائے اور خون بہا اُس کے گھر والوں (وارثوں) کو ادا کیا جائے۔)

پنجم یہ کہ قریش میں (خانہ کعبہ کے) طواف کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی، آپ نے سات طواف مقرر فرمائے۔ حج وعمرہ میں آج بھی طوافِ کعبہ کے سات چکر واجب ہیں۔

آپ نے کبھی جُوا کھیلا نہ بُتوں کی پرستش کی اور نہ ہی اُن جانوروں کا گوشت کھایا جو بتوں کے لیے کاٹے جاتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ میں اپنے باپ جناب ابراہیم علیہ السلام کے دِین پر قائم ہوں۔[1]

خانہ کعبہ پر ابرہہ کی لشکر کشی کا مشہور واقعہ آپ ہی کے دَور میں ۵۷۰ء میں پیش آیا تھا۔ اُسی سال کو سنہ عامُ الفیل یعنی ہاتھی والا سال بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت عبدُ المطلب کی وفات اس واقعے کے آٹھ سال بعد یعنی ۵۷۸ء میں ہوئی۔ آپ حجون کے مقام پر دفن ہیں۔[2]

والد گرامی حضرت ابُو طالب بن عبد المطلب علیہ السلام

حضرت ابوطالب علیہ السلام کا اصل نام عمران بن عبد المطلب تھا۔ آپ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد حضرت عبداللہ علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمرو بن مخزوم تھا۔ آپ بہت باوقار اور دانش مند تھے۔ حضرت عبد المطلب کے بعد حرم کے عہدے رفادہ وسقایہ آپ ہی کے سپرد ہوئے اور شیخ ابطح، سیّد بطحاء اور رئیسِ مکہ جیسے القاب سے یاد کیے گئے۔ بقول دیار بکری، حضرت ہاشم کے بعد حاجیوں کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری حضرت عبد المطلب نے لی اور اُن کی وفات کے بعد ظہورِ اسلام تک ہر سال یہ خدمت حضرت ابوطالب (علیہ السلام) انجام دیتے رہے۔[3] زمانہ جاہلیت میں عربوں میں ہر طرح کی برائیاں عام تھیں۔ جگہ جگہ جُوا کھیلا جاتا تھا اور گھر گھر شراب نوشی کی جاتی تھی مگر حضرت ابوطالب علیہ السلام ہمیشہ ان تمام خرافات وخبائث سے دامن بچائے رکھتے تھے۔ احمد ابن زینی

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۶۷

[2] علامہ سیّد ذیشان حیدر جوادی (متوفی: ۲۰۰۰ء، لکھنؤ) نقوشِ عصمت، ص ۲۰

علامہ مرتضیٰ جعفر عاملی (متوفی: ۱۴۴۱ ہجری، بیروت) الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۷۸

[3] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۷۸

بحوالہ: حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۹۸۲ ہجری، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۱۵۷

دحلان کا بیان ہے، ''ابو طالب (علیہ السلام) نے اپنے باپ عبد المطلب (علیہ السلام) کی طرح زمانۂ جاہلیت میں بھی شراب اپنے اُوپر حرام کر لی تھی۔''[1]

آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے اور آپ کی زوجہ محترمہ حضرت فاطمہ علیہا السلام بنت اسد نے نہایت محبت اور جاں فشانی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش و پرداخت کی۔ آپ نے کارہائے رِسالت میں ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت وحمایت کی اور جب قریش حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت پر کمر بستہ ہُوئے تو آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ڈھال بن گئے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ تمام قریش اکٹھے ہو کر آپ کے پاس پہنچے اور مطالبہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہمارے سپرد کر دو۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر اُونٹنی اپنے بچّے کے بغیر رہ سکے تو میں اِن کو تمہارے سپرد کر دوں (یعنی یہ ناممکن ہے)۔ اِس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہُوئے کچھ اشعار کہے جن کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)!
یہ قریش آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقابل آ کر
آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایذا و آزار نہیں پہنچا سکیں گے
آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے دِین کی خوب تبلیغ کیجئے
اور کچھ تنگی و خوف محسوس نہ کیجئے
آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آنکھیں خوش اور ٹھنڈی رہیں
کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے دعوت دی
اور کہا کہ آپ میرے ناصح اور خیر خواہ ہیں
یقیناً آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سچ فرماتے ہیں
بلا شبہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امین ہیں
آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسے دِین کو ظاہر فرمایا ہے
جو یقیناً مخلوق کے سارے ادیان سے بہتر و افضل ہے''[2]

---

[1] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۷۹، بحوالہ: السیرۃ النبویہ، ص ۸۰
[2] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی، بھارت) مدارج النبوت، جلد ۲ ص ۵۹

روایت ہے کہ حضرت ابوطالب نے اپنے فرزندِ ارجمند امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ علی! انہوں (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تمہیں خیر کی دعوت دی ہے، اِس پر قائم رہنا۔ [1]

علامہ طریحی بحوالہ امام جعفر الصادق علیہ السلام کہتے ہیں کہ حضرت ابوطالب ایمان کے حوالے سے اصحابِ کہف کی مانند تھے۔ شمس العلماء نذیر احمد شبلی فرماتے ہیں کہ حضرت ابوطالب دینِ فطرت کو مضبوطی سے تھامے ہُوئے تھے، وہ دِل سے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سچا پیغمبر اور اسلام کو خدائی دِین سمجھتے تھے اور وقتِ وِصال کلمہ پڑھ رہے تھے۔ [2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوّت میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابوطالب کے وِصال کے وقت حضرت عباس بن عبدالمطلب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا، ''اے بھتیجے! خدا کی قسم بلاشبہ میرے بھائی نے وہ کلمہ پڑھا جس کے پڑھنے کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انہیں فرما رہے تھے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''ہاں! میں نے سُنا ہے۔'' [3] مروی ہے کہ آپ نے رِحلت کے وقت بنی عبدالمطلب کو بلایا اور وصیّت کی کہ تم سب ہمیشہ نیکی اور بھلائی پر قائم رہنا اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات سنو تو اُن کی پیروی کرنا اور نصرت و اِعانت کرتے رہنا تاکہ تم رشد و فلاح پاؤ۔ [4]

آپ کا انتقال ۸۵ سال کی عمر میں شوال سنہ ۱۰ بعثت میں ہُوا۔ ''المواھبُ اللدنیة'' میں ہے کہ اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر اُنچاس سال آٹھ مہینے اور گیارہ دن تھی۔ [5] آپ کے انتقال کے سال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''عامُ الحُزن'' یعنی غم کا سال قرار دیا۔ [6] یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ محرّمُ الحرام میں شہادتِ امام حسین علیہ السلام کے محض دس روزہ سوگ پر کچھ مسلمان اعتراض کرتے ہیں جبکہ یہاں حسین علیہ السلام کے دادا کی وفات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورے سال کو غم کا سال قرار دیا ہے۔ حضرت ابوطالب علیہ السلام کی آخری آرام گاہ مکّہ میں ہے۔



---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء) کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص ۲۸۳ بحوالہ: ابن ہشام ۱:۳۸۱؛ شبلی ۱:۲۰۲

[2] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۴۱ بحوالہ: علامہ تریحی و شمس العلماء نذیر احمد شبلی

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، بھارت) مدارج النبوت، جلد ۲ ص ۷۲

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، بھارت) مدارج النبوت، جلد ۲ ص ۷۲

[5] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، بھارت) مدارج النبوت، جلد ۲ ص ۷۲

[6] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام ص ۱۰۰، بحوالہ: فضل بن حسن طبرسی، اعلام الوریٰ

والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام

امیر المومنین علی علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی فاطمہ علیہا السلام تھا جو جناب اسد کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت اسد، قیلہ بنت عامر کے بطن سے حضرت ہاشم کے فرزند ارجمند تھے یعنی حضرت فاطمہ بنت اسد، حضرت ہاشم کی پوتی تھیں اور حضرت ابوطالب علیہ السلام کی زوجہ ہونے کے ناطے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چچی تھیں۔ جب رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابوطالب علیہ السلام کی کفالت میں آئے تو حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام نے اُنھیں اپنی آغوش میں یوں لیا کہ کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے تھے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی اولاد سے بڑھ کر محبت اور توجہ دیتیں۔ ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے پھل اور کھانا الگ کر کے رکھ لیا کرتیں تا کہ طلب کرنے پر فوراً پیش کر سکیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُنھیں ماں سمجھتے، ماں کی طرح عزت اور تکریم کرتے اور ماں ہی کہہ کر پکارا کرتے۔[1] روایت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُن کے بارے میں یوں فرمایا، ''بے شک وہ میری ماں تھیں۔ وہ اپنے بچوں کو بھوکا رکھتی تھیں اور مجھے کھانا کھلاتی تھیں، اور انھیں گرد آلود چھوڑ دیتی تھیں جبکہ مجھے نہلاتی اور آراستہ رکھتی تھیں۔ حقیقت یہی ہے کہ وہ میری ماں تھیں۔[2]

بروایتے، حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام اظہارِ ایمان کے لحاظ سے مسلمانوں میں گیارہویں[3] اور خواتین میں حضرت خدیجہ (علیہا السلام) کے بعد دوسری خاتون تھیں۔[4] روایت ہے کہ فتح مکہ کے بعد، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر مردوں سے بَیعَت لے رہے تھے تو مکہ کی مسلمان خواتین بھی بَیعَت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں جن میں حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام پیش پیش تھیں۔[5] ابنِ ابی الحدید کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام) پہلی خاتون تھیں جنہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بَیعَت کی۔[6] آپ طالب، عقیل، جعفر، علی بن ابی طالب علیہ السلام، ہند یا اُمّ ہانی، جمانہ، ریطہ یا اُمّ طالب اور

---

[1] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۳۶

[2] احمد بن ابی یعقوب (متوفی: ۸۹۷ء، مصر) ترجمہ تاریخ یعقوبی، ص ۳۶۸

محمد ابراہیم آیتی (متوفی: ۱۳۴۳ ہجری قمری، ایران) تاریخ پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۹

[3] ابنِ ابی الحدید (متوفی: ۱۲۵۸ء، بغداد) شرح نہج البلاغہ، ج ۱ ص ۱۴

[4] ابن صباغ مالکی (متوفی: ۱۴۵۱ء، یروشلم) الفصول المہمّہ، ص ۳۱

[5] محمد حسین طباطبائی (متوفی: ۱۹۸۱ء، قم، ایران) تفسیر المیزان، ج ۱۹ ص ۲۴۶

[6] ابنِ ابی الحدید (متوفی: ۱۲۵۸ء، بغداد) شرح نہج البلاغہ، ج ۱ ص ۱۴

اسماء کی والدہ تھیں۔[1] امام صادق (علیہ السلام) فرماتے ہیں، ''امیر المومنین (علیہ السلام) کی والدہ ماجدہ فاطمہ بنت اسد علیہا السلام نے پائے پیادہ مکہ سے مدینہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف ہجرت کی۔ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لئے نیک ترین خاتون تھیں۔''[2] ابنِ جوزی لکھتے ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام چوتھی صدی ہجری میں مدینہ میں دُنیا سے رخصت ہوئیں۔[3] روایت ہے کہ اُن کے انتقال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''آج میری ماں رحلت کر گئیں۔'' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا پیراہن بطور کفن اُنھیں پہنایا، اُن کی قبر میں اُترے اور لحد میں لیٹے۔ اُس وقت کسی نے کہا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں؟ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ''بے شک وہ میری ماں تھیں۔''[4] متقی الہندی نے بھی لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیراہن مبارک سے اُنہیں کفن دیا۔[5] اور فرمایا کہ جبرائیل نے مجھے خبر دی ہے کہ وہ جنتی خاتون ہیں اور خداوند متعال نے ستر ہزار فرشتوں کو حکم دیا ہے کہ ان کی نیابت میں نماز بجالایا کریں۔[6]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ○



---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیاتُ القلوب، ج ۱ ص ۵۷

[2] ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی (متوفی: ۹۴۱ء، بغداد) الکافی، ج ۱ ص ۴۲۲

[3] عبدالرحمٰن ابن جوزی (متوفی: ۵۹۷ ہجری، بغداد) تذکرۃ الخواص، ص ۶

[4] احمد بن ابی یعقوب (متوفی: ۸۹۷ء، مصر) ترجمہ تاریخ یعقوبی، ص ۳۶۸
محمد ابراہیم آیتی (متوفی: ۱۳۴۳ ہجری، قم، ایران) تاریخ پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[5] علاء الدین علی بن حسام الدین متقی ہندی (متوفی: ۱۵۶۷ء مکہ) کنز العمال، ج ۶ ص ۲۲۸

[6] حاکم نیشاپوری (متوفی: ۴۰۵ ہجری، نیشاپور) المستدرک علی الصحیحین (مستدرک حاکم)، ج ۳ ص ۱۰۸

علی علیہ السلام کے نام اور القاب

علی علیہ السلام کی والدہ ماجدہ نے آپ کا نام حیدر اور والد گرامی نے اسد رکھا۔ خاندان والوں نے زید رکھنا چاہا لیکن بقولے، حضرت ابو طالب علیہ السلام کی دُعا پر آسمان سے ایک تختی نازل ہوئی جس پر مرقوم تھا کہ اس بچّے کا نام، نامِ خدا پر علی رکھو، تا کہ خدا کے نام کی برکت سے اس کی بلندی برقرار رہے اور اس کی بقا سے نامِ خدا کی بقا وابستہ رہے۔"[1]

کنیت:

امام علی علیہ السلام کی مشہور کنیت ابو الحسن تھی۔[2] تاہم ابو الحسین، ابو السبطین، ابو الریحانتین، ابو تراب و ابو الآئمہ بھی بیان کی جاتی ہیں۔[3] سہل بن سعد سے روایت ہے کہ حضرت علی (علیہ السلام) کو اپنے سب ناموں سے زیادہ محبوب نام ابو تراب تھا۔[4]

کنیت ابو تراب کی وجہ:

"معارج النبوۃ" اور "روضۃ الاحباب" میں مذکور ہے کہ غزوۂ عشیرہ کے سفر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کو "ابو تراب" کے نام سے نوازا۔ یہ نام بعد میں اُن کی کنیت کے طور پر مشہور ہو گیا۔ حضرت عمار یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اور حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام غزوۂ عشیرہ میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے، زمین پر لیٹنے کی وجہ سے ہمارے جسموں پر مٹی لگ گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے سرہانے تشریف لائے اور ہمیں جگایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی المرتضیٰ علیہ السلام (کے بدن پر مٹی لگی دیکھ کر اُنہیں) "یا ابو تراب!" کہہ کر مخاطب کیا اور فرمایا، "اے علی (علیہ السلام)! کیا میں تمہیں اس کی خبر نہ کروں کہ تمام لوگوں میں بد بخت کون ہے؟" حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے عرض کی، "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ضرور خبر کیجئے۔" حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، "تمام لوگوں میں دو شخص سب سے زیادہ بد بخت ہیں، ایک وہ جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اُونٹنی کی کونچیں کاٹیں اور دوسرا جو تمہارے محاسن (یعنی داڑھی) کو تمہارے خون

---

[1] علامہ سیّد ذیشان حیدر جوادی (متوفی: ۲۰۰۰ء، لکھنؤ) نقوشِ عصمت، ص ۱۱۳

[2] شیخ مفید (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد) الارشاد، ج ۱ ص ۵

[3] محمدی ری شہری (متوفی: ۲۰۲۲ء تہران، ایران) دانشنامہ امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱۴ ص ۳۰۸

[4] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۴۷، بحوالہ: صحیح بخاری، جزو ۸ ص ۶۳

سے رنگے گا۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرماتے جاتے اور اپنے دستِ مبارک سے حضرت علی علیہ السلام کے سر اور چہرے سے گرد جھاڑتے جاتے تھے۔ اُن دونوں کتابوں میں اسی طرح مذکور ہے لیکن مشہور واقعہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد کے فرش پر علی علیہ السلام کو سوتے ہوئے ملاحظہ فرمایا۔ اُن کے جسم اطہر پر مٹی لگی ہوئی تھی جسے دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''قم ابا تراب!'' (ابوتراب اُٹھو!)۔ اُس روز سے اُن کی کنیت ابوتراب ہوگئی۔ علی علیہ السلام، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطا کردہ یہ کنیت اپنی اصل کنیت ابوالحسن کے مقابلے میں زیادہ محبوب جانتے تھے۔ اُن کے مخالفین ومعاندین اس کنیت کو بغرضِ تنقیص وتحقیر بولتے تھے حالانکہ اس میں اُن کی کمال تعظیم وتکریم ہے۔[1]

القاب:

امیر المومنین علی علیہ السلام کے مشہور القاب مندرجہ ذیل ہیں:

امیر المؤمنین، یعسوب الدین والمُسلمین، مبیر الشرك والمُشرکین، قاتل الناکثین والقاسطین والمارقین، مولی المؤمنین، شبیه هارون، حیدر، مرتضیٰ، نفس الرسول، أخو الرسول، زوج البتول، سیف الله المسلول، امیر البررة، قاتل الفجرة، قسیم الجنّة والنار، صاحب اللواء، سیّد العرب، کشّاف الکرب، الصدّیق الأکبر، ذوالقرنین، الهادی، الفاروق، الداعی، الشاهد، باب المدینة، والی، وصیّ، قاضی دین رسول الله، منجز وعده، النبأ العظیم، الصراط المستقیم والأنزع البطین۔[2] آپ علیہ السلام کی پیشانی کبھی کسی بُت کے سامنے نہیں جھکی اِس لیے آپ کو کرم اللہ وجہہٗ بھی کہا جاتا ہے۔[3]



---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی، بھارت) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۵، ۱۱۶، بحوالہ: روضۃ الاحباب

[2] محمد بن علی ابنِ شہر آشوب (متوفی: ۵۸۸ ہجری، حلب) مناقب آل ابی طالب، ج ۳، ص ۳۲۱ تا ۳۳۴

[3] نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۱۱۹، ۱۲۰

ابن حجر مکی، (متوفی: ۹۷۴ ہجری، مکہ) الصواعق المحرقة، ص ۷۲

علی بن عیسیٰ اربلی (متوفی: ۶۹۲ تا ۶۹۳ ہجری، بغداد) کشفُ الغُمَّة

مؤمن بن حسن شبلنجی (متوفی: ۱۲۹۰ ھجری، شبلنجا، مصر) نور الابصار، ص ۷۶

پرورش امیر المومنین علی علیہ السلام

ابتدا میں امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے والد حضرت ابو طالب علیہ السلام کے زیر سایہ پرورش پائی جو سردارِ قریش تھے اور ہر فضیلت، شرف اور کرامت میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ آپ کی تربیت آپ کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام نے کی جو عفت، طہارت اور اخلاق میں فقید المثال تھیں۔ آپ کے والدین نے آپ کو بلند و بالا اخلاق، اعلیٰ عادات اور آداب کریمہ سے سے خوب آراستہ و پیراستہ کیا۔ حضرت ابو طالب علیہ السلام کی وفات کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری لے لی۔ چنانچہ آپ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیرِ سایہ اُنھیں کے دامن محبت و عطوفت میں پروان چڑھے۔ آپ کی شخصیت میں پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بلند کردار، عظیم الشان اخلاق اور صفاتِ کریمہ اس طرح سرایت کر گئے تھے کہ آپ ہر لحاظ سے، یعنی مزاج میں، کردار میں اور اوصاف میں بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی جانشین قرار پائے۔ پس، امیر المومنین علیہ السلام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی گہری قرابت داری کے بارے میں ارشاد فرمایا؛ ''تم جانتے ہی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریب کی عزیز داری اور مخصوص قدر و منزلت کی وجہ سے میرا مقام اُن کے نزدیک کیا تھا؟ میں بچہ ہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے گود لے لیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اپنے سینے سے چمٹائے رکھتے تھے، بستر میں اپنے پہلو میں جگہ دیتے تھے، اپنے جسم مبارک کو مجھ سے مس کرتے تھے اور اپنی خوشبو مجھے سونگھاتے تھے۔ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی چیز کو چباتے پھر اُس کے لقمے بنا کر میرے منھ میں دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری کسی بات میں کبھی جھوٹ کا شائبہ پایا نہ میرے کسی کام میں لغزش و کمزوری دیکھی۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے یوں لگا رہتا تھا جیسے اُونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے رہتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز اپنے اخلاق کا کوئی نمونہ میرے لئے بیان کرتے اور مجھے اس کی پیروی کا حکم دیتے تھے۔ غارِ حراء میں خلوت اختیار کرتے تو صرف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتا تھا اور میرے سوا کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں دیکھتا تھا۔ جس زمانے میں سوائے اس گھر کے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خدیجہ کبریٰ علیہا السلام تھے اسلام و ایمان کسی گھر میں داخل نہیں ہُوا تھا اور میں ہی اُن کے درمیان تیسرا فرد تھا۔[1] اور فرمایا کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی الٰہی نازل ہو رہی تھی تو میں نے کسی کے نالہ و فریاد کی آواز سنی۔ میں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ نالہ و فریاد کیسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

[1] عبد الملک ابن ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) سیرۃ النبویہ؛ نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۷ قاصعہ

ارشاد فرمایا کہ یہ شیطان کی آواز ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میری بعثت کے بعد زمین والوں کے درمیان جو اس کی اطاعت و پرستش ہوتی اُس سے یہ نا اُمید ہو گیا ہے۔ اے علی! جس چیز کو میں نے سنا اور دیکھا تم نے بھی اُسے دیکھا اور سنا مگر یہ کہ تم پیغمبر نہیں ہو بلکہ تم میرے وزیر اور مددگار رہو۔ [1] اس روایت کے تناظر میں واضع ہے کہ علی علیہ السلام کارِ رسالت میں ابتدا ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی تھے چنانچہ جونہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رسالت کا اعلان کیا علی علیہ السلام نے بھی ایمان کا اظہار کر دیا۔ عام طور اسے علی علیہ السلام کا ایمان لانا کہا جاتا ہے مگر ہمیں اس سے اختلاف ہے کیونکہ ایمان تو وہ لائے جو پہلے ایمان پر نہ ہو۔ علی علیہ السلام نے تو آنکھ ہی آغوشِ رسالت میں کھولی پس ہم کہیں گے کہ ایمان کا اظہار کر دیا۔ اکثر محدثین و مورخین نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوشنبہ کے دن منصبِ رسالت پر مبعوث ہوئے اور حضرت علی علیہ السلام نے فوراً ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کر دی۔ [2] اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تصریح کرتے ہوئے صحابہ کرام کے عمومی مجمع سے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جو حوضِ کوثر پر مجھ سے ملاقات کرے گا اور جس نے اسلام لانے میں تم سب پر سبقت حاصل کی وہ علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام ہیں۔ [3] خود امیر المومنین علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہوئے کہا کہ پروردگار! میں پہلا شخص ہوں جو تیری طرف آیا اور جس نے تیرے پیغام کو سُنا اور تیرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہا، اور مجھ سے پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی نے نماز نہیں پڑھی۔ [4]

علی علیہ السلام اپنے بچپن میں دوسروں بچوں سے بالکل مختلف تھے۔ نہ اُن کی طرح کھیل کود میں دلچسپی رکھتے تھے نہ ہی لہو ولعب کی طرف کوئی رجحان تھا، بلکہ آپ کی شخصیت سے ہمت و حوصلہ اور عظمت و وقار عیاں ہوتا تھا۔ کتبِ سیر میں آپ کے زمانۂ شیر خواری کے حوالے سے ایک عجب روایت پائی جاتی ہے جو کہ آپ کی ہمت و شجاعت پر دلالت کرتی ہے اور آپ کے ایک نام، ''حیدر'' کی وجہ تسمیہ بھی بیان کرتی ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ خیبر کے معرکہ میں امیر المومنین علیہ السلام جب مرحب کے مقابل آئے تو فرمایا تھا کہ

---

[1] ابنِ ابی الحدید (متوفی: ۱۲۵۸ء، بغداد) شرح نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ

[2] حاکم نیشاپوری (متوفی: ۴۰۵ ہجری، نیشاپور) مستدرک حاکم، ج ۲ ص ۱۱۲

ابنِ عبد البر القرطبی (متوفی: ۴۶۳ ہجری، شاطبہ) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج ۳ ص ۳۲

[3] حاکم نیشاپوری (متوفی: ۴۰۵ ہجری، نیشاپور) مستدرک حاکم، ج ۳ ص ۱۳۶

[4] ابنِ ابی الحدید (متوفی: ۱۲۵۸ء، بغداد) شرح نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۷

میری ماں نے میرا نام ''حیدر'' رکھا ہے۔ صاحبِ ارجح المطالب نے نجم الدین فخر الاسلام ابوبکر ابنِ محمد المرندی کی کتاب مناقب الاصحاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ابھی شیر خواری کے زمانہ میں تھے کہ اُن کی والدہ انہیں گھر میں تنہا چھوڑ کر کسی کام سے باہر گئیں۔ وہ گھر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ اس پہاڑی سے ایک سانپ اُترا اور آپ کے قریب پہنچ کر پھنکارنے لگا۔ آپ نے ہاتھ بڑھا کر اُسے پکڑ لیا یہاں تک وہ آپ کے ہاتھوں میں ہی مر گیا۔ جب آپ کی والدہ واپس آئیں تو آپ کی گرفت میں مردہ سانپ دیکھ کر کہا، ''حَیّاكَ اللهُ یَا حَیْدَرَهُ○'' (اے میرے شیر اللہ تجھے زندہ رکھے۔) [1]

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے والد حضرت ابوطالب علیہ السلام کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی تھی اور حضرت علی علیہ السلام کو آغوشِ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پروان چڑھنے کا شرفِ عظیم حاصل ہُوا۔ پس علی علیہ السلام نے اس کا حق یوں ادا کیا کہ اپنے بابا حضرت ابوطالب علیہ السلام کی طرح اپنی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام وقف کر دی۔ اسلام کی پہلی نمازِ باجماعت ہو یا دعوتِ ذوالعشیرہ، غزوۂ اُحد و بدر و حنین ہوں یا خیبر کا ناقابلِ تسخیر قلعہ، یا پھر حیاتِ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی بھی اہم اور نازک لمحہ، آپ علیہ السلام اپنے رسول، اپنے ہادی، اپنے معلم اور اپنے بھائی کی حفاظت کے لئے ڈھال کی طرح آگے، بہترین معاون کی طرح شانہ بشانہ اور اطاعت کے لیے پیچھے پیچھے نظر آتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ○

[1] عبید اللہ امرتسری، ارجح المطالب، ص ۱۰ بحوالہ: نجم الدین فخر الاسلام ابوبکر ابنِ محمد المرندی، مناقب الاصحاب علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۵۹

حلیہ مبارک امیر المومنین علی علیہ السلام

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح امیر المومنین حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام بھی نہایت حسین وجمیل اور وجیہ تھے۔ منقول ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کا بدن مبارک بھاری بھرکم، گندم گوں کھلتا ہُوا رنگ، انتہائی مناسب اور دلکش خال وخد، مسکراتا ہُوا اور ماہِ کامل کی طرح روشن چہرہ اور کشادہ پیشانی تھی جس پر کثرتِ سجود سے نشان پڑ گیا تھا۔ ناک ستواں اور آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں جن میں عزم و ہمت اور ایمان وایقان کی چمک تھی۔ ابوالحاج مدرک کہتے ہیں کہ میں نے آپ کی آنکھوں میں سرمہ کے نشان بھی دیکھے ہیں۔ پتلیاں روشن، بھویں قوس کی طرح، پلکیں لانبی اور دانت نہایت خوبصورت اور چمکدار تھے۔ بقولے ضرار ابن ضمرہ کنانی، جب آپ (علیہ السلام) مسکراتے تو دانت موتیوں کی لڑیوں کی طرح چمکتے۔ گردن صراحی دار اور موٹی، سینہ کشادہ اور بالوں سے سجا ہُوا، بازوؤں کی مچھلیاں اُبھری ہوئیں، شانے سڈول، کلائیاں مضبوط اور فربہ کہ بازوؤں اور کلائیوں کا جوڑ نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں کندھوں کی ہڈیاں چوڑی اور مضبوط، ہتھیلیاں سخت، پنڈلیاں نہ پُر گوشت نہ لاغر، ریش مبارک گھنی اور عریض، سر اور داڑھی کے بال سفید۔ بقولے محمد بن حنفیہ آپ علیہ السلام نے ایک دفعہ مہندی کا خضاب لگایا اور پھر چھوڑ دیا۔ خود کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے سر کے اگلے حصّہ پر سے بال اُڑے ہوئے تھے۔ قد میانہ سے کچھ نکلتا ہُوا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے اس بارے میں فرمایا کہ اللہ نے مجھے قد و قامت میں اعتدال بخشا ہے۔ اگر میرا مقابل چھوٹے قد کا ہو تو میں اُس کے سر پر ضرب لگا کر اُس کے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں اور طویل قامت ہو تو اُسے درمیان سے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ آپ علیہ السلام کی آواز میں جلال تھا، چلنے کا انداز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہ تھا، باوقار اور کچھ آگے کو جھکا ہُوا۔ آپ علیہ السلام میدانِ جنگ میں جب دشمن کی طرف بڑھتے تو تیزی کے ساتھ چلتے اور آنکھوں میں سرخی دوڑ جاتی۔ ابنِ عباس روایت کرتے ہیں کہ میں نے علی (علیہ السلام) سے زیادہ حسین کسی کی کنپٹیاں نہیں دیکھیں۔ [1]



[1] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۴۸ تا ۱۴۹

لباسِ امیر المومنین علی علیہ السلام

امیر المومنین علیہ السلام ہمیشہ سادہ اور معمولی لباس زیب تن فرماتے تھے۔ نمود و نمائش قطعی گوارا نہیں تھی اس لئے کم قیمت اور پیوند لگے لباس پہننے میں بھی عار نہیں محسوس کرتے تھے۔ کتبِ سیر میں لکھا ہے کہ موسمی لباس استعمال کرنے کا رجحان بھی نہیں تھا، گرمیوں میں موٹے اور گرم کپڑے اور سردیوں میں ہلکے اور ٹھنڈے لباس استعمال کر لیا کرتے تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ علیہ السلام گرمی اور سردی کے احساس سے بالاتر تھے کیوں کہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین علی علیہ السلام کے لئے دُعا فرمائی تھی، ''اَللّٰھُمَّ اَذْھِبْ عَنْہُ الْحَرَّ وَالْقَرَا ○'' یعنی اے خدا! اِن سے گرمی اور سردی دونوں کو دُور رکھ۔ چنانچہ ابنِ لیلیٰ کہتے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام سخت گرمی میں روئی کا لباس اور سخت سردی میں باریک کپڑے کا لباس زیب تن فرما لیتے تو بھی اُنہیں کوئی ضرر نہ پہنچتا تھا۔ [1] مسعودی بیان کرتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے اپنے زمانۂ خلافت میں بھی کبھی نیا لباس زیب تن نہیں کیا۔ عام طور پر کرتہ، تہ بند اور چادر استعمال کرتے تھے اور سر پر عمامہ پسند فرماتے تھے کیونکہ عمامہ عربوں کا تاج ہے۔ عمامے کے علاوہ ٹوپی بھی استعمال کر لیا کرتے تھے، دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے، کبھی عقیق کی، کبھی فیروزہ کی، کبھی یاقوت کی اور کبھی حدید کی۔ انگوٹھی پر ''الملک للہ'' اور بقولے ''للہ الملک'' کندہ ہوتا۔ پاؤں میں کھجور کی چھال کے جوتے پہنتے تھے۔ اپنے جوتے خود ہی مرمت کر لیا کرتے تھے۔ [2]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[1] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۷

[2] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۵۷، بحوالہ: صافی

طعامِ امیر المومنین علی علیہ السلام

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ امیر المومنین علیہ السلام کا کھانا کھانے کا انداز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت مشابہ تھا۔[1] آپ علیہ السلام کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھوتے، دوزانوں ہوکر دسترخوان پر بیٹھتے اور بسم اللہ پڑھ کر شروع کرتے۔ کھانے کی ابتدا نمک سے کرتے۔ گرم کھانے کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرتے اور اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے کی بجائے سامنے سے پانچوں اُنگلیوں کی مدد سے تناول فرماتے۔ سالن اور شوربے وغیرہ کو رکابی کے درمیان سے اُٹھانے کی بجائے کنارے سے لیتے۔ کھانا ہمیشہ سادہ اور روکھا پھیکا پسند فرماتے جو کہ عموماً روٹی، نمک اور ساگ پات پر مشتمل ہوتا۔ دسترخوان سے روٹی کے ذرے بااہتمام چُن کر کھا لیتے اور فرماتے کہ اس میں شِفا ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء پر پھونک مارنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مشروب میں سادہ پانی اور خاص طور پر بارش کا پانی پسند فرماتے۔ ابنِ ابی الحدید نے لکھا ہے، ''اگر روٹی کے ساتھ کوئی چیز استعمال کرتے تو وہ سرکہ یا نمک ہوتا، اس سے تجاوز کرتے تو سبزی اور اس سے آگے بڑھتے تو تھوڑا سا اُونٹنی کا دُودھ لیتے۔ گوشت بہت کم کھاتے، فرماتے کہ اپنے شکموں کو حیوانوں کا قبرستان مت بناؤ۔''[2] البتہ، بقولے امام محمد باقر علیہ السلام مہمانوں کی تواضع گوشت سے کرتے اور خود سرکہ یا روغن زیتون کے ساتھ جَو کی روٹی تناول فرماتے۔ عدی بن حاتم نے آپ علیہ السلام کو نمک کے ساتھ جَو کی سوکھی روٹی کھاتے دیکھا تو حیرت سے سوال کیا کہ آپ دن بھر مصروفِ جہاد رہتے ہیں اور راتوں میں مشغولِ عبادت، پھر بھی ایسا کھانا کھاتے ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا اپنے نفس کو قناعت کا خوگر بناؤ ورنہ

---

[1] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۴۸ تا ۱۵۴
ابنِ ہشام، (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ، ج ۲ ص ۲۰۰
ابنِ اثیر جزری، (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) جامع الاصول، ج ۴ ص ۴۰۶
حافظ محمد بن یوسف گنجی شافعی، (متوفی: ۶۵۸ ھجری، دمشق) کفایۃ الطالب، ج ۱ ص ۴۰۵

[2] علامہ مفتی جعفر حسین، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۵۵، بحوالہ: شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۱ ص ۲۶

ضرورت سے زیادہ کا خواہش مند بن جائے گا۔[1] سوید بن غفلہ نے دیکھا کہ آپ علیہ السلام جَو کی سوکھی روٹی کبھی ہاتھ سے اور کبھی گھٹنے پر رکھ کر توڑتے حتیٰ کہ عید کے موقع پر بھی روٹی اور خطیفہ (جَو کے آٹے اور دُودھ کا مُرَکَّب، دلیہ) تناول فرما رہے تھے۔[2]

آپ علیہ السلام ایک وقت میں دو اقسام کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر جب آپ علیہ السلام کے کھانے میں روغن شامل کرنے کی اجازت طلب کی گئی تو فرمایا، ''ہم ایک وقت میں دو طرح کی چیزیں نہیں کھاتے۔''[3] ابنِ ابی الحدید نے لکھا ہے کہ آپ نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔[4]

اکثر دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ اللہ کے کچھ خاص بندے اور اولیا کرام اپنا کھانا ساتھ لے کر چلتے ہیں اور کسی کے ہاں سے یا بازار سے کچھ لے کر نہیں کھاتے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ایسا امیر المومنین علیہ السلام کی پیروی میں ہی کرتے ہوں کیونکہ آپ علیہ السلام روٹی کے سوکھے ٹکڑے اور ستو ایک مہر بند تھیلی میں ساتھ رکھا کرتے تھے۔ کسی نے کہا کہ عراق میں تو غلے کی کمی نہیں پھر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا کہ بات غلے کی کمی کی نہیں۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ اپنے پیٹ میں ایسی چیز ڈالوں جسے میں نہیں جانتا۔[5] یعنی اگر ہم کہیں اور سے کوئی چیز لے کر کھاتے ہیں تو ہم اُس کے بارے میں یقینی طور پر نہیں جانتے کہ وہ کیسی ہے؟ وہ یا اُس کے ذرائع حلال ہیں یا حرام؟ جائز ہیں یا ناجائز؟

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ○

---

[1] علامہ مفتی جعفر حسین، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۵۲، بحوالہ:
محمد بن علی ابنِ شہر آشوب (متوفی: ۵۸۸ ہجری، حلب) مناقب آل ابی طالب، ج ۱ ص ۳۶۸

[2] علامہ مفتی جعفر حسین، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۵۶، بحوالہ:
میرزا حسین نوری طبرسی (متوفی: ۱۹۰۲ء، نجف) مستدرک الوسائل، ج ۱۶ ص ۱۹۹

[3] علامہ مفتی جعفر حسین، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۵۷، بحوالہ: کفایہ الطالب، ج ۱ ص ۳۹۸

[4] علامہ مفتی جعفر حسین، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۵۷، بحوالہ: شرح نہج البلاغہ، ابی الحدید، ج ۱ ص ۲۶

[5] علامہ مفتی جعفر حسین، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۵۱، بحوالہ: تاریخ کامل، ج ۳ ص ۴۰۱

اوصافِ امیر المومنین علی علیہ السلام

سیّد نجم الحسن کراروی اپنی شہرہ آفاق کتاب ''چودہ ستارے'' میں حضرت علی علیہ السلام کے باب میں لکھتے ہیں:

اوصافِ علی بہ گفتگو ممکن نیست — گنجائشِ بحر در سبو ممکن نیست
من ذاتِ علی بوا جبی کے دانم — الا دانم کہ مثل اُو ممکن نیست

(علی علیہ السلام کے اوصاف بیان کرنا ممکن نہیں ہے جیسے کُوزے میں دریا کو بند کرنا ممکن نہیں۔ میں علی علیہ السلام کی ذات سے متعلق کیا کہوں؟ بس اتنا جانتا ہوں کہ اُن کی مثال ممکن ہی نہیں)

مولودِ کعبہ حضرت علی علیہ السلام، حضرت ابوطالب علیہ السلام اور جناب فاطمہ بنتِ اسد علیہا السلام کے بیٹے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے داماد، بھائی اور جانشین، حضرت فاطمہ علیہا السلام کے شوہر اور حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، حضرت عباس علمدار، حضرت زینب اور حضرت اُمّ کلثوم علیہم السلام کے پدرِ بزرگوار تھے۔ آپ ہمیشہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدارُ المُہام کی حیثیت سے کار پرداز رہے۔ اُمورِ مملکت ہوں یا میدانِ جنگ، آپ ہر موقع پر تاجدارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمدوش و ہمرکاب رہے۔ عہدِ رسالت کی فتوحات کا سہرا ہمیشہ آپ ہی کے سر رہا۔ اسلام کی پہلی منزل دعوتِ ذوالعشیرہ سے لے کر تابہ ارتحالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو کسی صورت بھلائے نہیں جاسکتے کیونکہ آپ پیدا ہی کیے گئے تھے اسلام اور پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے۔ [1]

اہلِ سنت کے نامور عالم دین قاضی محمد سلیمان منصور پوری، اپنی تالیف ''رَحمۃٌ لِّلعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)'' میں حضرت مولا علی علیہ السلام کے باب میں اِس جملے سے آغاز فرما کر گویا کوزے میں دریا کو بند کرتے ہیں، ''اِس امامِ ہادی انام ابوالآئمہ العظام کے محاسن وفضائل کے لیے دفتر درکار ہیں اگر حیات

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی، (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۱۱۹

باقی رہی تو انشاء اللہ ان کی سیرت پر ایک علاحدہ جلد لکھوں گا۔''[1] آگے چل کر لکھتے ہیں، ''حضور (حضرت علی علیہ السلام) کے شاندار کارناموں میں شبِ ہجرت، بدر، اُحد، خندق، صلح حدیبیہ اور خیبر و حنین کے واقعات نہایت مشہور ہیں۔ شجاعت اور فضلِ قضایا میں بین الاماثل ممتاز تھے۔ سیّدۃُ النساء فاطمۃُ الزہرا (علیہا السلام) کے زوج اور حسن و حسین (علیہما السلام) کے والد بزرگوار تھے۔ ابوالحسن کنیت فرماتے تھے اور ابوتراب کنیت پر جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عطیہ ہے، نہایت شاد ماں ہوتے تھے۔[2]

امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی شان میں مُتعدّد آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی وارد ہوئی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر حسبِ حال کیا جائے گا۔ یہاں صرف ایک آیتِ کریمہ اور اس سے متعلق حدیث مبارکہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

''اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ ۝۵۵'' (تمہارا حاکم و سرپرست اللہ ہے۔ اُس کا رسول ہے اور وہ صاحبان ایمان ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔)[3]

اس آیت کریمہ کے شانِ نزول میں بیشتر محدثین نے یہ حدیثِ مبارکہ بیان کی ہے:

''حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سائل حضرت علی علیہ السلام کے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ اُس وقت آپ علیہ السلام نماز میں حالتِ رکوع میں تھے۔ اُس نے آپ کی انگوٹھی کھینچی۔ آپ علیہ السلام نے وہ انگوٹھی اُسے عطا فرما دی پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر دی۔ اس موقع پر نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

''اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ ۝۵۵'' (تمہارا حاکم و سرپرست اللہ ہے۔ اُس کا رسول ہے اور وہ صاحبان ایمان ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت مبارکہ کو پڑھا اور فرمایا، ''جس کا میں مولا ہوں اُس کا علی مولا ہے، اے اللہ! جو اِسے دوست رکھے تُو اُسے دوست رکھ اور جو اِس سے عداوت

---

[1] قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری (متوفی: ۱۹۳۰ء) کتاب: رَحمۃً لّلعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۲ ص ۳۳۶

[2] قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری (متوفی: ۱۹۳۰ء) کتاب: رَحمۃً لّلعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۲ ص ۳۳۸

[3] سورۃ المائدہ، آیت: ۵۵

رکھے تو اُس سے عداوت رکھ۔'' [1]

ولایتِ علی علیہ السلام اہلِ سنت علما کی نظر میں

ڈاکٹر محمد طاہر القادری اپنی کتاب ''السیفُ الجَلی عَلیٰ مُنکرِ ولایۃ عَلی (علیہ السلام)'' میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب'' الفہیمات الالٰہیہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں،''اس اُمتِ مرحومہ میں فاتح اوّل ولایت کا دروازہ سب سے پہلے کھولنے والے فرد حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت میں پہلا فرد جو ولایت (سب سے اعلیٰ واقویٰ طریق) کے بابِ جذب کا فاتح بنا اور جس نے اس مقام بلند پر (پہلا) قدم رکھا وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے، اسی وجہ سے روحانیت و ولایت کے مختلف طریقوں کے سلاسل آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، حضرت امیر علیہ السلام کا رازِ ولایت آپ کی اولاد کرام میں سرایت کر گیا چنانچہ اولیائے اُمت میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی طور پر حضرت علی علیہ السلام کے خاندانِ امامت سے (اکتسابِ ولایت کے لئے) وابستہ نہ ہو۔''

ڈاکٹر محمد طاہر القادری آگے چل کر لکھتے ہیں،''اِس نکتہ کو شاہ اسماعیل دہلوی نے بصراحت یوں لکھا ہے،''حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے لئے شیخین پر بھی ایک گونہ فضیلت ثابت ہے اور وہ فضیلت آپ علیہ السلام کے فرمانبرداروں کا زیادہ ہونا اور مقاماتِ ولایت بلکہ قطبیت اور غوثیت اور ابدالیت اور انہی جیسی باقی خدمات

---

[1] طبرانی (متوفی:۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الصغیر، ۱:۶۵؛
طبرانی (متوفی:۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الاوسط، ۱۳۰، ۱۲۹:۷، رقم:۶۲۲۸
طبرانی (متوفی:۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الکبیر، ۱۹۵:۵؛ ۲۰۴، ۲۰۳، رقم ۵۰۶۸، ۵۰۹۷، ۵۰۹۲، ۵۰۶۹
احمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) المسند، ۱۱۹:۱؛ ۳۷۲:۴
حاکم نیشاپوری (متوفی: ۱۰۱۴ء، نیشاپور) المستدرک، ۱۱۹:۳، رقم حدیث: ۴۵۷۶؛ ۵۵۹۴
نور الدین ہیثمی (متوفی: ۸۰۷ ہجری) مجمع الزوائد، ۱۷:۷
نور الدین ہیثمی (متوفی: ۸۰۷ ہجری) موارد الظمآن: ۵۴۴، رقم: ۲۲۰۵
خطیب بغدادی (متوفی: ۴۶۳ ہجری، بغداد) تاریخ بغداد، ۳۷۷:۷
عز الدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) اسد الغابہ، ۳۶۲:۲؛ ۴۸۷:۳
ضیاء الدین مقدسی (متوفی: ۶۴۳ ہجری، دمشق) الاحادیث المختارۃ، ۱۷۴، ۱۰۶:۲، رقم: ۵۵۳، ۴۸۰
حسام الدین ہندی (متوفی: ۱۵۶۷ء مکہ) کنز العمال، ۳۳۳، ۳۳۲:۱۱، رقم: ۳۱۶۶۲

کا آپ کے زمانے سے لے کر دُنیا کے ختم ہونے تک آپ ہی کی وساطت سے ہونا ہے اور بادشاہوں کی بادشاہت اور امیروں کی امارت میں آپ کو وہ دخل ہے جو عالمِ ملکوت کی سیر کرنے والوں پر مخفی نہیں۔ اہلِ وِلایت کے اکثر سلسلے بھی جناب مرتضیٰ علیہ السلام ہی کی طرف منسوب ہیں، پس قیامت کے دن بہت فرمانبرداروں کی وجہ سے جن میں اکثر بڑی بڑی شانوں والے اور عمدہ مرتبے والے ہوں گے، حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کا لشکر اس رونق اور بزرگی سے دکھائی دے گا کہ اِس مقام کا تماشا دیکھنے والوں کے لئے یہ امر نہایت ہی تعجب کا باعث ہوگا۔ یہ فیضِ وِلایت کہ اُمتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جس کا منبع و سرچشمہ سیّدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام مقرر ہُوئے اِس میں سیّدۂ کائنات حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام اور حضرات حسنین کریمین علیہما السلام بھی آپ کے ساتھ شریک کیے گئے ہیں اور پھر اُن کی وساطت سے یہ سلسلۂ وِلایتِ کبریٰ اور غوثیتِ عظمیٰ اُن بارہ آئمہ اَہل بیت (علیہم السلام) میں ترتیب سے چلایا گیا جن کے آخری فرد سیّدنا امام محمد مہدی علیہ السلام ہیں۔ جس طرح سیّدنا مولا علی علیہ السلام اُمتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فاتحِ وِلایت کے درجہ پر فائز ہُوئے، اُسی طرح سیّدنا امام مہدی علیہ السلام اُمتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خاتمِ وِلایت کے درجہ پر فائز ہوں گے۔ اِس موضوع پر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی تحقیق ملاحظہ فرمائیں۔ آپ لکھتے ہیں، ''اور ایک راہ وہ ہے جو قربِ وِلایت سے تعلق رکھتی ہے۔ اقطاب واوتاد اور بدلا اور نجباء اور عام اولیاء اللہ اِسی راہ سے واصل ہیں، اور راہِ سلوک اِسی راہ سے عبارت ہے، بلکہ متعارف جذبہ بھی اِسی میں داخل ہے اور اس راہ میں توسط ثابت ہے اور اس راہ کے واصلین کے پیشوا اور اُن کے سردار اور اُن کے بزرگوں کے منبعِ فیض حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ الکریم ہیں اور یہ عظیم الشان منصب اُن سے تعلق رکھتا ہے۔ اس راہ میں گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں قدم مبارک حضرت علی علیہ السلام کے مبارک سر پر ہیں اور حضرت فاطمہ علیہا السلام اور حضرات حسنین کریمین علیہما السلام اس مقام میں اُن کے ساتھ شریک ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضرت امیر علیہ السلام اپنی جسدی پیدائش سے پہلے اِس مقام کے ملجا و ماویٰ تھے، جیسا کہ آپ علیہ السلام جسدی پیدائش کے بعد ہیں اور جسے بھی فیض و ہدایت اِس راہ سے پہنچی ان کے ذریعے پہنچی، کیونکہ وہ اس راہ کے آخری نقطہ کے نزدیک ہیں اور اس مقام کا مرکز ان سے تعلق رکھتا ہے، اور جب حضرت امیر علیہ السلام کا دَور ختم ہُوا تو یہ عظیم القدر منصب ترتیب وار حضرات حسنین کریمین علیہما السلام کو سپرد ہُوا اور اُن کے بعد وہی منصب آئمہ اثنا عشرہ میں سے ہر ایک کو ترتیب وار اور تفصیل

سے تفویض ہُوا، اور اِن بزرگوں کے زمانے میں اور اِسی طرح اِن کے انتقال کے بعد جس کسی کو فیض اور ہدایت پہنچی ہے اِنہی بزرگوں کے ذریعے پہنچی ہے، اگرچہ اقطاب و نجبائے وقت ہی کیوں نہ ہوں، اور سب کے ملجا و ماویٰ یہی بزرگ ہیں کیونکہ اطراف کو اپنے مرکز کے ساتھ الحاق کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔'' حضرت مجدد الف ثانی مزید فرماتے ہیں کہ امام مہدی علیہ السلام بھی کارِ ولایت میں حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے ساتھ شریک ہوں گے۔ [1]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○



[1] قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری (متوفی: ۱۹۳۰ء) کتاب: رَحمۃً لّلعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۲ ص ۳۳۸

پہلی باجماعت نماز

امام سیّد الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماموم امیر المومنین علیہ السلام

(۱۲ قبل ہجرت/ ۶۱۰ء)

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر چالیس سال ایک یوم تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غارِ حرا میں مشغولِ عبادتِ پروردگار تھے کہ آواز آئی ''یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)!'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ پھر آواز آئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ اِدھر اُدھر دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر ایک نورانی مخلوق پر پڑی۔ وہ جبرائیل علیہ السلام تھے۔ اُنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا، ''اِقْرَأْ'' (پڑھیے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''مَا اَقْرَأُ'' (کیا پڑھوں؟) اُنہوں نے عرض کی ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ①'' (پڑھیے اپنے رَب کا نام لے کر جس نے (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو) خلق فرمایا)۔[1] پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کچھ پڑھ دیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علمِ قرآن پہلے سے حاصل تھا۔ جبرائیل علیہ السلام کی اِس تحریکِ اقراء کا مقصد یہ تھا کہ نزولِ قرآن کی ابتدا ہو جائے۔ اس کے بعد جبرائیل علیہ السلام نے وضو اور نماز کی طرف اشارہ کیا اور نماز کی تعدادِ رکعت کی طرف بھی متوجہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو کیا اور نماز ادا فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے جو نماز ادا فرمائی وہ ظہر کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام اور حضرت علی علیہ السلام سے یہ واقعہ بیان فرمایا۔ دونوں نے فوراً اظہارِ ایمان کیا اور نمازِ عصر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے باجماعت ادا کی۔ یہ اسلام کی پہلی نمازِ باجماعت تھی، اِس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام اور حضرت خدیجہ علیہا السلام اور حضرت علی علیہ السلام ماموم تھے۔ عفیف کندی نے اپنی روایت میں چشم دید گواہ کی حیثیت سے بیان کیا ہے کہ بعثت کے فوراً بعد میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اِس عالم میں نماز پڑھتے ہُوئے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے جناب خدیجہ علیہا السلام اور حضرت علی علیہ السلام کھڑے ہُوئے تھے، اور اُس وقت کوئی اور اسلام نہیں لایا تھا۔[2]

---

[1] سورۃ العلق، آیت ۱

[2] ابنِ عبد البر القرطبی (متوفی: ۴۶۳ ہجری، شاطبہ) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج ۲ ص ۲۲۵

عز الدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) اسد الغابۃ، ج ۲ ص ۴۱۴

ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ کبیر، ج ۲ ص ۴۱۲

ابو الفداء عماد الدین ابن کثیر (متوفی: ۷۳۱۳ء، دمشق) تاریخ کامل، ج ۲ ص ۲۰

علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۵۲، ۵۳

اِس واقعے کی تفصیل یوں ہے کہ ابنِ عفیف کندی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں تجارت پیشہ آدمی تھا، حج کے لیے مکّہ آیا تو عباس بن عبدالمطلبؓ کے پاس کچھ مال خریدنے کے لیے آیا۔ ہم منیٰ میں تھے کہ قریب ہی نصب ایک خیمے سے ایک عظیم شخصیت برآمد ہوئی۔ اُنہوں نے وقت کا اندازہ لگانے کے لیے سورج کی طرف دیکھا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ پھر اُس خیمے سے ایک خاتون نکلیں اور اُن کے پیچھے کھڑی ہو کر نماز کی طرف متوجہ ہو گئیں، اُن کے بعد ایک نوخیز نوجوان بھی خیمے سے نکلا جو بلوغت کے قریب پہنچا ہُوا تھا۔ وہ بھی اُن کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے (اُس عظیم شخصیت سے متعلق) حضرت عباسؓ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اُنہوں نے کہا یہ میرے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے؟ کہنے لگے کہ یہ اُن کی زوجہ خدیجہ بنت خویلد (علیہا السلام) ہیں۔ میں نے جوان کے بارے میں استفسار کیا تو اُنہوں نے بتایا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچازاد بھائی علی (علیہ السلام) ابنِ ابی طالب ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی ہیں، ابھی تک اس دعویٰ میں اُن کی تصدیق و تائید صرف اِن کی زوجہ خدیجۃ الکبریٰ (علیہا السلام) اور چچازاد بھائی (علی علیہ السلام) نے کی ہے۔ [1]

امیر المومنین علیہ السلام خود فرماتے ہیں کہ میں خدا کا بندہ، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھائی اور صدیقِ اکبر ہوں میرے بعد یہ دعویٰ صرف جھوٹا شخص ہی کرے گا، تمام لوگوں سے سات برس پہلے میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں جس نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ [2] ایک اور مقام پر آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اُس زمانے میں اسلام صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خدیجہ علیہا السلام کے گھر میں تھا اور میں اس گھر کا تیسرا فرد تھا۔ [3]

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) ج ۲ ص ۲۱۲
ابوالفداء عمادُ الدین ابن کثیر (متوفی: ۷۳ ۱۳ء، دمشق) تاریخ کامل، ج ۲ ص ۲۲۲
ابنِ عبدالبر القرطبی (متوفی: ۴۶۳ ہجری، شاطبہ) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج ۳ ص ۳۳۰
عبدالرحمٰن ابن جوزی (متوفی: ۱۲۰۱ء، بغداد) سیرتِ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (ترجمہ الوفا با حوال المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ص ۲۰۵

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۱۳
ابنِ ماجہ (متوفی: ۸۶۶ء، قزوین) سنن ابن ماجہ، ج ۱ ص ۵۷

[3] نہج البلاغہ عبدہ، خطبہ ۱۸۷

دعوتِ ذوالعشیرہ

(سنہ ۴ بعثت، ۹ قبل ہجرت/ ۶۱۴ء)

تحریکِ اسلام کی پہلی منزل ''دعوتِ ذوالعشیرہ'' تھی۔ دعوتِ ذوالعشیرہ کا واقعہ سنہ ۴ بعثت کا ہے۔ بعثت یعنی اعلانِ نبوّت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین سال تک رازداری کے ساتھ فرائضِ نبوّت کی انجام دہی فرمائی، پھر حکمِ خدا آیا کہ اب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھلے عام تبلیغ فرمائیں چنانچہ تبلیغِ دین کا باقاعدہ آغاز اِسی منزل سے ہوتا ہے۔ تاریخ ابو الفداء کے ترجمہ میں مولانا کریم الدین حنفی لکھتے ہیں کہ تین برس تک پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خفیہ طور پر دعوتِ اسلام کرتے رہے مگر جب یہ آیت نازل ہوئی ''وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ'' [1] یعنی ڈرایئے اپنے کنبے والوں کو جو قریب کے رشتہ دار ہیں، تو اُس وقت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حکمِ خدا کے مطابق دعوتِ اسلام کا اظہار کرنا شروع کیا۔ اِس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی (علیہ السلام) سے ارشاد فرمایا کہ اے علی! کھانے کا ایک پیمانہ تیار کرو اور دُودھ کا ایک بڑا برتن بھی لاؤ اور عبدالمطلب کی اولاد کو بُلاؤ تا کہ میں اُن سے کلام کروں اور وہ حکم سناؤں جس پر باری تعالیٰ کی طرف سے مامور ہُوا ہوں۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے حسبِ حکم کھانے کا ایک پیمانہ تیار کر کے اولادِ عبدالمطلب کو، جو تقریباً چالیس آدمی تھے، مدعو کیا۔ اُن لوگوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت ابوطالبؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ بھی تھے۔ حضرت علی (علیہ السلام) نے وہ تیار شدہ کھانا لا کر حاضر کیا اور سب لوگ کھا پی کر سیر ہو گئے۔ حضرت علی (علیہ السلام) فرماتے ہیں کہ جو کھانا اُن سب آدمیوں نے کھایا وہ ایک آدمی کی خوراک کے مطابق تھا۔ اُس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چاہتے تھے کہ کچھ ارشاد فرمائیں لیکن ابولہب فوراً بول اٹھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بڑا جادُو کیا۔ یہ سنتے ہی تمام لوگ منتشر ہو کر چلے گئے اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ یہ حال دیکھ کر جناب رِسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے علی (علیہ السلام) تم نے دیکھا! اِس شخص نے کیسی سبقت کی اور مجھ کو بولنے تک نہیں دیا۔ اب کل پھر کھانا تیار کرو

---

[1] سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۲۱۴

جیسا کہ آج کیا تھا اور پھر سب کو بُلا کر جمع کرو۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے دوسرے روز بھی حسبِ حکم کھانا تیار کر کے سب لوگوں کو جمع کیا۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگوں کی قسمت بہت اچھی ہے کیونکہ میں اللہ کی طرف سے تمہارے لئے ایسی چیز لایا ہوں جس سے تمہیں دُنیا میں فضیلت اور آخرت میں نیکی حاصل ہوگی۔ خدا تعالیٰ نے مجھے تمہاری ہدایت کا حکم دیا ہے، کیا تم میں سے کوئی شخص اِس اَمر کی اقتدا کر کے میرا بھائی اور وصی اور خلیفہ بننا چاہتا ہے؟ اُس وقت سب موجود تھے، لوگوں کا ایک ہجوم تھا جب حضرت علی (علیہ السلام) نے عرض کی کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دشمنوں کو نیزہ ماروں گا، اُن کی آنکھیں پھوڑوں گا، اُن کے پیٹ چاک کروں گا، اُن کی ٹانگیں کاٹوں گا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وزیر بنوں گا۔ رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُس وقت علی مرتضیٰ (علیہ السلام) کی گردن پر اپنا دستِ مبارک رکھ کر (لوگوں سے) فرمایا کہ تمہارے درمیان یہ میرا بھائی ہے اور میرا وصی ہے اور میرا خلیفہ ہے، اِس کی بات سُنو اور اس کی اطاعت کرو۔ یہ سُن کر قوم کے سب لوگ از روئے تمسخر ہنس کر کھڑے ہو گئے اور حضرت ابو طالب (علیہ السلام) سے کہنے لگے کہ اپنے بیٹے کی بات سُنو اور اس کی اطاعت کرو، یہ تجھے حکم ہُوا ہے۔ [1]

مؤرّخ ابوالفداء کی تحریر پر علامہ نجم الحسن کراروی نے اپنی تصنیف چودہ ستارے میں وضاحتی نوٹ میں لکھا ہے کہ آیت ''وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ'' [2] کے نزول کی تفصیل حضرت علی علیہ السلام کی خلافتِ بلافصل کی بنیاد قائم کرتی ہے۔ اِس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول اور عمل نے ثابت کر دیا کہ حضرت علی علیہ السلام ہی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ اوّل اور خلیفہ بلافصل ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں اپنا جانشین اور خلیفہ بنایا اور اس کی تجدید اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں فرماتے رہے یہاں تک کہ غدیرِ خم میں آخری حج کے موقع پر آخری اعلان فرمایا اور واضح کر دیا کہ میرے بعد علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی میرے جانشین اور خلیفہ ہیں۔ مؤرّخ ابوالفداء نے اسلام کی اِس پہلی اور بنیادی دعوتِ تبلیغ کی مناسب وضاحت کر دی ہے اور صاف لفظوں میں بیان کر دیا ہے کہ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو اپنا جانشین اور خلیفہ اِسی بنیادی دعوت کے موقع پر بنا دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ اِن کی بات غور سے سنو اور اِن کی اطاعت کرو۔

---

[1] سیّد نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۵۴
مولانا کریم الدین حنفی (متوفی: ۱۸۷۹ء، لاہور) ترجمہ تاریخ ابوالفداء، ص ۳۳ تا ۳۶

[2] سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۲۱۴

کچھ کم وبیش لفظوں کے ساتھ یہ واقعہ، تاریخ طبری ج۲ ص۲۱۷، تاریخ کامل بن اثیر ج ۲ص ۲۲۱، لباب التاویل ج۵ص۱۰۶، معالم التنزیل برحاشیہ خازن ج۲ ص۱۰۵، خصائص نسائی ص۱۳، مسند احمد بن حنبل ج۳ص۳۶۰، کنز العمال ج۶ص۳۹۷، سیرۃ ابن اسحاق، تفسیر ابن حاتم، دلائل بہیقی، مناقب امام احمد، مصنف ابوبکر ابن ابی شیبۃ، تاریخ خمیس، تفسیر ابن مردویۃ، تفسیر سراج منیر، تفسیر ثعلبی، تفسیر واحدی، حلیۃ الاولیاء، ذخیرۃ المآل عجلی، مختارہ ضیاء مقدسی، تہذیب الاثار طبری، اکتفاء عاصمی، روضۃ الصفا، حبیب السیر، معارج النبوّۃ، مدارج النبوّۃ، ازالۃ الخفا، تاریخ اسلام عبدالحکیم نشتر ج۱ص۴۴ وغیرہ میں موجود ہے اور اِن اسلامی کتب کے علاوہ اس کا تذکرہ اہلِ فرنگ کی تصانیف میں بھی ہے۔ ملاحظہ ہو اپالوجی جان ڈیون پورٹ ص۵، کارلائل ص۶۱، خلفاء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آیرونگ ص۳، تاریخ گبٹن ج۳ ص۴۹۹، اوکلی ص۱۵۔[1]

کوئی سیاسی مہم ہو، سماجی معاملہ یا تبلیغِ دین، عموماً مہم چلانے والا لوگوں کے دروازوں تک جاتا ہے اور جا کر اُنہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے، ایسے موقع پر اُس کی حیثیت سائل کی سی ہوتی ہے۔ اسلام کی پہلی اور اہم ترین دعوت، دعوتِ ذوالعشیرہ میں نبی گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اندازِ تبلیغ بالکل مختلف ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کے ہاں سوالی بن کر نہیں جا رہے بلکہ اپنے دولت کدے پر قریش کے سرکردہ افراد کو مدعو کر رہے ہیں اور نہایت باوقار طریقے سے فرما رہے ہیں، ''تم لوگوں کی قسمت اچھی ہے کیونکہ میں اللہ کی طرف سے ایسی چیز لایا ہوں جس سے تمہیں فضیلت حاصل ہو سکتی ہے، میں تمہارے لیے دُنیا اور آخرت میں اچھائی لے کر آیا ہوں اور خدا تعالیٰ نے مجھے تمہاری ہدایت کا حکم فرمایا ہے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کے منفی رویّے کے باوجود دوبارہ اور سہ بارہ اُنہیں بلاتے ہیں، کھانے سے تواضع فرماتے ہیں اور دینِ اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے رویّے سے دلبرداشتہ ہوتے ہیں نہ اپنا فریضۂ تبلیغ ترک کرتے ہیں۔ قریش کے مغرور، متکبر اور گستاخ سرداروں کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ثابت قدم رہنا اور اکیلے ڈٹے رہنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عزمِ صمیم اور قوتِ برداشت کی ایک شاندار مثال ہے۔ اُس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشت پر صرف تین ہستیاں موجود تھیں، پیکرِ وفا شریکِ حیات حضرت خدیجہ علیہا السلام، ضعیف مگر شفیق چچا حضرت ابوطالب علیہ السلام اور

[1] نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۴ء، پاکستان) چودہ ستارے ص۵۵

نو عمر بھائی حضرت علی علیہ السلام جن کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا جانشین، وصی اور خلیفہ قرار دیا۔ یہ کوئی اقربا پروری نہیں تھی بلکہ خالصتاً ''اہلیت'' کی بنیاد پر کیا گیا فیصلہ تھا جسے حضرت علی علیہ السلام نے ابتدا سے لیکر تا بحیاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت کیا۔ اس دعوت کے موقع پر اگر علی علیہ السلام کے کردار کا بغور جائزہ لیا جائے تو چند نہایت اہم اور دلچسپ پہلو نظر آتے ہیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ میں نے قریش کو مدعو کیا ہے لہٰذا ایک پیمانہ کھانے کا اور ایک پیالہ دُودھ کا تیار کرو۔ علی علیہ السلام اتنے قلیل کھانے کے حکم پر متعجب ہوتے ہیں نہ ہی سوال کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مہمانوں کی کثیر تعداد کے لیے اتنا قلیل کھانا کیسے پورا آئے گا؟ دراصل علی علیہ السلام اتنی کم عمری میں بھی یقینِ کامل کی اُن بُلندیوں پر فائز ہیں کہ حکمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بلاتوقُّف تعمیل کرتے ہیں۔ دوسری طرف تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ لوگوں نے اسلام قبول کر لینے کے باوجود آنے والے کئی اہم مواقع پر نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکم عدولی کی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت پر شک کا اظہار بھی کیا اور اِس کے باوجود خود کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقرب اصحاب اور جانشین قرار دیتے رہے۔

اِس دعوت میں حضرت علی علیہ السلام کے کردار کا دوسرا اہم اور دلچسپ پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ انتہائی کم عمری میں قریش کے سورماؤں کے سامنے کھڑے ہو کر بے خوف و خطر کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کی آنکھیں پھوڑوں گا، اُن کی ٹانگیں کاٹوں گا، نیزہ ماروں گا، پیٹ چاک کروں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وزیر بنوں گا۔ چنانچہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کو اپنا وصی، جانشین اور وزیر قرار دیتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

''سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ○''

(پاک ہے وہ جو اپنے بندۂ خاص کو رات کے تھوڑے سے عرصے میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا وہ جس کے اردگرد ہم نے برکتیں رکھیں تاکہ دکھائیں ہم اُنہیں اپنی نشانیاں بیشک وہ سنتا دیکھتا ہے۔) [1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''مدارجُ النبوّت'' میں لکھتے ہیں کہ اسریٰ کے معنی ''لے جانا'' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکّہ سے مسجدِ اقصیٰ تک لے جایا گیا اور پھر وہاں سے آسمان پر لے جانے کا نام معراج ہے۔ یہ احادیثِ مشہورہ سے ثابت ہے، اِس کا مُنکر فاسق، جاہل، محروم اور کافر ہے کیونکہ یہ اللہ کی کتاب سے ثابت ہے۔ مذہبِ صحیح یہی ہے کہ اسریٰ و معراج سب کچھ بحالتِ بیداری اور جسم کے ساتھ تھا۔ صحابہ، تابعین اور اتباع کے مشاہیر، علماء اور اُن کے بعد محدثین، فقہا اور متکلمین کا اِسی پر ایمان ہے۔ اِس پر احادیثِ صحیحہ اور اخبارِ صریحہ متواتر ہیں۔ [2]

ملا فتح اللہ کاشانی اور احمد بن علی طبرسی کے مطابق معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت کے بارہویں سال میں ہوئی۔ [3] اس میں اختلاف ہے کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کی وفات سے پہلے ہوئی یا بعد میں۔ [4] علامہ طباطبائی کے مطابق مسلمانوں کا مشہور نظریہ ہے کہ ہجرت سے پہلے اور بعثت کے بعد مکہ کے آخری سالوں میں معراج ہوئی۔ [5] تاہم یہ بھی منقول ہے کہ معراج کا واقعہ ایک بار نہیں بلکہ مُتَعَدِّد بار پیش آیا۔ [6] مختلف

---

[1] سورۃ الاسراء، آیت نمبر ۱

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۱، باب ذِکر معراج

[3] ملا فتح اللہ کاشانی (متوفی: ۹۸۸ق، کاشان) منہج الصادقین، ۱۳۳۶ش، ج ۵ ص ۲۳۶

[4] محمد حسین طباطبائی (متوفی: ۱۹۸۱ء، قم، ایران) تفسیر المیزان، ج ۱۳ ص ۳۰
جعفر سبحانی (متولد: ۱۳۰۸ء، قم) فروغ ابدیت، ص ۳۷۲

[5] محمد حسین طباطبائی (متوفی: ۱۹۸۱ء، قم، ایران) تفسیر المیزان، ۱۴۱۷ق، ج ۱۳ ص ۳۰، ۲۳

[6] قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری (متوفی: ۱۹۳۰ء) کتاب: رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱ ص ۹۶
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۱، باب ذِکر معراج

مؤرّخین نے اس واقعہ کی مختلف تاریخیں بیان کی ہیں، ایک روایت کے مطابق معراج کا واقعہ ۲۷ رجب ۱۰ نبوّت کو پیش آیا۔[۱] دوسری روایت کے مطابق ۲۷ رجب کو اعلانِ نبوّت کے بارہویں سال یعنی ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا جبکہ واقدی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج مکّہ میں ہجرت سے چھ ماہ قبل، ۱۷ رمضان کی شب، دارِ اُمّ ہانی بنتِ ابی طالب سے اور بعض کے نزدیک خانہء حضرت خدیجہ کبریٰ علیہا السلام سے اور کچھ کے مطابق شعبِ ابو طالب سے تھی۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ معراج ۲ ربیع الاوّل کو اعلانِ نبوّت کے دو سال بعد ہوئی۔[۲]

''الرحیق المختوم'' میں مندرجہ ذیل اقوال درج ہیں:[۳]

۱) بحوالہ طبری، جس سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوّت دی گئی اُسی سال معراج بھی واقع ہوئی۔

۲) نبوّت کے پانچ سال بعد معراج ہوئی۔

۳) نبوّت کے دسویں سال ۲۷ رجب کو معراج ہوئی۔

۴) ہجرت سے ۱۶ ماہ قبل، نبوّت کے بارہویں سال، ماہِ رمضان میں معراج ہوئی۔

۵) ہجرت سے ۱۴ ماہ پہلے، نبوّت کے تیرہویں سال، ماہِ محرم الحرام میں معراج ہوئی۔

۶) ہجرت سے ۱۲ ماہ قبل، نبوّت کے تیرہویں سال، ماہِ ربیع الاوّل میں معراج ہوئی۔

نوٹ: ''الرحیق المختوم'' کے مندرجہ بلا اقوال میں ''نبوّت'' سے مراد میرے نزدیک ''اعلانِ نبوّت'' یعنی بعثت ہے۔ (مؤلف)

علامہ حسین بخش جاڑا، ''تفسیر انوار النجف فی اسرار مصحف'' میں لکھتے ہیں کہ رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکّہ مکرمہ میں اپنی بہن (چچازاد بہن، حضرت اُمّ ہانی بنت ابو طالبؑ) کے گھر پر آرام فرما رہے تھے جب معراج کا واقعہ پیش آیا۔

تفسیر برہان میں بروایتِ قمی، امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں مکّہ میں محوِ خواب تھا، علی (علیہ السلام) دائیں طرف، جعفر طیار (رضی اللہ عنہ) بائیں جانب اور حمزہ (رضی اللہ عنہ)

---

[۱] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۴ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۶۱

[۲] مولانا سید ظفر حسن، کتاب مستطاب مجمع الفضائل (ترجمہ: مناقب علامہ ابنِ شہر آشوب) ج ۱ ص ۸۴

[۳] مولانا صفی الرحمن مبارکپوری (متوفی: ۲۰۰۶ء مبارکپور، بھارت) الرحیق المختوم، ص ۱۹۷، بحوالہ: طبری

میرے سامنے موجود تھے۔ میں نے فرشتوں کے پروں کی آواز سُنی۔ ایک نے (جبرائیلؑ سے) پوچھا کہ اے جبرائیل! تجھے کس کے پاس جانا ہے؟ جبرائیل (علیہ السلام) نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ اِن کے پاس اور یہی تمام بنی آدم کے سردار ہیں، اِن کی آنکھیں سوتی ہیں لیکن دِل بیدار رہتا ہے اور کان سنتے ہیں، یہ علی (علیہ السلام) اِن کے وصی، وزیر، داماد اور خلیفہ ہیں اور وہ اِن کے چچا حمزہ (رضی اللہ عنہ) ہیں اور وہ اِن کے چچازاد بھائی جعفر طیار (رضی اللہ عنہ) ہیں جن کو دو تر و تازہ پر عطا ہوں گے اور وہ ملائکہ کے ساتھ جنّت میں پرواز کریں گے۔ اُنہوں نے کہا کہ ایک بادشاہ ہے جس نے گھر بنوایا، دسترخوان لگایا اور دعوت کے لیے قاصد بھیجا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا کہ وہ بادشاہ اللہ ہے، دُنیا گھر ہے، جنّت دسترخوان ہے اور دعوت کے لیے بھیجا گیا قاصد میں ہوں۔ پس جبرائیل علیہ السلام نے بڑھ کر براق حاضر کیا، بیت المقدس تک سیر کرائی اور انبیاء کرام علیہم السلام کے محراب اور نشانیاں دکھائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معراج کی اور راتوں رات واپس بھی پہنچے۔ [1]

بروایتِ قمی، آسمانِ اوّل پر ایک فرشتہ مؤکل ہے جس کا نام اسماعیل ہے، اُس کے ماتحت ستر ہزار فرشتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک ستر ستر ہزار فرشتوں کا سردار ہے۔ اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شاندار استقبال کیا اور پھر آسمانِ اوّل کی سیر کرائی۔ بروایتِ کافی، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب آسمانِ اوّل کے تمام فرشتے آداب بجالائے تو احوال پُرسی کرتے ہوئے عرض کی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بھائی (علی علیہ السلام) کا کیا حال ہے؟ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واپس تشریف لے جائیں تو (برائے مہربانی) اُن کو ہمارا اسلام کہیے گا۔ پھر دوسرے آسمان کی طرف روانگی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انوار کی برسات ہوئی جسے دیکھ کر فرشتوں میں تحیّر و اضطراب کی لہر پیدا ہوئی اور وہ سب سجدے میں گر کر پروردگار عالم کی تسبیح و تقدیس کرنے لگے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمات میں آداب و سلام بجالائے اور عرض کی کہ زمین پر پلٹ کر علی (علیہ السلام) کو ہمارا سلام کہیے گا۔

تیسرے آسمان پر بھی سب ملائکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم کے لئے جھکے، سلام پیش کیا اور احوال پُرسی کرتے ہوئے عرض گذار ہوئے کہ علی (علیہ السلام) کہاں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ زمین پر ہیں۔ آسمانِ چہارم پر بھی حسبِ سابق ملائکہ نے رسمی کلام کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں پوچھا پھر حکمِ الٰہی

---

[1] علامہ حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء، پاکستان) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۲۵۸، ۲۵۹

ہُوا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! سر اُٹھا کر دیکھیے، پس تمام حجابات دُور ہُوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عالم بالا کے تمام ممکنات کو ملاحظہ فرمایا۔ تب ارشاد ہُوا کہ حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! نیچے دیکھیے۔ تمام پردے ہٹ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین تک ہر شے کا نظارہ کیا، زیرِ عرش چشمۂ صَاد سے وضو کیا اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔

تفسیر ثعلبی اور خطیب کی اربعین سے بروایتِ ابن مسعود (رضی اللہ عنہ)، حضرت رِسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ شبِ معراج جب میں جبرائیل (علیہ السلام) کے ہمراہ چوتھے آسمان پر پہنچا تو میں نے سُرخ یاقوت کا ایک مکان دیکھا۔ جبرائیل (علیہ السلام) نے بتایا کہ یہ بیتُ المعمور ہے جس کو آسمان و زمین کی خلقت سے پچاس ہزار برس پہلے خالقِ کائنات نے پیدا کیا۔ پھر مجھے حکمِ پروردگار ہُوا کہ نماز پڑھاؤ چنانچہ میں نے تمام انبیاء (علیہم السلام) کو نماز پڑھائی۔ سلام کے بعد ایک فرشتے نے پروردگار کی طرف سے سلام پہنچایا اور پیغام دیا کہ اِن (انبیاء کرام علیہم السلام) سے دریافت کریں کہ اِن کی بعثت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے کیوں ہوئی؟ پس میں نے اُن سے پوچھا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوّت اور علی (علیہ السلام) کی وِلایت پر مبعوث ہوئے۔

قمی کی روایت کے مطابق، چوتھے آسمان کی سیر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانچویں آسمان پر پہنچے جہاں حضرت ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں فرشتوں کو دیکھا۔ پھر چھٹے آسمان پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی اور لاتعداد ملائکہ کو ملاحظہ فرمایا۔ اس کے بعد ساتویں آسمان پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ملے، بروایتے بیتُ المعمور اِسی آسمان پر ہے جو فرشتوں کے لیے مقامِ حج ہے۔ پس آسمان کے عجائبات کا نظارہ کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیتُ المعمور میں نماز ادا کی، چشمۂ کوثر سے پانی پیا اور چشمۂ رَحمت میں غسل فرمایا پھر جنّت کی سیر کی، وہاں کے پرندوں کا مشاہدہ فرمایا، انار دیکھے جو حجم میں بہت بڑے تھے، پھر ایک درخت ملاحظہ فرمایا جس کا تنا اتنا بڑا تھا کہ تیز پرواز پرندہ اس کے اردگرد سات سو برس پرواز کرتا رہے تو بھی اُس کا ایک چکر پورا نہ کر سکے۔ جنّت کے ہر مکان میں اُس کی شاخیں موجود تھیں، جبرائیل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ شجرۂ طوبیٰ ہے۔ [1]

---

[1] علامہ حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء، پاکستان) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۲۵۹ تا ۲۶۳

شجرۂ طوبیٰ

شجرۂ طوبیٰ کا ذِکر قرآن حکیم میں یوں آیا ہے:[1]

''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ○''

(وہ لوگ جو ایمان لائیں اور عملِ صالح کریں تو اُن کے لیے طوبیٰ ہے اور اچھا انجام۔)

طوبیٰ کے کئی معانی بیان کیے گئے ہیں اور سب کا مآل یہ ہے کہ یہ مومنین و صالحین کے لیے جنّت کا ایک انعام ہے۔ علامہ حسین بخش جاڑا لکھتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا، ''جب دو مومن آپس میں مصافحہ کرتے ہیں تو اُن کے گناہ درخت کے پتوں کی طرح جھڑتے ہیں، جب وہ ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہیں تو فرشتے اُن کو خیر کی دُعا دیتے ہیں اور جب وہ ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں تو اُن کو منادی ندا دیتا ہے کہ تمہارے لیے طوبیٰ ہے اور جب وہ ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہیں تو دو فرشتے اُنہیں بشارت دیتے ہیں کہ اے اللہ کے دوستو! تمہارے لیے جنّت ہے۔''

بروایتِ کافی، امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا، ''دِین والوں کی کئی علامتیں ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں، اور وہ علامتیں ہیں، سچ بولنا، امانت کا ادا کرنا، عہد کو وفا کرنا، صلہ رحمی کرنا، کمزوروں پر رحم کرنا، عورتوں کی بات کم ماننا، لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنا، خوش خلقی سے پیش آنا، حلم و حوصلہ سے کام لینا، علم کا اتباع کرنا اور ہر وہ کام کرنا جو اللہ کے قرب کا باعث ہو پس اُن دیندار لوگوں کے لیے طوبیٰ ہوگا۔''

روایت ہے کہ طوبیٰ جنّت کا ایک درخت ہے اور اس کی اصل (جڑ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں ہے، ہر مومن کے گھر میں اُس کی شاخ ہے اور مومن جس چیز کی خواہش کرے گا وہ اُس شاخ پر پیدا ہو جائے گی۔ طوبیٰ کا حجم اتنا ہے کہ اگر تیز رفتار سوار اُس کے سائے میں ایک سو سال تک دوڑے تو بھی اُسے پار نہ کر سکے اور اگر کوئی بُلند پرواز طائر اُس کے نیچے سے اُوپر کی طرف پرواز کرے تو اُس کی بُلندی تک عمر بھر نہ پہنچ سکے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ طوبیٰ اُس شخص کے لیے ہے جس نے ہمارے غائب (امام مہدی علیہ السلام) کے زمانے میں ہماری ولاء سے تمسُّک پکڑا اور اُس پر ثابت قدم رہا۔ ایک روایت میں ہے کہ جو شخص تین مومنوں کو کھانا کھلائے گا خداوند کریم اُس کو تین جنتوں سے کھانا کھلائے گا، ایک فردوس سے،

---

[1] سورۃ الرعد، آیت ۲۹

دوسرے جنّتِ عدن سے اور تیسرے طوبیٰ سے۔ یہ بھی مروی ہے کہ اِس درخت کا پھل جہاں سے توڑا جائے گا اُس کی جگہ فوراً دوسرا پھل اُگ آئے گا اور وہ جگہ خالی نہ رہے گی۔ روایاتِ اہل بیت علیہم السلام میں ہے کہ طُوبیٰ جنّت کا ایک درخت ہے جس کی اصل امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے گھر میں ہے۔ مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طوبیٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی اصل میرے گھر میں اور شاخیں جنتیوں کے گھروں میں ہوں گی۔ پھر جب دوبارہ سوال کیا گیا تو فرمایا کہ اس کی اصل علی (علیہ السلام) کے گھر میں اور شاخیں مومنوں کے گھروں میں ہوں گی۔ کسی نے دریافت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ (تضادِ بیان) کیوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تعجب نہ کرو کیونکہ جنّت میں میرا اور علی (علیہ السلام) کا گھر ایک ہی جگہ ہوگا۔ رِسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ معراج جب میں جنّت میں داخل ہُوا تو جبرائیل مجھے طوبیٰ کے پاس لے گیا اور اُس کا پھل کھلایا جو میری پشت میں جوہرِ تخلیق بنا۔ پس، جب میں زمین پر پہنچا تو وہ جوہر خدیجہ (علیہا السلام) کے بطن میں منتقل ہُوا اور فاطمہ (علیہا السلام) کی ولادت ہوئی لہٰذا جب میں فاطمہ (علیہا السلام) کو پیار کرتا ہوں تو (اُن کے وجودِ پاک سے) شجرِ طوبیٰ کی خوشبو محسوس کرتا ہوں۔ [1]

اہلِ سنت علما کے نزدیک بھی روایتوں میں آیا ہے کہ سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنّت کے درختوں میں سے ایک احسن وطیّب درخت (طوبیٰ) کا پھل کھلایا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشتِ مطہر میں نطفہء اقدس بن گیا۔ پس جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمین پر تشریف لائے اور اُمّ المومنین سیّدہ خدیجہ طاہرہ علیہا السلام کے حقوقِ زوجیت ادا فرمائے تو صدفِ مادر میں گوہرِ خاتونِ جنّت سیّدہ فاطمۃ الزہرا علیہا السلام قرار پایا۔ [2]

''تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف'' میں بحوالہ ''تفسیر برھان''، بروایتِ موفق بن احمد بلال، منقول ہے کہ ایک روز حضرت رِسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ مبارک خوشی سے چودھویں کے چاند کی طرح منوّر تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے مجھے اپنے چچازاد بھائی علی (علیہ السلام) سے متعلق خوشخبری دی ہے کہ اُس نے علی (علیہ السلام) کی شادی میرے جگر کے ٹکڑے فاطمہ (علیہا السلام) کے ساتھ کردی ہے اور (اس موقع پر) رضوانِ جنّت نے بحکمِ پروردگار، طوبیٰ کو ہلایا تو اُس پر اتنے رقعے پیدا ہوئے جتنے تاقیامت میری اہل

---

[1] علامہ حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء پاکستان) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج۸ ص ۱۳۳

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج۱، باب ذِکر معراج

بیت (علیہم السلام) کے چاہنے والے ہوں گے اور خداوند کریم نے طوبیٰ کے نیچے نورانی فرشتے پیدا کیے جن کے سپرد وہ رقعے کیے گئے۔ جب قیامت کے روز تمام انسان محشور ہوں گے تو وہ فرشتے ہر محبِ اہل بیت (علیہم السلام) کو ایک ایک رقعہ دیں گے جو جہنم سے برأت نامہ اور جنّت کا پروانہ (ٹکٹ) ہوگا۔ پس میرے بھائی علی (علیہ السلام) اور میری جگر گوشہ فاطمہ (علیہا السلام) کے طفیل میری اُمت کے بہت سے لوگ جہنم سے نجات پائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آسمانِ ہفتم پر میں نے شجرۂ طوبیٰ کو ملاحظہ کیا پھر میں سدرۃُ المنتہیٰ پر پہنچا جس کا ایک ایک پتّا ایک بڑی جماعت کو سایہ دے سکتا تھا۔ [1]

مقصدِ معراج

معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کئی مقاصد مستند روایات میں نظر آتے ہیں جن میں سے ایک حضرت علی علیہ السلام اور خاتونِ جنّت حضرت فاطمہ علیہا السلام کی مناکحت بھی تھا۔ جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طوبیٰ کا پھل کھلایا گیا جو سیّدۃ النساء حضرت فاطمہ علیہا السلام کی ولادت کا ذریعہ بنا جبکہ اِس شق میں مقصدِ معراج خاتونِ جنّت علیہا السلام کی مناکحت بیان کیا گیا ہے جو بظاہر ایک تضاد معلوم ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ معراج ایک بار نہیں مُتعدّد بار ہُوا، [2] اس لئے ہوسکتا ہے کہ ایک موقع پر اس کا مقصد جناب سیّدہ علیہا السلام کی ولادت اور دوسرے پر مناکحت ہو۔ پس احادیثِ مبارکہ اور مختلف اسلامی روایات کے مطابق حضرت علی علیہ السلام اور خاتونِ جنّت علیہا السلام کی شادی جنّت میں قرار پائی۔ شیخ صدوقؒ کئی اسناد سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے راحیل نامی جنت کے فرشتے کو علی علیہ السلام اور فاطمہ علیہا السلام کے نکاح کا خطبہ پڑھنے کا حکم صادر فرمایا۔ [3] ابو الحسن نجفی نے بھی ''مجمع النورین'' میں لکھا ہے کہ معراج کے دو مقاصد تھے، اوّل خلافتِ علی علیہ السلام اور دوم علی و بتول (علیہما السلام) کی شادی، اور کہا ہے کہ احادیثِ مستفیضہ اس پر دلالت کرتی ہیں۔ [4]

معراج کا مقصد وِلایتِ علی علیہ السلام اور وِلایتِ آئمہء اہل بیت علیہم السلام بھی تھا۔ شیخ ابوالحسن نجفی کی

---

[1] علامہ حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء پاکستان) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۱۳۳

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۱ ص ۲۰۹، باب ذِکر معراج
حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۲۶۴ بحوالہ: تفسیر برھان

[3] شیخ صدوق بن بابویہ ابوجعفر محمد بن علی بن حسین (متوفی ۳۸۱ ہجری، رے) عیون اخبار الرضا، ج ۱ ص ۳۹۲

[4] حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۲۶۴ بحوالہ: مجمع النورین

مندرجہ بالا روایت اور مُتعدّد دیگر روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ پروردگارِ عالم نے ایک اہم ترین فریضہ یعنی ولایتِ علی علیہ السلام کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلقین فرمائی۔

تفسیر برہان میں بروایتِ صفّار، امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک سو بیس مرتبہ معراج نصیب ہوئی اور ہر دفعہ دوسرے فرائض سے بڑھ کر خدا نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ولایتِ علی علیہ السلام اور ولایتِ آئمہء اہل بیت علیہم السلام کی تلقین فرمائی۔ عیاشی سے بھی اِسی مضمون کی حدیث مروی ہے اور معراج کے سفر نامے میں ملائکہ کے سوال و جواب میں بھی اِس اَمر کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔ [1]

''تفسیر برہان'' میں ''کافی'' سے منقول ہے کہ ابوبصیر سے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ معراج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشادِ الٰہی ہُوا کہ آپ کے بعد اُمت کا والی کون ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کی کہ یا اللہ! تُو ہی جانتا ہے۔ ارشادِ ربُّ العزت ہُوا کہ (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد) علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) ہی ہے جو مومنوں کا امیر، مسلمانوں کا سردار اور نورانیوں کا قائد و رہبر ہے۔ پس امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اے ابوبصیر! خدا کی قسم! علی علیہ السلام کی ولایت زمینی نہیں ہے، یہ آسمان سے اُتری ہے۔ [2]

''تفسیر صافی'' میں ''کشف الغمہ'' سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ خدا نے شبِ معراج آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کس لہجے میں گفتگو فرمائی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ علی (علیہ السلام) کے لہجے میں۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ معراج پر جب خداوند متعال نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ اے پروردگار! میرے ساتھ تُو ہم کلام ہے یا علی؟ تو ارشاد ہُوا کہ اے احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں وہ ہوں کہ میری مثل کوئی شے نہیں، مجھے کسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے اور نہ چیزوں سے میری صفت کی جا سکتی ہے، میں نے تجھے اپنے نُور سے پیدا کیا اور علی کو تیرے نُور سے پیدا کیا، میں تیرے دِل کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہوں، مجھے علم ہے کہ تیرے دِل میں علی ابنِ ابی طالب سے زیادہ کسی کی محبت نہیں ہے پس میں نے اُسی کے لہجے میں تجھ سے گفتگو کی ہے تا کہ تیرا دِل مطمئن رہے۔ اِسی طرح کی حدیث ''ینابیع المودّۃ'' میں بھی منقول ہے۔ [3]

---

[1] حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۲۶۴ بحوالہ: تفسیر برہان

[2] حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۲۶۵ بحوالہ: تفسیر برہان

[3] حسین بخش جاڑا، تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۲۶۶ بحوالہ: تفسیر صافی و ینابیع المودۃ

تفسیر برہان میں حضرت ابو بریدہ سے مروی ہے کہ حضرت رِسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی (علیہ السلام)! تجھے خدا نے سات مقامات پر میرے ساتھ حاضر کیا ہے۔

پہلا مقام: شبِ معراج جب میں آسمان پر پہنچا تو جبرائیل نے مجھ سے پوچھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بھائی کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ اُس نے کہا کہ اللہ سے دُعا مانگیں کہ وہ اُس کو یہاں حاضر کردے۔ چنانچہ میں نے دُعا مانگی اور اچانک تیری مثال میرے ساتھ موجود تھی۔

دوسرا مقام: جب میں دوبارہ معراج پر گیا تو جبرائیل نے پوچھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بھائی کہاں ہے؟ تو میں نے جواب دیا کہ پیچھے چھوڑ کر آیا ہوں۔ اُس نے کہا کہ اللہ سے دُعا مانگیں کہ وہ اُس کو لے آئے چنانچہ میں نے دُعا مانگی تو تیری مثال میرے ہمراہ تھی۔ پس آسمانوں کے پردے اُٹھا دیئے گئے تو میں نے اُس کی ساکن آبادیوں کا اور ہر فرشتہ کی قیام گاہ کا مشاہدہ کیا۔

تیسرا مقام: جب میں جِنّات کی قوم کی طرف بھیجا گیا تو جبرائیل نے اِستفسار کیا کہ آپ کا بھائی کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ پھر جبرائیل کے کہنے پر میں نے دُعا کی اور دیکھا تو میرے ہمراہ تُو تھا، پھر اُن (قومِ جنات) کے ساتھ جس قدر گفتگو ہوتی رہی تُو سنتا رہا۔

چوتھا مقام: شبِ قدر میں تُو میرا شریک ہے اور کوئی نہیں۔

پانچواں مقام: نبوَّت کے سوا ہر بات میں تُو میرا شریک ہے۔

چھٹا مقام: جب میں نے آسمانوں پر نبیوں کو نماز پڑھائی تو تیری مثال میرے پیچھے موجود تھی۔

ساتواں مقام: احزاب کی ہلاکت ہمارے ہاتھوں ہوئی۔ [1]

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ حضرت رِسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، ''شبِ معراج ہر آسمان پر فرشتے مجھے مبارکباد دیتے رہے اور جبرائیل نے ملائکہ کے ایک جمِ غفیر کے ہمراہ یہ کہا کہ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اُمت علی (علیہ السلام) کی محبت پر جمع ہو جاتی تو خدا دوزخ کو پیدا ہی نہ کرتا۔ اے علی! خدا نے سات مقامات پر تجھے میرے ساتھ حاضر کیا چنانچہ میں مانوس ہو گیا۔'' پھر حدیثِ سابق کی طرح مقامات گنوائے، جن میں پانچویں مقام پر یہ بیان فرمایا، ''جب میں اللہ سے مناجات کر رہا تھا تو اُس وقت بھی تیری مثال میرے ساتھ تھی اور میں نے تیرے لیے کچھ چیزیں پروردگار سے طلب کیں اور سوائے نبوَّت کے اُس

---

[1] علامہ حسین بخش جاڑا، تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۲۶۶، ۲۶۷ بحوالہ: تفسیر برہان

نے سب قبول کیں اور فرمایا کہ نبوّت تیرا ہی خاصہ ہے اور تُو اس کا خاتم ہے اور چھٹا مقام یہ ہے کہ جب میں نے بیتُ المعمور کا طواف کیا تو تیری مثال میرے ساتھ تھی۔'' ساتواں مقام حسبِ سابق بیان کیا اور اُس کے بعد ارشاد فرمایا، ''خُدا نے دُنیا کی طرف نظر کی تو مجھے عالمین کے مَردوں پر مُنتَخَب فرمایا پھر تجھے چُنا پھر فاطمہ (علیہا السلام) کو تمام عالمین کی عورتوں سے برگزیدہ کیا پھر حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کو تمام جہانوں پر برگزیدہ کیا۔'' پھر فرمایا کہ اے علی! میں نے دیکھا ہے کہ چار مقامات پر تیرا نام میرے نام کے ساتھ مسطور و مذکور ہے اور میں اُسے پڑھ کر مانوس ہُوا ہوں اور وہ مقامات یہ ہیں:

اوّل: شبِ معراج جب میں بیتُ المقدس میں پہنچا تو وہاں پتھر پر لکھا ہُوا دیکھا:

''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَيَّدْتُهٗ بِوَزِيْرِهٖ وَنَصَرْتُهٗ بِهٖ۝''

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں
جن کی تائید اُن کے وزیر کے ساتھ کی اور اُس (وزیر) کو اُن کا مددگار بنایا ہے۔)

میں نے پوچھا کہ اے جبرائیل میرا وزیر کون ہوگا تو وہ کہنے لگا کہ علی بن ابی طالب (علیہ السلام)۔

دوم: سِدرۃُ المنتہیٰ پر یہی کلمات تحریر ہیں۔[1]

سوم: جب سدرۃُ المنتہیٰ سے چل کر عرش کے قریب پہنچا تو ساقِ عرش پر لکھا ہُوا پایا:

''لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا اللّٰهُ وَحْدِيْ مُحَمَّدٌ حَبِيْبِيْ وَ صَفْوَتِيْ مِنْ خَلْقِيْ اَيَّدْتُهٗ بِوَزِيْرِهٖ وَاَخِيْهِ وَنَصَرْتُهٗ بِهٖ۝''

(میرے سوا کوئی معبود نہیں میں اللہ احد ہوں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرا حبیب اور تمام مخلوق سے برگزیدہ ہے، میں نے
اُس کی تائید اُس کے وزیر اور بھائی کے ساتھ کی اور میں نے اُسے اُس کا مددگار بنایا۔)

چہارم: میں نے جنّت میں شجرۂ طوبیٰ کو دیکھا جس کی اصل اے علی تمہارے گھر میں ہے اور جنّت کے ہر محل میں اُس کی شاخیں ہیں اور اُس کی اصل سے پانی، دودھ، شراب اور شہد کی چار نہریں جاری ہیں۔[2]

بروایتِ مجالسِ شیخ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی! تیرے لیے مجھے سات چیزیں عطا ہوئیں:

۱) میں پہلا شخص ہوں جو لحد سے باہر آؤں گا اور تُو میرے ہمراہ ہوگا۔

---

[1] شیخ ابوالحسن نجفی (متوفی: ۱۳۴۹ ہجری، رے) مجمع النورین

[2] علامہ حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء پاکستان) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج۸ ص۲۶۷

۲) تُو پہلا شخص ہے جسے میرے ساتھ (جنّت کا) لباس پہنایا جائے گا اور جو میرے ساتھ زندہ ہوگا۔
۳) تُو پہلا شخص ہے جو عرش کے دائیں جانب میرے ساتھ کھڑا ہوگا۔
۲) تُو پہلا شخص ہے جو پُل صراط پر میرے ہمراہ کھڑا ہوگا اور دوزخ سے کہے گا کہ اُس کو لے لے کہ وہ تیرا ہے اور اِس کو چھوڑ دے کہ یہ تیرا نہیں ہے۔ (یعنی دوزخیوں اور جنتیوں کا انتخاب علی علیہ السلام کے حکم سے ہوگا۔)
۵) تُو پہلا شخص ہے جو جنّت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔
۶) تُو پہلا شخص ہے جو جنّت میں جا کر علیین (جنت کے گھر) میں میرے ساتھ سکونت پذیر ہوگا۔
۷) اور تُو پہلا شخص ہے جو رحیق المختوم سے پیئے گا جس پر کستوری کی مُہر ہوگی۔

امالی شیخ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب میں ''قَابَ قَوْسَيْنِ'' کے مقام پر پہنچا تو ارشادِ الٰہی ہُوا کہ تُو سب سے زیادہ دوست کس کو رکھتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ علی (علیہ السلام) کو تو ارشاد ہُوا کہ مڑ کر دیکھو چنانچہ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے بائیں جانب علی (علیہ السلام) موجود تھے۔[1]

کیا حضرت علی علیہ السلام شریکِ معراج تھے؟

علی علیہ السلام شریکِ معراج تھے یا نہیں؟ اِس کا مختصر اور آسان فہم جواب ہے کہ نہیں۔ معراج پر جانا حضرت رِسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاصہ ہے اور یہ شرف سوائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کسی کو حاصل نہیں۔

بلاشُبہ اللہ عزّ وجل نے معراج کے موقع پر جو کلام اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا وہ علی علیہ السلام ہی کے لہجے میں تھا جیسا کہ کتب میں مسطور ہے البتہ مقامِ اشتباہ وہ احادیث ہیں جن میں حضرت علی علیہ السلام کا وہاں موجود ہونا حضرت رِسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ اس کا حل یہ ہے کہ اکثر روایات میں ''مثال'' کا لفظ موجود ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات پر بیان کی گئی روایات میں بارہ آئمہ طاہرین علیہم السلام کے مثالی اجسام کا عرش پر موجود ہونا بیان کیا گیا ہے کہ وہ فضائے نُور میں مشغولِ عبادتِ پروردگار تھے۔ پس حضرت علی علیہ السلام بنفسِ نفیس وہاں موجود نہیں تھے بلکہ آپ کی مثال موجود تھی۔ تفسیر برہان میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ معراج جب مجھ سے خطابِ پروردگار ہُوا، ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ ○[2]'' (رسول اُن تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہے جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر اتاری

---

[1] علامہ حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء پاکستان) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۲۶۴ بحوالہ: امالی
[2] سورۃ البقرہ، آیت ۲۸۵

گئی ہیں۔) تو میں نے جواب میں کہا، ''وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ق غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ○'' [1] (اور مؤمنین بھی خدا پر، اُس کے ملائکہ پر، اُس کی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں کہ) ہم خدا کے رسولوں میں تفریق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے فرمانِ الٰہی سُنا اور اُس کی اطاعت کی! پروردگار ہمیں تیری مغفرت درکار ہے اور تیری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔) پھر ارشاد ہُوا، ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں نے زمین پر نگاہِ قدرت کی اور تجھے چُن لیا اور تیرا نام اپنے نام سے مشتق کیا، جہاں میرا ذِکر ہوگا وہاں تیرا ذِکر بھی (ساتھ ساتھ) ہوگا پس میں محمود ہوں اور تُو محمد ہے، پھر میں نے دوبارہ زمین پر نظرِ انتخاب کی تو علی (علیہ السلام) کو چُنا اور اُس کا نام بھی اپنے نام سے مشتق کیا، میں اعلیٰ ہوں اور وہ علی ہے۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں نے تم کو اور علی، فاطمہ، حسن، حسین اور باقی آئمہ (علیہم السلام) جو حسین (علیہ السلام) کی نسل سے ہونے والے ہیں، اُن سب کو اپنے نُور سے خلق کیا اور تمہاری وِلایت کو میں نے تمام اہلِ ارض وسما پر پیش کیا، جس نے اِس کو قبول کیا وہ میرے نزدیک مومن ہے اور جس نے اِس کا انکار کیا وہ میرے نزدیک کافر ہے۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اگر میرے بندوں میں سے کوئی میری عبادت کرتے کرتے نڈھال اور بوسیدہ ہو جائے لیکن وہ تمہاری وِلایت کا اقرار نہ کرے تو میں اُس کو نہیں بخشوں گا جب تک کہ وہ تمہاری وِلایت کا اقرار نہ کرے۔'' پھر ارشاد ہُوا، ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا تُو اُن (معصومین) کو دیکھنا چاہتا ہے؟'' میں نے عرض کی، ''ہاں پروردگار!'' پس خطاب ہُوا، ''عرش کی دائیں جانب نگاہ کرو۔'' میں نے دائیں طرف دیکھا تو علی، فاطمہ، حسن، حسین، علی بن حسین، محمد باقر بن علی، جعفر صادق بن محمد باقر، موسیٰ کاظم بن جعفر صادق، علی رضا بن موسیٰ کاظم، محمد تقی بن علی رضا، علی نقی بن محمد تقی، حسن عسکری بن علی نقی، اور محمد مہدی بن حسن عسکری (علیہم السلام) کو ایک فضائے نُور میں مصروفِ عبادت پایا اور حضرت مہدی (علیہ السلام) ایک درخشاں ستارے کی طرح اُن سب کے وسط میں جلوہ افروز تھے۔ پس ارشادِ باری تعالیٰ ہُوا، ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہ سب میری طرف سے حجّت ہوں گے اور ''وہ'' (حضرت امام مہدی آخر الزمان علیہ السلام) تیری (مظلوم) عترت کا بدلہ لینے والا ہوگا۔ مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم کہ وہ میرے دوستوں کے لیے حجّتِ واجبہ اور میرے دشمنوں سے انتقام لینے والا ہوگا۔'' تفسیرِ مذکور میں ہے کہ اس روایت کو بعض مخالفین نے بھی نقل کیا ہے۔ اسی تفسیر میں مروی ہے کہ ایک

---

[1] سورۃ البقرہ، آیت ۲۸۵

یہودی نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا، ''شبِ معراج آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلا کلام کون سا ہُوا تھا؟

آپ نے فرمایا، ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ ○''[1]

یہودی نے کہا، ''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔''

آپ نے فرمایا، ''اس کے بعد یہ جو کہ قولِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے:

''وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ○''[2]

یہودی کہنے لگا، ''میری مراد اِس سے بھی نہیں۔''

آپ نے فرمایا، ''پوشیدہ باتوں کو رہنے ہی دو۔''

یہودی بولا، ''اگر آپ نہیں بتا سکتے تو (اِس کا مطلب ہے کہ) آپ ''وہ'' نہیں ہیں۔''

آپ نے فرمایا، ''اگر تجھے بہر حال پوچھنا ہی ہے تو سُن! جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج سے واپس تشریف لا رہے تھے اور ابھی حجابوں کی منازل میں تھے اور مقامِ جبرائیل تک نہیں پہنچے تھے کہ پیچھے سے ایک فرشتے نے صدا دی، ''یا احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)!'' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کہا، ''لبیک'' فرشتے نے عرض کی، ''اللہ (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ سیّد وَلی کو (میرا) سلام کہیے گا۔'' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (اتمام حجّت کے لیے) پوچھا، ''سیّد وَلی کون ہے؟'' اُس نے کہا، ''وہ علی بن ابی طالب (علیہ السلام) ہیں۔''

یہ سُن کر یہودی بولا، ''بے شک! خدا کی قسم! میں نے اپنے والد کی کتاب میں ایسا ہی پڑھا ہے۔'' وہ یہودی حضرت داؤد علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا۔[3]

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[1] سورۃ البقرہ، آیت ۲۸۵

[2] سورۃ البقرہ، آیت ۲۸۵

[3] علامہ حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء پاکستان) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف، ج ۸ ص ۲۶۸ بحوالہ: تفسیر برہان

معاشرتی مُقاطعہ

(محرم ۷ قبل ہجرت/ستمبر ۶۱۵ء)

نورِ اسلام کو شب و روز پھیلتا دیکھ کر کفّارِ قریش سخت مضطرب تھے۔ اُن کی چیرہ دستیاں زور پکڑ گئیں اور عداوتیں عروج پر پہنچ گئیں۔ بروایتِ ابنِ ہشام وابنِ اثیر وطبری، اَبُوجَہل بن ہشام، شیبہ، عتبہ بن ربیعہ، نصر بن حارث، عاص بن وائل اور عقبہ بن ابی معیط وغیرہ ایک گروہ کے ساتھ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل پر کمر بستہ ہو کر حضرت ابوطالب علیہ السلام کے پاس آئے۔ اُنہوں نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک نئے دِین کا اختراع کیا ہے اور وہ ہمارے خداؤں کو جھوٹا کہا کرتے ہیں لہٰذا اُنہیں ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم اُنہیں قتل کر دیں یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ حضرت ابوطالب علیہ السلام نے اُس وقت اُنہیں ٹال دیا اور وہ واپس چلے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا مشن بلاتوقُّف جاری رکھا یہاں تک کہ وہ پھر حضرت ابوطالب کے پاس آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل پر مُصر ہُوئے۔ حضرت ابوطالب علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کے ارادوں سے آگاہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ چچا جان! میں جو کہتا ہوں وہ کہتا ہی رہوں گا، میں کسی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوسکتا اور نہ کسی لالچ میں ہی آسکتا ہوں، اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیں تو بھی میں حکمِ خدا کی تعمیل سے نہیں رکوں گا۔ میں جو کرتا ہوں خدا کے حکم سے کرتا ہوں اور وہی میرا محافظ ہے۔ حضرت ابوطالب علیہ السلام نے کہا، ''آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنا کام جاری رکھیں، ربِ کعبہ کی قسم! جب تک میں زندہ ہوں کوئی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پابند کر سکے گا نہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہاتھ روک سکے گا۔''[1] اِس ضمن میں حضرت ابوطالب علیہ السلام نے ایک شعر کہا جس کا مطلب یہ ہے:

''خدا کی قسم! کبھی بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف کوئی (میلی آنکھ سے) نہ دیکھ سکے گا جب تک کہ میں مٹی میں دفن نہ کر دیا جاؤں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے دِین کو علی الاعلان پھیلایئے، کوئی اندیشہ نہ کیجیے، خوش رہیے اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھیئے۔''[2]

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۴ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۵۶ تا ۵۸ بحوالہ: ابنِ ہشام وابنِ اثیر وطبری

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، جلد ۲ ص ۶۹

ابنِ کثیر اور ابنِ ہشام نے روایت کی ہے کہ کفّار کچھ عرصہ بعد پھر حضرت ابوطالب (علیہ السلام) کے پاس آئے اور کہا کہ تم اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کردو اور بدلے میں بنی مخزوم کا ایک جوان ہم سے لے لو۔ حضرت ابوطالب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ تم کیسی بعید از عقل باتیں کرتے ہو؟ بھلا یہ ہوسکتا ہے کہ تم میرے بیٹے کو قتل کردو اور میں اُس کے بدلے میں تمہارے لڑکے کو لے کر اُس کی پرورش کروں؟ یہ سُن کر اُن کی آتشِ غضب خوب بھڑک اُٹھی۔ حضرت ابوطالب (علیہ السلام) نے اُنہیں آگاہ کیا کہ کعبہ وحرم کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاؤں میں تمہارا کانٹا بھی چبھا تو میں تم سب کو ہلاک کردوں گا۔ حضرت ابوطالب (علیہ السلام) کے الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اُن کے دِلوں میں لگی آگ کو ایسا بھڑکایا کہ وہ پوری قوت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل پر تیار ہوگئے۔ حضرت ابوطالب (علیہ السلام) نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانِ عزیز کو غیر محفوظ پایا تو فوراً اپنے حامیوں کو لے کر، جن کی تعداد بروایتِ ''حیاتُ القلوب'' چالیس تھی، یکم محرّم سنہ ۷ بعثت کو ''شعبِ ابی طالب'' کے اندر محصور ہوگئے۔ کفّارِ قریش نے حضرت ابوطالب (علیہ السلام) کے اِس عمل پر ایک عہد نامہ مُرتّب کر کے خانہ کعبہ میں آویزاں کردیا جس میں بنی ہاشم اور بنی مُطلب سے مکمل مقاطعہ کرنے کا عہد تھا اور لکھا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی بنی ہاشم اور بنی مطلب کے ساتھ شادی بیاہ، خرید وفروخت، مِلنا جُلنا، اُٹھنا بیٹھنا حتیٰ کہ گفت وشنید بھی نہیں کرے گا اور مکمل بائیکاٹ رکھے گا۔ اُنہوں نے بازار والوں سے بھی عہد لیا کہ کوئی چیز شعبِ ابی طالب کے محصورین کے ہاتھ فروخت نہ کی جائے۔ اگر حج کے زمانے میں گردونواح سے آنے والے تاجر اُن کے ہاتھ کچھ فروخت کرنے کی کوشش کرتے تو وہ اُنہیں بھی روکتے اور وہ سامان زیادہ قیمت دے کر خود خرید لیا کرتے۔ طبری میں ہے کہ اِس عہد نامے کو منصور بن عکرمہ بن ہاشم نے لکھا تھا۔ عہد نامہ لکھنے کے بعد بحکمِ الٰہی اُس کا ہاتھ شل ہوگیا۔ [1]

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ دشمنوں نے شعبِ ابی طالب کا چاروں طرف سے محاصرہ کر کے اہلِ شعب کو نظر بند کردیا تھا۔ اِس قید کی وجہ سے محصورین، جن میں بچّے بھی تھے، بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہوگئے۔ جسمانی اور روحانی اذیت کے علاوہ خوراک کی تنگی نے اُنہیں موت کے دہانے پر پہنچا دیا یہاں تک کہ وہ اہلِ ایمان درختوں کے پتّے کھانے پر مجبور ہوگئے۔ روایت ہے کہ جب دَرّے میں محصور بچّے بھوک سے بے چین ہو کر روتے تو پڑوسیوں کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ احباب واقارب چوری چھپے اشیائے خوردونوش

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی، چودہ ستارے، ص ۵۶ تا ۵۸ بحوالہ: حیات القلوب، تاریخ طبری، تاریخ کامل، روضۃ الاحباب

پہنچانے کی کوشش کرتے مگر قریش اُنہیں سخت سزائیں دیتے۔ یہ فکر ہر وقت دامن گیر رہتی کہ کافر اچانک حملہ کر کے نبی خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں، چنانچہ حضرت ابوطالب علیہ السلام ہر وقت چوکنا رہتے اور نبی خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لئے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر پہرا دیتے اور اکثر اُنھیں سوتے سے جگا کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیتے اور اُن کے بستر پر اپنے بیٹوں میں سے کسی کو سلا دیتے۔ حلبی نے لکھا ہے کہ ابوطالب (علیہ السلام) ہر شب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہتے کہ اپنے بستر پر جا کر آرام فرمایئے۔ اور جب سب لوگ سو جاتے تو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اُٹھاتے اور اپنے کسی بیٹے یا بھائی یا ابنِ عم سے کہتے کہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بستر پر سو جائے، اس اندیشے کی بنا پر کہ کہیں کوئی بدخواہ اچانک حملہ کر کے اُنھیں قتل نہ کر دے۔[1] یہ خدمت زیادہ تر حضرت علی (علیہ السلام) سے لی جاتی اور اُنھی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سلایا جاتا۔ ابنِ ابی الحدید نے بھی لکھا ہے کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواب گاہ کا کسی کو علم ہو جاتا تو ابوطالب (علیہ السلام) کو خطرہ محسوس ہوتا، وہ رات کے کسی پہر اُنھیں جگاتے اور اُن کی جگہ اپنے بیٹے علی (علیہ السلام) کو سلا دیتے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس دوران برابر وحی نازل ہوتی رہی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کارِ رسالت بھی انجام دیتے رہے۔ اسی حالت میں تین سال گذر گئے۔ تین سال کے بعد ہشام بن عمر بن حرث کے دِل میں خیال آیا کہ یہ تو سراسر زیادتی ہے کہ ہم اور ہمارے بچّے تو خوب عیش و آرام سے رہیں مگر بنی ہاشم اور اُن کے بچّے فاقہ کشی کریں۔ پس اُس نے چند لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر قریش کے اجتماع میں یہ سوال اُٹھایا۔ ابولہب اور اُس کی بیوی اُمّ جمیل نے (جسے قرآن میں ''حَمَّالَةَ الْحَطَبِ''[3] یعنی ''ایندھن اُٹھائے پھرنے والی'' کہا گیا ہے) سخت مخالفت کی لیکن اُن کی ایک نہ چلی کیونکہ عوام کے دِل پسیج چکے تھے۔ اسی دوران حضرت ابوطالب علیہ السلام تشریف لے آئے اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ تم نے جو عہد نامہ لکھا تھا اُسے دیمک چاٹ گئی ہے اور کاغذ کے اُس حصّے کے سوا جس پر اللہ کا نام لکھا ہے باقی سب تحریر ختم ہو گئی ہے۔ اے قریش کے لوگو! اب ظلم کی انتہا ہو چکی ہے، تم اپنا وہ عہد نامہ دیکھو اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کہا درست پاؤ تو

---

[1] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۸۱
علی بن برہان الدین حلبی (متوفی: ۱۶۳۵ء، قاہرہ) السیرۃ الحلبیہ، ج ۱ ص ۳۴۲

[2] علامہ نجم الحسن کراروی، چودہ ستارے، ص ۵۶ تا ۵۸ بحوالہ: حیات القلوب، تاریخ طبری، تاریخ کامل، روضۃ الاحباب

[3] سُورۃ المَسَد (سورۃُ اللَّهَب) آیت ۴

انصاف کرو ورنہ جو چاہے کرو۔ چنانچہ حضرت ابو طالب علیہ السلام کے اصرار پر وہ عہد نامہ منگوایا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مِن وعَن درست ثابت ہُوا اور قریش کو سخت ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔ مؤرّخ ابنِ واضح یعقوبی کا بیان ہے کہ اس واقعے کے بعد بہت سے کافر مسلمان ہو گئے۔ اَبُوجَہل، اَبُولہب اور اُن کے ساتھی چیختے چلاتے رہے کہ عہد نامہ منسوخ نہ کیا جائے لیکن اُن کی ایک نہ سنی گئی اور گھاٹی کا حصار ختم کر دیا گیا۔ ہشام بن عمر بن حرث اور اس کے چار ساتھی، زہیر بن ابی اُمیہ مخزومی، مطعم بن عدی ابوالبختری بن ہشام اور زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد شعبِ ابی طالب میں گئے اور تمام محصورین کو رہائی دلا کر اُن کے گھروں تک پہنچایا۔ یوں بھی مروی ہے کہ ہشام عامری جو خانوادۂ بنو ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے خاندان کے سربرآوردہ اشخاص میں سے تھا، بنو ہاشم کو چوری چھپے غلّہ وغیرہ بھجواتا رہتا تھا۔ اُس کی تحریک پر زہیر جو حضرت عبدالمطلب کے نواسے تھے، مطعم بن عدی، ابوالبختری، ابنِ ہشام اور زمعۃ بن اسود اُس ظالمانہ معاہدے کو چاک کرنے پر آمادہ ہو گئے اور اَبُوجَہل کی مخالفت کے باوجود مطعم بن عدی نے معاہدے کی دستاویز پھاڑ ڈالی، پھر یہ لوگ مسلح ہو کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور اُنہیں دَرّے سے نکال لائے۔ [1]

پس رہائی پانے کے بعد حضرت ابو طالب علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ حرم کعبہ میں داخل ہوئے اور دُعا کی:

"اَللّٰھُمَّ انْصُرْنَا عَلٰی مَنْ ظَلَمَنَا وَ قَطَعَ اَرْحَامَنَا وَاسْتَحَلَّ مَا یُحَرِّمُ عَلَیْنَا○"

(الٰہی! ظالموں پر ہماری مدد فرما اور قطع رحمی کو دُور فرما اور جو ہم پر حرام کر دیا گیا ہے اس کو حلال بنا۔)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ○



[1] مولانا سید ظفر حسن، کتاب مستطاب مجمع الفضائل (ترجمہ: مناقب علامہ ابن شہر آشوب) ج ۱ ص ۸۸

حضرت ابوطالب علیہ السلام کی وفات
(۳ قبل ہجرت/ ۶۱۹ء)

شعبِ ابی طالب سے نکلنے کے ۸ ماہ اور گیارہ دن کے بعد ماہِ شوال کے وسط میں حضرت ابو طالب علیہ السلام کا انتقال ہوگیا۔[۱] اُس وقت اُن کی عمر ۸۶ سال تھی۔[۲] ''مدارجُ النبوَّت'' کے مطابق نبوَّت (بعثت) کے دسویں سال حضرت ابوطالب نے وفات پائی۔ ''المواھبُ اللدنیة'' میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک کے اُنچاس سال آٹھ مہینے اور گیارہ دن گذرے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت ابوطالب نے وفات پائی۔ بعض کہتے ہیں کہ سنہ ۱۰ نبوی کے نصف ماہِ شوال میں اور کچھ کہتے ہیں کہ ہجرت سے تین سال پہلے اور اُس وقت حضرت ابوطالب کی عمر ستاسی سال تھی۔[۳] حضرت ابوطالب علیہ السلام کی وفات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت رنج پہنچا اور اُسی درد والم کی وجہ سے اُس سال کو ''عامُ الحزن''، یعنی غم کا سال قرار دیا۔ مروی ہے کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام نے بنی عبدالمطلب کو اپنی وفات کے وقت بلایا اور وصیّت کی کہ تم سب ہمیشہ نیکی اور بھلائی پر قائم رہنا، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات ماننا اور ان کی نصرت و اعانت کرتے رہنا تاکہ تم رشد وفلاح پاؤ۔ ''المواھبُ اللدنیة'' میں ہشام بن سائب سے منقول ہے کہ جب حضرت ابوطالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو اُنہوں نے قریش کے جوانوں اور اُن کے بڑوں کو اپنے پاس بلایا اور اُنہیں وصیّت کرتے ہوئے کہا، ''اے گروہِ قریش! اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی مخلوق میں بزرگی دی ہے، میں تمہیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھلائی کرنے کی وصیّت کرتا ہوں، اس لیے کہ وہ قریش میں امین اور عرب میں صدیق (سچّے) ہیں اور اُن میں ہر حُسن وخوبی موجود ہے، بلاشبہ وہ ایسی بات لائے ہیں جس کو ہر دِل مانتا تو ہے مگر (بعض) زبانیں ملامت کے خوف سے انکار کرتی ہیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں دیکھ رہا ہوں عرب کے فقیروں، درویشوں، بادیہ نشینوں (جنگلوں اور صحراؤں میں رہنے والے) اور کمزور و ناتواں لوگوں کو، کہ وہ سب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کو قبول کرتے ہیں، اِن کے کلمے کی تصدیق کرتے ہیں اور اِن کو اپنا بزرگ اور رہنما مانتے ہیں۔ قریش اور اُن کے بڑوں کے سر جھک گئے ہیں، اُن کے مکانات ویران ہو گئے ہیں، کمزور لوگ صاحبِ ثروت اور عظیم بن گئے ہیں اور خوشحت اور بہرہ مند ہو گئے ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے) عرب کو خالص بنا دیا ہے اور اپنی محبت لوگوں کے دلوں میں خوب رچا بسا دی ہے اور وہ سب

---

[۱] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۴ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۵۹ بحوالہ: حیواۃ الحیوان، دمیری

[۲] احمد بن ابی یعقوب ابنِ واضح الیعقوبی (متوفی: ۸۹۷ء، مصر) تاریخ یعقوبی، ج ۲ ص ۲۸

[۳] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت (اردو) ج ۲ ص ۱۷

اِن کی اطاعت وفرمانبرداری کررہے ہیں۔ یہ تمام واقعات آئندہ رُونما ہونے والے ہیں گویا میں انہیں ابھی سے دیکھ رہا ہوں۔ تو اے گروہِ قریش! تم اِن سے محبت کرنے والے اور اِن کی نصرت وحمایت کرنے والے بن جاؤ۔ خدا کی قسم! جو بھی اِن کی پیروی اور متابعت کرے گا یقیناً ہدایت یافتہ اور کامیاب ہوگا اور کوئی نیک بخت اِن کی سیرت وخصلت کا انکار نہیں کرے گا۔ اگر میں کچھ عرصہ اور زندہ رہا اور میری اَجل میں کچھ تاخیر ہے تو یقیناً میں اِن کی حفاظت وحمایت ہی کرتا رہوں گا اور ہر حادثہ وبُرائی کو اِن سے دُور رکھوں گا۔'' حضرت ابوطالب (علیہ السلام) نے یہ وصیّت کی اور اِس جہان سے رخصت ہوگئے۔ (اس وصیّت کا ایک ایک لفظ اُن لوگوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے جنہیں حضرت ابوطالب علیہ السلام کے ایمان میں کوئی شک ہے۔ مؤلف) اور ابنِ اسحٰق سے روایت ہے کہ جب حضرت ابوطالب کا آخری وقت قریب آیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے لبوں کو جنبش دے رہے تھے، اُنہوں نے اپنے کان اُن کے قریب کیے (غور سے سُننے کی کوشش کی) پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا، ''اے بھتیجے! خدا کی قسم! بلاشُبہ میرے بھائی نے وہ کلمہ پڑھا جسے پڑھنے کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اِنہیں فرمارہے تھے۔'' ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''میں نے سُنا ہے۔''[1]

حضرت ابوطالب علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح وثناء میں اشعار بھی کہے، مثلاً:

وَشَقَّ لَهٗ مِنِ اسْمِهٖ لِيُجِلَّهٗ ○ فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَهٰذَا مُحَمَّدٌ ○

(اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام اپنے نام سے مشتق کیا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عزت وبزرگی عطا کرے، پس وہ صاحبِ عرش محمود ہے اور آپ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔)

روایت ہے کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کے عہدِ کفالت میں مکّہ مکرمہ میں قحط پڑا تھا اور لوگ جمع ہوکر استسقاء کے لیے اُن کے گھر گئے۔ وہ گھر سے باہر تشریف لائے، اُن کے ساتھ ایک بچّہ آفتابِ تاباں کی مانند نکلا۔ حضرت ابوطالب علیہ السلام نے اُس فرزندِ جلیل کو پکڑ کر خانہ کعبہ کے ساتھ اُس کی پشت ملادی۔ اُس فرزندِ جلیل نے آسمان کی جانب انگشتِ مبارک سے اشارہ کیا تو ہر طرف سے بادل اُمنڈ آئے اور اِتنا برسے کہ ندی نالے بھر گئے، حالانکہ اس سے پہلے آسمان پر بدلی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ اُس وقت حضرت ابوطالب نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں یہ شعر کہا:

وَاَبْيَضُ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ ○ ثِمَالُ الْيَتَامٰى وَعِصْمَةٌ لِّلْاَرَامِلِ ○

(اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس قدر گورے چہرۂ مبارک والے ہیں کہ جس سے بارش طلب کی جاتی ہے،

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۰۵۲ھ، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۷

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یتیموں کی پناہ گاہ اور بیواؤں وفقیروں کے محافظ ہیں۔)

بروایتے، یہ شعر اُس قصیدے میں سے ہے جسے اُنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں اُس وقت لکھا جب قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اکٹھے ہوئے تھے اور اسلام لانے والوں سے نفرت کرتے تھے۔ محمد ابن اسحاق کا بیان ہے کہ یہ قصیدہ ۸۰ اَسّی سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے، حضرت ابو طالب علیہ السلام نے اِس میں کفّارِ قریش کی عداوت پر ملامت و مذمت کی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی ترغیب دی ہے۔ ابن الیقین کہتے ہیں، ''اُن کا یہ قصیدہ اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت کو بعثت سے پہلے ہی بحیریٰ راہب وغیرہ کے خبر دینے کی بنا پر خوب جانتے تھے۔'' شیخ ابنِ حجر عسقلانی فرماتے ہیں، ''حضرت ابو طالب نے اِس قصیدے کو بعثت کے بعد لکھا، میں نے علی بن حمزہ نصری کی وہ کتاب دیکھی ہے جس میں اُنہوں نے حضرت ابو طالب کے اشعار جمع کر کے دعویٰ کیا ہے کہ وہ مسلمان تھے اور اسلام پر ہی اِس جہان سے گئے۔'' نیز یہ بھی منقول ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا سر جھکا کر سنا کہ وہ کلمہ شہادت پڑھ رہے تھے۔ پھر اُنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اظہارِ مسرت فرمایا۔[1]

حضرت ابو طالب علیہ السلام کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت و اعانت، حمایت و حفاظت، ایثار و محبت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف و مدحت کرنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اور مقام و مرتبے کو کفّار کے سامنے برملا بیان کرنا اور بکثرت نعتیہ اشعار کہنا کثیر روایات میں موجود ہے۔ مزید برآں آپ کے خطبات و تقاریر اور دُعاؤں میں اللہ وحدہٗ لاشریک کے نام کا بکثرت استعمال بھی روایات میں تواتر کے ساتھ ملتا ہے۔ اِس کے باوجود کچھ نام نہاد ''علماء'' کا یہ کہنا کہ حضرت ابو طالب ایمان نہیں لائے تھے اور حالتِ کفر میں اِس جہان سے رخصت ہوئے تھے، یا اُنھوں نے دِل سے تو تصدیق کی مگر زبان سے اقرار نہیں کیا، یا ''رعایت دیتے ہوئے'' بعض کا یہ کہنا کہ صرف وقتِ رحلت کلمہ پڑھا وغیرہ ہمارے نزدیک سراسر غلط اور بغض و عناد پر مبنی بیانات ہیں اور محض تعصب اور عداوت کا شاخسانہ ہیں۔ نہایت سادہ اور سیدھی سی بات ہے جس پر ہم مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں:

(۱) اگر حضرت ابو طالب علیہ السلام ایمان نہیں رکھتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت و حمایت میں کیوں پیش پیش رہے؟ محض ایک بھتیجے کی محبت میں تو ایسا کیا نہیں جا سکتا۔

(۲) حضرت ابو طالب علیہ السلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر کفّار کے ساتھ اتنی بڑی ٹکر لینا کہ ایک طرف تمام مشرکین ہیں اور دوسری طرف تنہا آپ، اور کفر و اسلام کی اس لڑائی میں جس کا دورانیہ دعوتِ ذوالعشیرہ سے

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۴۲ اور ۴۳

شروع ہو کر آپ کی وفات تک پھیلا ہُوا ہے، آپ پہاڑ کی طرح ڈٹے رہے، کہیں بھی آپ کے عزمِ صمیم میں ذرا سی لچک بھی پیدا نہیں ہوئی، تو پھر کس بات کا خوف تھا کہ دِل سے تو ایمان لے آئے مگر زبانی اقرار نہیں کیا؟ میں تو یہ عرض کروں گا کہ ایسے نام نہاد علماء ''زبانی اقرار'' کا رونا روتے ہیں جبکہ حضرت ابو طالب علیہ السلام نے تو قدم قدم پر ''عملی اقرار'' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''عملی اظہار'' کیا ہے اپنے ایمانِ کامل کا۔

(۳) اگر آپ کفر پر تھے تو اپنے کلمات و خطبات اور دُعاؤں میں جا بجا اللہ تعالیٰ کا اسمِ مبارکہ کیوں استعمال کیا، کسی بُت یا غیر اللہ کا نام اپنی زبان پر کیوں نہیں لائے؟

(۴) نبی گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح حضرت خدیجہ طاہرہ علیہا السلام سے حضرت ابو طالب نے ہی پڑھایا[۱] جس کے ابتدائی الفاظ ہیں، ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَنَا مِنْ زَرْعِ اِبْرَاهِیْمَ وَ ذُرِّیَّةِ اِسْمَاعِیْلَ... الخ''[۲] یعنی تمام تعریفیں اُس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں نسلِ ابراہیم (علیہ السلام) اور ذریّتِ اسماعیل (علیہ السلام) سے قرار دیا۔ نکاح کے اِس خطبے میں بھی حضرت ابو طالب علیہ السلام سب سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا کر رہے ہیں پھر اللہ کے انبیاء ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی نسل اور ذریت میں سے ہونے پر فخر کر رہے ہیں اور آخر میں اللہ کے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح پڑھا رہے ہیں۔ کیا کسی کافر سے ان کلمات کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ کوئی بھی عام مسلمان اپنا نکاح کسی کافر سے نہیں پڑھاتا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح کوئی غیر مسلم یا مشرک کیسے پڑھا سکتا ہے؟

(۵) بعض کہتے ہیں کہ قریش نے آپ سے کہا کہ کیا آپ اپنے باپ دادا کے دِین سے منحرف ہو گئے ہیں؟ تو آپ نے کہا، ''نہیں، میں عبد المطلب کے دِین پر قائم ہوں۔'' دینِ عبد المطلب کیا تھا؟ کیا حضرت عبد المطلب دینِ حق پر نہیں تھے (معاذ اللہ)؟ جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد، دادیاں، نانیاں، آدم علیہ السلام سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین تک، سب کے سب مسلمان تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور کبھی کسی مشرک مرد و زن کے صلب و رِحم میں قرار نہیں پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجداد و جدّات کے دِین میں کسی قسم کا شُبہ نہیں ہے۔ خاصہ و عامہ کے طریق سے متواتر احادیث اِس پر دلالت کرتی ہیں اور اِن احادیثِ متواترہ سے ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[۱] مولانا شبلی نعمانی (متوفی: ۱۹۱۴ء، لکھنؤ) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۱۱۸

[۲] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۵۱

احمد بن ابی یعقوب ابنِ واضح الیعقوبی (متوفی: ۸۹۷ء، مصر) تاریخ یعقوبی، ج ۲ ص ۱۶

کے آباؤ اجداد تمام کے تمام انبیاء، اوصیا اور حاملانِ دینِ خُدا رہے ہیں۔ [1]

علمائے کرام کا بیان ہے کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام پر شرک کی تہمت لگانے کا سبب محض بغضِ علی علیہ السلام تھا اور علی علیہ السلام سے بغض کی وجہ تاریخ کا ہر طالب علم بخوبی جانتا ہے۔ پس، حضرت ابوطالب علیہ السلام کا قصور یہ تھا کہ وہ علی علیہ السلام کے والد تھے۔ حضرت خدیجۃُ الکبریٰ علیہا السلام پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے شادی شدہ اور صاحبِ اولاد ہونے کی تہمت بھی اسی طرح سے تھی۔ اُن کا قصور یہ تھا کہ وہ حضرت فاطمہ علیہا السلام کی والدہ تھیں۔

حضرت ابوطالب علیہ السلام کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قریش کی دست درازیاں

حضرت ابوطالب علیہ السلام کے انتقال کے بعد قریش نے جب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی مضبوط حامی اور مددگار نہیں رہا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دستِ ظلم و تعدی دراز کر دیا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساحر و مجنوں کہہ کر پکارتے، گالیاں بکتے، مذاق اُڑاتے، جسمِ اطہر پر غلاظت پھینکتے، راہ میں کانٹے بچھاتے اور ہر طرح کی ذہنی و جسمانی کوفت پہنچاتے۔ اُن کی ایذا رسانی اس قدر بڑھ گئی کہ بروایتِ ''تاریخ خمیس'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ جب ابوطالب (علیہ السلام) وفات پا گئے تو قریش نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اتنی تکالیف دیں کہ حضرت ابوطالب (علیہ السلام) کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ستانے کی جو ہوس اُن کے دلوں میں تھی، جاتی رہی۔ [2]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○



---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۶۶

[2] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۳۵
عبدالملک ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ، ج ۲ ص ۴۶

ہجرتِ مدینہ

(۱۴ بعثت/ ۶۲۲ء)

حضرت علی علیہ السلام بسترِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر

قریش کا ظلم نا قابلِ برداشت ہونے لگا تو سنہ ۱۴ بعثت بمطابق ۶۲۲ عیسوی میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر مسلمان خفیہ طور پر مدینہ طیّبہ چلے گئے۔ بروایتے سب مسلمان ہجرت کر گئے یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام اور حضرت ابوبکر کے سوا کوئی باقی نہ رہا۔ مدینہ طیّبہ میں اسلام پھیل رہا تھا، قریش کو خبر ہوئی تو وہ ایک کاری ضرب لگانے کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے قصی بن کلاب کے گھر ''دارالندوہ'' میں جمع ہوئے۔ کسی نے کہا کہ ابھی کچھ دن اور انتظار کرلو۔ ایک کافر بولا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قید کردو۔ دوسرے نے کہا کہ یہیں قتل کردو تا کہ اُن کے ساتھ اُن کا دِین بھی ختم ہو جائے۔ تیسرے نے رائے دی کہ اُنھیں جلا وطن کردو۔ [۱] پس سورۃ انفال میں ارشادِ الٰہی ہوتا ہے: [۲]

''وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰''

(اے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اُس وقت کو یاد کیجیے جب کفّار آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں خفیہ طور پر منصوبہ بنا رہے تھے کہ یا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قید کردیں یا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کردیں یا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نکال دیں۔ وہ بھی خفیہ باتیں کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ بھی اُن کے مکر کا بدلہ دینے میں تدبیر فرما رہا تھا اور اللہ تعالیٰ مکاروں کو بہترین سزا دینے والا ہے۔)

اَبُوجَہل نے مشورہ دیا کہ پانچوں قبیلوں کے لوگ مل کر بیک وقت قاتلانہ حملہ کریں تا کہ کسی ایک پر قتل کا الزام نہ آئے اور بنی ہاشم ان متفرق قبیلوں سے قصاص یا انتقام لینے میں عاجز رہ جائیں۔ نجدی نے تمام آراء کو کمزور قرار دیا اور اَبُوجَہل کے مشورے کو پسند کیا، باقی لوگ بھی اُس بدبخت کی رائے پر متفق ہو گئے چنانچہ سب نے مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ [۳]

---

[۱] مولانا سید ظفر حسن، کتاب مستطاب مجمع الفضائل (ترجمہ: مناقب علامہ ابن شہر آشوب) ج ۱ ص ۸۸

[۲] سورۃ انفعال، آیت نمبر ۳۰

[۳] مولانا سید ظفر حسن، کتاب مستطاب مجمع الفضائل (ترجمہ: مناقب علامہ ابن شہر آشوب) ج ۱ ص ۸۸

وہ جمعرات، یکم ربیع الاوّل سنہ ۱۴ بعثت کا دِن تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بارگاہِ الٰہی سے مکّہ چھوڑ کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ہُوا۔ حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے [1] کہ وہ حکم اِس آیتِ کریمہ میں ہے: [2] وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾ (اور کہیے، پروردگار! تُو مجھے (ہر مرحلہ میں) سچائی کے ساتھ داخل فرما اور سچائی کے ساتھ نکال اور اپنے ہاں سے مجھے ایک قوت عطا فرما جو مددگار ثابت ہو۔) مدارج النبوّت میں ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے حاضر ہوکر یہ حکمِ الٰہی سنایا: [3] ''اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكَ بِالْهِجْرَةِ ○'' یعنی اللہ تعالیٰ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہجرت کا حکم فرماتا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے یہ بھی عرض کی کہ آج رات آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہاں نہ سوئیں جہاں سویا کرتے ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا، ''خدا نے وحی کی ہے کہ میں رات کو ہجرت کر کے غارِ ثور کی طرف جاؤں اور آپ کو اپنی جگہ پر سلا جاؤں تا کہ دشمنوں کو آپ پر میرا گمان ہو۔'' حضرت علی علیہ السلام نے پوچھا، ''حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا میرے سونے سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان بچ جائے گی؟'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''ہاں۔'' یہ سُن کر حضرت علی علیہ السلام مسکرائے اور سجدۂ شکر ادا کیا۔ (بروایتے، اسلام میں سب سے پہلا سجدۂ شکر یہی تھا جو حضرت علی علیہ السلام نے ادا کیا) پھر سجدے سے سر اُٹھا کر عرض کی، ''یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میری آنکھیں، میرے کان، میرا دِل آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر فدا ہوں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اطمینان سے تشریف لے جایئے۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے علی! تم میری چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو جاؤ اور آگاہ رہنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کا امتحان دِین میں اُن کے ایمان کی مناسبت سے لیتا ہے، خدا نے تیرا اور میرا امتحان اس طرح لیا ہے جس طرح ابراہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) کا لیا تھا۔ پس صبر کرو، صبر سے خدا کی رَحمت احسان کرنے والوں سے قریب ہو جاتی ہے۔'' پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو اپنے سینے سے لگایا اور روانہ ہو گئے۔ [4] مروی ہے کہ اُس وقت قریش کے لوگ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رَحمت کدے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور اپنی مذموم کاروائی کے لیے رات گہری ہونے کے

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۸۳

[2] سورۃ الاسراء، آیت نمبر ۸۰

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۸۳

[4] مولانا سید ظفر حسن، کتاب مستطاب مجمع الفضائل (ترجمہ: مناقب علامہ ابن شہر آشوب) ج ۱ ص ۸۸

انتظار میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مُشتِ خاک اُن کے سروں پر پھینکی اور گذرتے چلے گئے۔ قدرت نے اُس خاک کے ذریعے کافروں کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے سامنے سے گذرے لیکن وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ نہ سکے۔ [1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر سے نکلتے ہوئے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرما رہے تھے: [2]

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۹

(اور ہم نے ایک دیوار اُن کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار اُن کے پیچھے کھڑی کر دی ہے (اس طرح) ہم نے اُنہیں ڈھانپ دیا ہے پس وہ کچھ دیکھ نہیں سکتے۔)

''مدارج النبوّت'' میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ (علیہ السلام)' وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق و محبت میں اپنی جان کو فدا کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہونے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ [3] اہلِ سیَر کہتے ہیں کہ قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت مبارکہ اِسی ضمن میں نازل ہوئی ہے۔ [4]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷

(اور انسانوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال دیتے ہیں اور اللہ (ایسے جاں نثار) بندوں پر بہت شفیق و مہربان ہے۔)

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں، ''یہ سخت خطرے کا موقع تھا، جناب علی علیہ السلام کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بسترِ خواب، قتل گاہ کی زمین ہے لیکن فاتحِ خیبر کے لیے قتل گاہ، فرشِ گُل تھا۔'' [5] پس دشمن خانۂ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہوئے تو بسترِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر علی علیہ السلام کو سوتا ہُوا پایا۔ پوچھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہاں ہیں؟ علی علیہ السلام نے جواب دیا کہ جہاں ہیں خدا کی اَمان میں ہیں۔ طبری نے لکھا ہے کہ علی علیہ السلام تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور سب بھاگ گئے۔ ''احیاء العلوم غزالی'' کے مطابق علی علیہ السلام کی حفاظت کے لیے خدا

---

[1] مولانا سید ظفر حسن، کتاب مستطاب مجمع الفضائل (ترجمہ: مناقب علامہ ابن شہر آشوب) ج ا ص ۸۸

[2] سورۃ یٰسین، آیت ۹

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۸۳

[4] سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۰۷

[5] مولانا شبلی نعمانی (متوفی: ۱۹۱۴ء، لکھنؤ) سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ا ص ۱۶۲

نے جبرائیل اور میکائیل (علیہما السلام) کو بھیج دیا تھا اور یہ دونوں مقرب فرشتے ساری رات علی علیہ السلام کی خواب گاہ کا پہرہ دیتے رہے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ شبِ ہجرت مجھے جیسی نیند آئی، ایسی نیند ساری عمر نہ آئی۔ [1]

مؤرّخین نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علی علیہ السلام کو پیچھے چھوڑ کر جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کفّارِ قریش کی کچھ امانتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس رکھی ہوئی تھیں جنہیں لوٹانا تھا۔ واضح ہو کہ باوجود تمام تر کینہ وعداوت کے، بنوقریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''صادق'' اور ''امین''، یعنی سچا اور امانتدار کہا کرتے تھے اور اپنی امانتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس رکھا کرتے تھے۔ [2]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جاں نثار بھائی اور رفیقِ خاص حضرت علی علیہ السلام کو اپنی جگہ اپنے بستر پر سُلا کر، اور قریش کی امانتیں واپس کرنے کا فریضہ سونپ کر مکّہ میں ہی چھوڑ آئے تھے ورنہ ہجرت کے اس اہم اور نازک موقع پر یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ علی علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہ ہوتے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبا پہنچ کر علی علیہ السلام کی کمی شدت سے محسوس کرنے لگے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خط روانہ کیا کہ جلد از جلد میرے پاس آجائیں۔ یہ خط ابوواقد لبنی لے کر گئے تھے، اُن کے ہمراہ حضرت ایمنؓ بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط ملتے ہی حضرت علی علیہ السلام امانتوں کی ادائیگی سے سبکدوش ہوئے اور بنی ہاشم کی مستورات ،جن میں آپ کی والدہ جناب فاطمہ بنت اسد علیہا السلام، حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام اور فاطمہؓ بنت زبیر بن عبدالمطلب بھی تھیں اور اُن لوگوں کو جو کسی سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہیں جا سکے تھے، ہمراہ لے کر چل پڑے۔ عورتیں اور بچّے اُونٹوں پر سوار تھے جب کہ حضرت علی علیہ السلام خود پیادہ تھے۔ [3]

روایت ہے کہ علی علیہ السلام مستورات کو لے کر جب مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو قریش اُنھیں روکنے اور اپنی ذلت کا بدلہ لینے اُن کے پیچھے روانہ ہوئے اور مکہ سے پچیس میل کے فاصلے پر کوہِ ضجنان کے قریب مزاحم ہوگئے۔ علی علیہ السلام نے خواتین کے ناقے دامنِ کوہ میں ٹھہرائے اور اُن کے سامنے آکر اُنھیں سمجھانے بجھانے لگے۔ حرب بن اُمیہ کا غلام جناح آپ علیہ السلام کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے

---

[1] نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۴ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۶۲ بحوالہ طبری، احیاء العلوم غزالی

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۸۳

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۹۴
علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان)، حیاۃ القلوب، ج ۲ ص ۵۰۰ تا ۵۱۵

تلوار کھینچ کر وار کیا، حضرت علیہ السلام کے تیور بدل گئے اور تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھے۔ جناح نے حملہ کیا لیکن یکا یک ایک بجلی کوندی اور علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی تلوار اُسے دولخت کر گئی۔ اُس کے ساتھیوں نے وہ بھیانک منظر دیکھا تو خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ حضرت نے وہ رات وہیں بسر کی اور بوقتِ سحر مدینہ کی طرف عازم سفر ہو گئے۔ [1]

آپ قبا پہنچے تو سنگلاخ راستوں پر پیدل چلنے کی وجہ سے آپ کے پاؤں زخمی ہو چکے تھے اور اُن پر ورم آ گیا تھا۔ بقول ابنِ اثیر، ''علی علیہ السلام کے پیروں سے خون جاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا تو فرطِ محبت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے پاؤں پر اپنا لعابِ دہن لگایا جس سے وہ اچھے ہو گئے۔'' [2]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''سیّدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ نے تین دن کے فرق سے مکّہ مکرمہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسرت و شادمانی میں اضافہ فرمایا۔ منقول ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ مکّہ مکرمہ سے پاپیادہ سفر کرتے ہوئے آئے تھے۔ پیدل چلنے کی وجہ سے اُن کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھالوں پر دستِ مبارک پھیرا تو وہ اُسی وقت ٹھیک ہو گئے۔ یہ حقیقت اُس کیفیت کی مانند ہے جو روزِ خیبر پیش آئی تھی کہ علی علیہ السلام کی آنکھوں میں آشوب آ گیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لعابِ دہن لگانے سے وہ اُسی وقت ٹھیک ہو گئی تھیں۔''

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○



---

[1] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۹۱

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۹۴ بحوالہ: روضۃ الاحباب
علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان)، حیاۃ القلوب، ج ۲ ص ۵۰۰ تا ۵۱۵
مولانا سید ظفر حسن، کتاب مستطاب مجمع الفضائل (ترجمہ: مناقب علامہ ابن شہر آشوب)
آیت اللہ جعفر سبحانی (متولد: ۱۹۲۹ء، تبریز) دی میسیج (The Message)

مدینہ طیبہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ناقے پر سوار مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو حضرت علی علیہ السلام بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ مدینہ منوّرہ میں مقیم ہوتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں زمین خریدی اور مسجد بنانے کا حکم دیا۔ اس مسجد کی تعمیر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر برابر کام کیا۔ صحابہؓ عرض کرتے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہمارے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکلیف نہ فرمائیں، اس کارِ خیر کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار جو ہیں۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جاں نثاروں کے شانہ بشانہ محنت ومشقت کرکے، مِل جُل کر کام کرنے کا عملی درس دیتے رہے۔ روایت ہے کہ باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایک اینٹ لاتے تو حضرت عمار یاسر رضی اللہ عنہ دو دو اُٹھا کر لاتے اور کہتے کہ ایک اینٹ میری طرف سے اور ایک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے ہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دوسروں کو ایک اجر ہے اور عمار کو دوگنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمار یاسر رضی اللہ عنہ کو بشارت دی کہ آخری عمر میں تمہاری غذا دُودھ ہوگی اور تمہیں باغی لوگ شہید کریں گے۔ تم اُن باغیوں کو جنّت کی طرف بلاؤ گے اور وہ تمہیں دوزخ کی طرف۔ [1]

مسجد نبوی میں گھر

روایت ہے کہ مسجد کی تعمیر کے بعد مسجد کے گرد کچھ مکانات تعمیر کیے گئے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اہل بیت اطہار علیہم السلام اور مہاجرین کے لیے تھے۔ سب گھروں کے دروازے مسجد کے صحن میں کھلتے تھے اس لئے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر سیدھے مسجد میں آنے لگے۔ تب جبرائیل علیہ السلام فرمانِ الٰہی لے کر نازل ہوئے کہ جن لوگوں نے مسجد میں دروازے قائم کیے ہیں اُن کو حکم دیجئے کہ وہ اُنہیں بند کر دیں، کسی کا دروازہ مسجد میں نہ ہو سوائے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور علی مرتضیٰ (علیہ السلام) کے کیونکہ علی (علیہ السلام) کے لیے وہ حلال ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لئے حلال ہے۔ صحابہ کرامؓ اس حکم پر کبیدہ خاطر ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا دروازہ بھی مسجد میں کھلتا تھا، وہ بھی افسردہ ہوئے کہ میرے بھتیجے علی (علیہ السلام) کا دروازہ تو اپنی جگہ قائم ہے مگر میرا بند کیا جا رہا ہے۔ اِس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ چچا جان! آپ رنجیدہ نہ ہوں، میں نے یہ اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ یہ سُن کر جناب حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں خدا اور رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لئے اس پر راضی ہوں۔ چنانچہ مسجد میں کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیئے گئے سوائے

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۰۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دروازوں کے۔[1] ترمذی میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ علی علیہ السلام کے دروازے کے علاوہ تمام دروازے بند کر دیے جائیں۔[2] لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو رسول اللہ نے فرمایا، ''میں نے تمہارے دروازوں کو بند نہیں کیا اور نہ ہی میں نے علی (علیہ السلام) کے دروازے کو کھلا رہنے دیا ہے بلکہ اللہ نے تمہارے دروازوں کو بند کیا اور علی (علیہ السلام) کے دروازے کو کھلا رہنے دیا ہے۔[3] تمام دروازوں کو بند کرنے اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ولی اللہ علیہ السلام کے دروازے کھلے رکھنے کی وجہ مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ لوگ حالتِ جنابت میں مسجد میں نہ آسکیں۔ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام طیب و طاہر تھے اور ظاہری اور باطنی نجاستوں سے پاک تھے اس لئے انھیں کسی بھی حالت میں مسجد میں آنے جانے یا ٹھہرنے کی ممانعت نہیں تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے علی! اس مسجد میں میرے اور تمہارے علاوہ کسی کے لئے حالتِ جنابت میں ہونا جائز نہیں۔''[4] بالکل یہی صورت حال نبیِ خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے بھائی اور وصی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی تھی۔ پس، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ ایک پاک و پاکیزہ مسجد تعمیر کریں اور اُس میں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور سکونت اختیار نہ کرے اور مجھے بھی اللہ نے حکم دیا کہ میں ایک پاکیزہ مسجد تعمیر کروں جس میں میرے اور علی (علیہ السلام) اور ان کے دونوں بیٹوں کے علاوہ کوئی اور رہائش نہ رکھے۔[5]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○



---

[1] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۵۲۲

[2] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۲۰۸
ابوعیسیٰ محمد ترمذی (متوفی: ۲۷۹ ہجری، ترمذ) جامع ترمذی، ج ۲ ص ۲۱۴

[3] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۲۰۸
احمد بن شعیب نسائی (متوفی: ۳۰۳ ہجری، مکہ) خصائص نسائی، ص ۳۷
محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (متوفی: ۱۰۱۴ء، نیشاپور) مستدرک حاکم، ج ۳ ص ۱۱۷

[4] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۲۱۱
ولی الدین خطیب تبریزی (متوفی: ۷۴۰ ہجری، بغداد) مشکوۃ المصابیح، ص ۵۶۴

[5] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۲۱۱
جلال الدین سیوطی (متوفی: ۱۵۰۵ء، قاہرہ) خصائص سیوطی، ص ۲۴۳

مواخات

(۱ ہجری/ ۶۲۲ء)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنہ اوّل ہجری میں مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات یعنی بھائی چارے کا تعلق قائم فرمایا۔ خود غرضی اور عصبیّت کے اُس دَور میں جب انسان کی ہر سوچ کا محور اُس کی اپنی ذات ہُوا کرتی تھی اور اپنی خواہشات اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مواخات کے ذریعے تاریخ انسانی کا ایک درخشندہ باب رقم کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے معاشرے کی سوچ کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور وہ لوگ جو کبھی دوسروں کا مال وزر اور عزت وآبرو چھیننے کے لیے خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، دائرۂ اسلام میں داخل ہونے اور پھر رشتۂ مواخات سے منسلک ہونے کے بعد اپنا مال وزر بخوشی اپنے بھائی کے ساتھ تقسیم کرنے پر تیار ہو گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر مہاجر اور انصار کے درمیان مواخات قائم فرمائی چنانچہ یہ رشتہ قائم ہونے کے بعد ہر انصاری اپنے مہاجر بھائی کو اپنے گھر لے گیا اور اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائداد کا نصف اُس کی ملکیت میں دے دیا اور دونوں سگے بھائیوں کی طرح مِل جُل کر رہنے لگے۔

روایت ہے کہ مواخات کا واقعہ ہجرت کے پانچ یا آٹھ ماہ کے بعد پیش آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پچاس مہاجرین اور انصار میں باہمی مواخات قائم فرمائی۔ حضرت سلمان کو حضرت ابودردا کا بھائی بنایا، حضرت ابوذر کو منذر بن عمیر کا، حضرت عمار یاسر کو حضرت حذیفہ یمانی کا، حضرت مصعب بن عمیر کو حضرت ابوایوب انصاری کا، حضرت زبیر بن عوام کو حضرت سلامہ بن وقش کا، حضرت ابوعبیدہ جراح کو حضرت سعد بن معاذ کا، حضرت عثمان کو حضرت اوس بن ثابت کا، حضرت عمر کو حضرت عتبان بن مالک کا اور حضرت ابوبکر کو حضرت خارجہ بن زید کا بھائی بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام اور اپنے لیے کسی انصاری کا انتخاب نہیں کیا۔ [1]

مدارجُ النبوّت میں ''روضۃُ الاحباب'' کے حوالے سے شیخ ابنِ حجر سے روایت ہے کہ جب عقد مواخات باندھا گیا (اور صحابہ کرامؓ میں سے ہر ایک کو دوسرے کا بھائی قرار دیا لیکن علی علیہ السلام کو چھوڑ دیا)

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۱۵۰

تو حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام نے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کے درمیان تو برادری کا رشتہ باندھ دیا لیکن مجھے تنہا چھوڑ دیا؟ میرا بھائی کون ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا بھائی میں ہوں، ''اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ○'' (تم دُنیا اور آخرت میں میرے بھائی ہو۔)[1]

اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکّہ میں بھی ایسا کر چکے تھے۔ بحوالہ تاریخ خمیس اور ریاض النصرہ، مکّہ میں حضرت ابوبکر کو حضرت عمر کا، طلحہ کو زبیر کا، حضرت عثمان کو عبدالرحمٰن کا، حضرت حمزہ کو ابن حارثہ کا اور حضرت علی علیہ السلام کو خود اپنا بھائی بنایا تھا۔ علامہ شبلی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتحادِ مذاق، طبیعت اور فطرت کے لحاظ سے ایک دوسرے کو باہم بھائی بنایا تھا اور مذاقِ نبوّت کا اتحاد فطرتِ امامت ہی سے ہوسکتا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر مرتبہ اپنا بھائی حضرت علی علیہ السلام ہی کو مُنتخب فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کرتے تھے، ''اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ○'' یعنی تم دُنیا اور اور آخرت (دونوں) میں میرے بھائی ہو۔[2]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ○



[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۴

[2] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۶۴ بحوالہ: علامہ شبلی، تاریخ خمیس و ریاض النصرہ

غزوۂ بدر

(۱۷ یا ۱۹ رمضان المبارک/ ۱۳ یا ۱۵ مارچ ۶۲۴ء)

یہ غزوہ، بدر کے مقام پر ہجرتِ نبوی کے اُنیس ماہ بعد ۱۷ یا ۱۹ رمضان المبارک بمطابق ۱۳ یا ۱۵ مارچ سنہ ۶۲۴ء کو [۱] اور ایک قول کے مطابق ۱۲ تا ۱۷ رمضان المبارک بمطابق ۸ مارچ تا ۱۳ مارچ سنہ ۶۲۴ء کو وقوع پزیر ہُوا۔ [۲]

پس منظر:

غزواتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے یہ غزوہ بہت اہم اور عظیم تھا کیوں کہ اس میں پہلی مرتبہ باقاعدہ اور منظم طریقے سے کفّار کی فوج اور چند مسلمان مجاہدین، جنگ کے لئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے صف آرا ہو رہے تھے۔ کفّار عرصۂ دراز سے اس جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اُنہوں نے اپنے سارے وسائل اس میں جھونک دیئے تھے اور وہ مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لئے پوری طرح کمر بستہ تھے۔ یہ جنگ مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی اور تحریکِ اسلام کے استیصال کا سبب بھی بن سکتی تھی اس لئے اس میں فتح یاب ہونا ازبس ضروری تھا۔ چنانچہ گھمسان کا رَن پڑا اور ربُّ الافواج نے اپنے جسمانی طور پر کمزور اور ایمانی طور پر مضبوط بندوں کو طاقتور مشرکوں پر فتح و نصرت عطا فرمائی، عزت و بزرگی سے سرفراز کیا اور فرمایا:

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ [۳]

(بے شک بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا حالانکہ تم (اُس وقت) بہت کمزور تھے۔)

مسلمان اگرچہ مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے لیکن کفّارِ مکّہ ابھی تک اُنہیں اپنا مجرم سمجھتے ہوئے اُن کے تعاقب میں تھے۔ وہ اس تاک میں تھے کہ کب موقع ملے تو مسلمانوں پر ایک کاری ضرب لگائیں، ایسی ضرب جس سے مسلمان اور اُن کا دِین دونوں نابود ہو جائیں۔ اس مقصد کے لئے اُنہوں نے متحد ہو کر ایک بہت بڑی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور جنگ کے لئے اسلحہ اور دیگر ساز و سامان حاصل کرنے کے لئے کثیر سرمایہ بھی جمع کیا۔ مؤرّخین لکھتے ہیں تمام کافروں نے سرمایہ جمع کرنے کی مہم میں

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۱۷۲
سید محسن امین عاملی (متوفی: ۱۳۷۱ ہجری، دمشق) اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۱۵۲

[۲] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۶۱

[۳] سورۃ آل عمران، آیت ۱۲۳

بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا حتیٰ کہ خواتین نے اپنے طلائی زیورات تک جنگ کے فنڈ میں جمع کرا دیئے۔ جمع شدہ مال میں خوب اضافہ کرنے کی خاطر اُسے تجارت میں لگانے کا منصوبہ بنایا گیا چنانچہ ابوسفیان اُس جمع شدہ مال سے تیار کیا گیا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ لے کر شام روانہ ہُوا۔ مؤرّخین کے اندازے کے مطابق قافلے میں پچاس ہزار سُرخ دینار (سونے کی اشرفیاں) کی مالیّت کا تجارتی سامان تھا۔ اتنی بڑی مالیّت کے تجارتی سامان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ابوسفیان خوفزدہ تھا کہ کہیں کوئی واردات نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ پھونک پھونک کر آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اِس وہم میں مبتلا ہو گیا کہ مسلمان اُس کی جاسوسی کر رہے ہیں اور کسی وقت بھی قافلے پر حملہ آور ہو سکتے ہیں، پس وہ ساحلی راستے سے مکّہ کی طرف روانہ ہو گیا اور ایک تیز رفتار سوار جس کا نام ضمضم بن عمرو غفاری تھا مکّہ روانہ کر دیا تا کہ وہ مکّہ والوں کو مسلمانوں کے ممکنہ حملے کی خبر کرے اور وہاں سے قافلے کی حفاظت کے لئے کمک روانہ کرے۔ ضمضم نے مکّہ پہنچ کر کفّارِ قریش کو ابوسفیان کا پیغام خوب بڑھا چڑھا کر سنایا۔ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ ابوسفیان کے ایلچی نے مکّہ والوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں قافلے کی متوقع غارت گری کی خبر اس انداز میں دی کہ مکّہ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور قریش غضبناک ہو کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ (میرے خیال میں یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ قریش تو پہلے ہی مسلمانوں کے ساتھ ایک بڑی جنگ کے لئے کمر بستہ تھے، ابوسفیان کا بلاوا آیا تو فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مؤلف)

اکثر محققین لکھتے ہیں کہ قریش کا لشکر قافلے کے مکّہ پہنچنے سے پہلے ہی بدر کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ ایک طرف سے قافلہ آ رہا تھا اور دوسری طرف سے قریش کی فوج پیش قدمی کر رہی تھی، جس کی روانگی مسلمانوں کی طرف سے کسی حملے کے امکان پر مبنی نہ تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو جنگ کے لئے روانگی کا حکم فوجِ کفّار کے مدینہ کے قریب پہنچ جانے کے بعد ہُوا۔[1]

اس کی تاویل قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ سے کی جاتی ہے:[2]

''اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ''

(جس وقت تم قریب کے ناکہ پر تھے اور وہ دُور کے ناکہ پر اور قافلہ تم سے ادھر نیچے تھا۔)

مشرکین کے لشکر میں ایک ہزار نو سو پچاس (۱۹۵۰) اور بقولے ایک ہزار (۱۰۰۰) جنگجو تھے۔[3] تین

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، حصّہ دوم ص ۱۷۶

[2] سورۃ الانفال، آیت ۴۲

[3] مسٹر کے اے حمید، مسلمانانِ عالم، حصّہ اوّل ص ۴۷

ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۲۸

سو (۳۰۰) گھوڑے اور سات سو (۷۰۰) اُونٹ تھے جو مکمل ساز وسامان سے آراستہ تھے۔[۱] سوار اور پیادہ سبھی زِرّہ پوش تھے۔ اُن کے ہمراہ گانے والی عورتیں اور آلاتِ موسیقی بھی تھے۔ دورانِ سفر وہ جہاں ٹھہرتے، عورتیں گانا بجانا شروع کر دیتیں اور اپنے گیتوں کے ذریعے اہلِ اسلام پر زبانِ طعن دراز کرتیں۔ قریش کے سرداروں میں سے کوئی نہ کوئی سب کے لئے کھانا تیار کرواتا جس میں روزانہ دس اُونٹ ذبح کیے جاتے تھے۔[۲]

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابولبابہ انصاری کو مدینہ میں عامل مقرر کیا اور مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ لشکرِ قریش کی سرکوبی کے لئے بدر کی طرف روانہ ہوئے۔[۳] یہ ۸ مارچ ۶۲۴ء یعنی ہجرت کا اُنیسواں مہینہ اور رمضان المبارک کی ۸ یا ۱۲ تاریخ تھی۔ بروایتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرو بن اُمّ کلثوم کو مدینہ کا عامل مقرر فرمایا تھا لیکن روحاء کے مقام پر پہنچ کر حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذر کو قائم مقام حاکم بنا کر واپس بھیج دیا۔[۴]

اسلامی لشکر کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی۔ بقول ابنِ عباسؓ ان میں ستتر (۷۷) مہاجرین اور دو سو چھتیس (۲۳۶) انصار تھے۔[۵] تمام مسلمان روزے سے تھے۔ بروایتے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ صرف تین سو پانچ (۳۰۵) اصحاب تھے جن میں سے اسّی (۸۰) مہاجرین اور دو سو پچیس (۲۲۵) انصار تھے۔ باقی آٹھ (۸) اصحاب وہ تھے جو کسی عذر کی وجہ سے نہیں آئے تھے اور چونکہ اموالِ غنیمت میں سے اُن کو بھی حصّہ عطا کیا گیا تھا چنانچہ اہلِ سیر اُن کو بھی اہلِ بدر میں شمار کرتے ہیں، اُن میں سے تین (۳) مہاجرین تھے جن میں سے ایک حضرت عثمان بن عفان تھے، دوسرے طلحہ اور تیسرے سعید بن زید اور باقی پانچ (۵) انصار تھے۔[۶]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[۱] مسٹر کے اے حمید، مسلمانانِ عالم، حصّہ اوّل ص ۴۷

[۲] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۰

[۳] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۸

[۴] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۶۳

[۵] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۲

[۶] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۹

حضرت علی علیہ السلام کی علم برداری

اعلانِ بعثت کے وقت حضرت علی علیہ السلام کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس کے بعد تیرہ سال جو مکّہ میں گذرے وہ تمام زحمتوں، مشقتوں اور قریش کی سازشوں کا سامنا کرتے ہوئے بسر ہوئے جن میں جنگ کی نوبت کبھی نہیں آئی جو آپ تیغ آزمائی کرتے۔ جنگِ بدر اس لحاظ سے پہلا موقع تھا اور یہ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ انتخاب تھی جو علی بن ابی طالب علیہ السلام کی صلاحیتوں کو بغیر کسی آزمائش کے خوب دیکھ رہی تھی جبھی جناب حمزہ رضی اللہ عنہ جیسے مردِ میدان کے موجود ہونے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین کا علم جناب علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کے سپرد کیا جبکہ انصار کا علم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو دیا۔ [1] بروایتے اس غزوے میں لشکرِ اسلام کے تین علم تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیسرا علم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو دیا جس کا رنگ سفید تھا۔ [2]

معرکہ حق و باطل:

یہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ ہجری یعنی ۱۳ مارچ ۶۲۴ء کا دن تھا۔ عرب کے رواج کے مطابق سب سے پہلے دُو بدو لڑائی کا آغاز ہُوا۔ لشکرِ کفّار کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ، اُس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور بیٹا ولید بن عتبہ میدان میں آئے اور مُبارزت طلب کی۔ اُن کے مقابلے کیلئے تین انصار میدان میں اُترے، عوف بن حارثؓ، معاذ بن حارثؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ [3] یا بروایتے معاذ بن عفراءؓ، معوذ بن عفراءؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ۔ [4] کافروں نے کہا تم انصاری ہو تمہارے ساتھ ہمیں کوئی سروکار نہیں، ہم تو اپنے چچاؤں کے بیٹوں (قریشیوں) کو بلاتے ہیں۔ پھر اُن میں سے ایک نے آواز لگائی، اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہماری قوم میں سے ہمارے ہم پلہ لوگ بھیجو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام، حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ جاؤ ان کا مقابلہ کرو۔ مؤرّخ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۲

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۲

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۵

[4] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص ۱۷۴

''یَا عَلی قُم، یَا حَمزۃ قُم، یَا عبیدۃ بِن الحارث قُم'' (اے علی! اُٹھیے، اے حمزہ! اُٹھیے، اے عبیدہ بن حارث! اُٹھیے)۔ [1] حیدرِ کرار علی ابن ابی طالب علیہ السلام حکم کے منتظر تھے، میدان میں ایسے کود پڑے جیسے شیر اپنے شکار کی طرف جست لگاتا ہے۔ اُن کے ساتھ ہی حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور جناب عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ بھی لپکے۔ یہ تینوں مردانِ حق میدان میں آئے تو کافروں نے کہا کہ ہاں! یہ ہماری ٹکر کے ہیں۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ اسّی سالہ ضعیف آدمی تھے، وہ عتبہ کے مقابلے پر آئے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جو اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عمر تھے، شیبہ سے ٹکرائے۔ ایک روایت میں اس کے برعکس یوں آیا ہے کہ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ شیبہ کے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ عتبہ کے مقابل آئے۔ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نوجوان تھے، آپ نے قریش کے جوان ولید بن عتبہ کو واصل جہنم کیا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اپنے مقابل کو ہلاک کیا لیکن حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے حریف کے درمیان مقابلہ ہوتا رہا، پھر ایک ضرب اُن کے زانو پر پڑی اور وہ شدید زخمی ہو گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی علیہ السلام اُن کی نصرت کے لئے پہنچے اور دشمن کو قتل کرنے میں اُن کی مدد کی۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ بہت زخمی تھے اُن کی پنڈلیوں سے خون اور گودہ بہہ رہا تھا، اُنہیں اُٹھا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اُنہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا میں شہید نہیں ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! تم شہید ہو۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا یہ سوال اس بنا پر تھا کہ وہ زخمی حالت میں میدانِ جنگ سے زندہ لوٹے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ شہادت میں ابھی کچھ دیر ہے، اس لئے پریشان تھے کہ میدانِ جنگ سے باہر موت آجانے پر کہیں شہادت کے درجہ پر فائز ہونے سے رہ نہ جائیں۔ مذکور ہے کہ اُن کا انتقال بدر سے واپسی پر وادیٔ صفراء یا وادیٔ روحا میں ہُوا اور اُنہیں وہیں دفن کیا گیا۔ دست بدست لڑائی کے بعد قریش کی طرف سے عام حملہ شروع ہُوا، مسلمان بھی سر پر کفن باندھ کر میدانِ جنگ میں اُترے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قلیل لشکرِ اسلام اور کثیر لشکرِ کفّار کے باہم ٹکرانے کا مشاہدہ فرمایا تو بارگاہِ الٰہی میں عرض کی، ''یا ربّ! جو وعدہ تُو نے مجھ سے کیا تھا اُسے پورا فرما'' [2] ایک روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں دُعا فرمائی، ''یا اللہ! یہ قریش اپنے فخر و غرور کے ساتھ آئے ہیں، یہ تیری مخالفت کرتے ہیں اور تیرے رسول کو جھٹلاتے ہیں۔ یا اللہ! میں تیری مدد کا طلبگار ہوں جس کا تُو نے مجھ سے وعدہ

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۰

[2] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۰۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۴ تا ۱۲۶

فرمایا ہے۔ یا اللہ! انہیں ہلاک کردے۔''[1] بروایتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِكْ ھٰذِهِ الْعِصَابَةَ فَلَا تُعْبَدْ فِي الْاَرْضِ○'' یا بقولے، یوں فرمایا (اَللّٰھُمَّ اِنَّكَ اِنْ تُھْلِكْ ھٰذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ اَھْلِ الْاِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي الْاَرْضِ○ اے میرے اللہ! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک کردی گئی تو پھر زمین میں تیری سچی عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔)[2]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ روزِ بدر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز تھے اور یہ دُعا مانگ رہے تھے، ''یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ○'' (اے زندہ و جاوید! اے ساری کائنات کا نظام چلانے والے! اپنی رحمت سے مدد فرما۔) پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''لوگو! سنو! قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جو حق تعالیٰ کی رضا اور ثواب کی طلب میں اِن کافروں سے جنگ کرے گا اور خدا کی راہ میں شہید ہوجائے گا، اُس کے لئے بہشتِ جاوداں ہے۔''[3]

قریش کا لشکر سیلابی ریلے کی طرح اُمڈ رہا تھا، وہ مسلمان تیر اندازوں کے نشانے پر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت پر تیر اندازوں نے اُسے اس طرح تیروں پر لیا کہ وہ اسلامی لشکر کے بازوؤں پر یا عقب میں وارد نہ ہوسکا۔ مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مٹھی بھر ریت فوجِ کفّار کی طرف پھینکی اور فرمایا، ''شَاھَتِ الْوُجُوْہ'' یعنی اِن کے چہرے مسخ ہوں۔ اُسی وقت تیز ہوا چلی جس کا رُخ کافروں کی طرف تھا۔ وہ ریت تمام کافروں کے چہروں پر پڑی اور اُس کے ذرے اُن کی آنکھوں اور نتھنوں میں گھس گئے۔ بعض مؤرّخین اس واقعے کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں، اُن کے نزدیک ہوا کا رُخ فوجِ کفّار کی طرف بدلا پھر ریگ بدوش ہوائیں چلنے لگیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُسی موقع کے منتظر تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مٹھی بھر ریت اُٹھائی اور دشمن کی طرف پھینکی جو کہ اشارہ تھا اپنی عقب کی محفوظ فوج کو آگے بڑھ کر دشمن پر بھرپور حملہ کرنے کا۔[4]

---

[1] عبد الملک ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ، ص ۲۷۵

[2] نصیر احمد ناصر کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص ۴۶۸ بحوالہ: ابوالکلام احمد، ترجمان القرآن ۵۲:۲، ۵۷
ابوعیسیٰ محمد ترمذی (متوفی: ۲۷۹ ہجری، ترمذ) جامع ترمذی کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۃ الانفال

[3] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۷

[4] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور)، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۷۲

اس جنگ میں ستر کافر مارے گئے تھے جن میں قریش کے مختلف قبائل کے سردار اور اسلام دشمنی میں مشہور و معروف کئی اہم کافر شامل تھے۔ اُن کی موت نے قریش کی کمر توڑ دی اور تحریکِ اسلام کی جڑیں اور مضبوط ہوگئیں۔ دُور و نزدیک کے علاقوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی اور مدینہ میں موجود یہود اور منافقین کی سرگرمیاں بھی ڈھیلی پڑ گئیں۔[1]

علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی شجاعت:

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ بدر میں مشرکین کے ستر (۷۰) مقتولین میں سے پینتیس (۳۵) شیرِ خدا حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں لقمۂ اجل بنے تھے جبکہ باقی نصف دوسرے مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہوئے۔[2] اسی بنا پر مولانا شبلی نے لکھا ہے، ''غزوۂ بدر کے ہیرو اسد اللہ الغالب علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام ہیں۔''[3] امیر المومنین علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہونے والے زیادہ تر افراد بنو اُمیّہ کے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جن سے آلِ ابوسفیان کا گہرا تعلق تھا۔ چنانچہ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ جنگ جمل، جنگ صفین (جو حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ لڑی گئیں) اور سانحۂ کربلا (جس میں نواسۂ رسول حسین ابنِ علی علیہ السلام، آلِ رسول علیہم السلام اور اُن کے ساتھیوں کو شہید کیا گیا اور بچ رہنے والے بچّوں اور مستورات کو اسیر کر کے دربارِ یزید بن معاویہ بن ابوسفیان میں پیش کیا گیا) اُنہی مقتولین کا انتقام لینے کے لئے کی جانے والی کاروائیاں تھیں۔

علی علیہ السلام کے ہاتھوں تہِ تیغ ہونے والے چند مشہور کافر:

۱) ولید بن عتبہ بن ربیعہ

۲) عاص بن سعید بن عاص بن اُمیّہ

۳) طعیمہ بن عدی بن نوفل

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۱۰

بحوالہ: دعوت دہلی، سیرت طیبہ، ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء، ص ۱۹۸

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۰۷

پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری (متوفی: ۱۹۸۸، پاکستان)، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۸۷

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۰۸

شبلی نعمانی (متوفی: ۱۹۱۴ء، لکھنؤ)، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج اوّل ص ۲۵۷

۴) نوفل بن خویلد: یہ جنگ جمل کے مشہور سردار زبیر کا چچا تھا اور مسلمانوں پر تشدد کرنے میں بہت مشہور تھا، چنانچہ جنگ ختم ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاص طور پر اُس سے متعلق دریافت فرمایا تو جناب علی علیہ السلام نے عرض کی کہ میں نے اُسے قتل کر دیا ہے۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدائے تکبیر بلند فرمائی۔

۵) حنظلہ بن ابوسفیان: شیرِ خدا حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ولید بن عتبہ کے مارے جانے کے بعد اُس کا بھانجا (حنظلہ بن ابوسفیان) میدان میں آیا۔ میں نے اُس کے سر پر وار کیا، میری تلوار اُس کا سر چیرتی ہوئی آنکھوں تک اُتر گئی اور وہ قتل ہو کر زمین پر گر پڑا۔

۶) زمعہ بن اسود

۷) حارث بن زمعہ

۸) عمیر بن عثمان بن کعب بن تیم: یہ جنگِ جمل کے ایک سردار طلحہ کا چچا تھا۔

۹) نضر بن حارث کلدہ: اسے حضرت علی علیہ السلام نے بدر سے واپسی پر صفراء میں قتل کیا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

غزوۂ قرقرۃ الکدریٰ یا غزوۃ الکُدر
(۲۵ رمضان ۲ ہجری/ ۲۰، ۲۱ مارچ ۶۲۴ء)

غزوۂ قرقرۃ الکدریٰ، ۲۵ رمضان ۲ ہجری/ ۲۰، ۲۱ مارچ ۶۲۴ء میں پیش آیا۔ [۱] بعض مؤرّخین نے اسے ۱۹ محرم سنہ ۳ ہجری میں بھی لکھا ہے۔ [۲] ''قرقرۃ'' ہموار زمین کو کہتے ہیں اور ''کدریٰ یا کُدر'' گہرے سرمئی رنگ کے ایک پرندے کا نام ہے۔ یہ غزوہ جس علاقے میں پیش آیا اُس کی زمین ہموار تھی اور وہاں کدریٰ یا کُدر نامی پرندے کی بہتات تھی اس لئے اسے قرقرۃ الکدریٰ یعنی سرمئی پرندوں والی ہموار زمین کہا جاتا تھا اور اس نسبت سے اس غزوہ کو غزوۂ قرقرۃ الکدریٰ یا غزوۃ الکدر کہا جاتا ہے۔

اس علاقے میں قبیلہ بنو سلیم رہتا تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی کہ قبیلہ بنو سلیم اور غطفان کے لوگ مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہونے کے لئے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کی سرکوبی کے لئے مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے۔ لشکر کا علم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شیرِ خدا علی مرتضیٰ علیہ السلام کو دیا۔ [۳] ابنِ سعد نے طبقات الکبریٰ میں لکھا ہے کہ لشکر کے سپہ سالار علی ابنِ ابی طالب تھے۔ [۴] بنی سلیم اور غطفان کو اہلِ ایمان کی پیش قدمی کی خبر ہوئی تو وہ سراسیمہ ہو کر بھاگ گئے اور پہاڑوں میں جا چھپے۔ [۵] اس لئے جنگ کی نوبت نہ آئی۔ بروایتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمن کے فرار سے آگاہ ہونے کے بعد اپنے لوگوں کو اُن کی تلاش میں پہاڑوں پر بھیجا جس کے نتیجے میں اُن کا ایک چرواہا جس کا نام یسار تھا اُونٹوں سمیت گرفتار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد کر دیا۔ [۶]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور)، کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۱۷۴

[۲] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۱۹

[۳] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۳

[۴] محمد ابنِ سعد (متوفی: ۲۳۰ ہجری، بغداد) الطبقات الکبری، ۱۴۱۰ق، ج ۲ ص ۲۳

[۵] عبد الملک ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ (سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اردو)، ج ۲ ص ۴۳

[۶] محمد بن عمر بن واقدی (متوفی: ۸۲۳ء، بغداد) التاریخ وَ المغازِی والمَبْعث، ۱۴۰۹ق، ج ۱ ص ۱۸۳

امیر المومنین علی علیہ السلام اور سیّدۃُ نساء العالمین علیہا السلام کا عقد

(یکم ذی الحجہ سنہ ۲ ہجری/ ۲۵ مئی ۶۲۴ء)

ایک روایت کے مطابق یکم ذی الحجہ سنہ ۲ ہجری کو، دوسری روایت کے مطابق ۶ ذی الحجہ سنہ ۲ ہجری کو اور تیسری روایت کے مطابق ۱۵ رجب سنہ ۲ ہجری کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی سیّدہ فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کا عقد جناب علی علیہ السلام سے فرمایا اور ۲۴ ذی الحجہ ۲ ہجری کو اور بروایتے ۱۹ ذی الحجہ ۲ ہجری کو آپ علیہا السلام کی رخصتی فرمائی۔ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ نکاح رمضان ۲ ہجری میں اور رخصتی اُسی سال ذی الحجہ میں ہوئی۔ کتاب اقبال الاعمال میں شیخ مفیدؒ کی کتاب ''حدائق الریاض'' کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت فاطمہ علیہا السلام ۲۱ محرم ۳ ہجری بروز پنجشنبہ اپنے پدرِ بزرگوار کے گھر سے رخصت ہوکر حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کے گھر تشریف لائیں۔ [۱]

روایت ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر نے پھر حضرت عمر نے شادی کا پیغام بھیجا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے اِعراض فرمایا۔ [۲] اُن کے بعد عبدالرحمٰن نے بھی پیغام بھیجا اور کثیر حق مہر دینے کی بات کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبدالرحمٰن سے فرمایا کہ فاطمہ (علیہا السلام) کی شادی خدا کے حکم سے ہوگی، تمہارا کثیر مہر کا حوالہ افسوس ناک ہے۔ تمہاری درخواست قبول نہیں کی جاسکتی۔ [۳] علامہ علاء الدین علی متقی بن حسام الدین، ''کنز العمال'' میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے اِعراض فرمایا تو دونوں اصحاب حضرت علی علیہ السلام کے پاس گئے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اُس وقت میں کھجوروں کو پانی دے رہا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ تمہارے چچا کی بیٹی کے لیے نکاح کا پیغام دیا جارہا ہے۔ علی علیہ السلام کے الفاظ ہیں، ''اُنہوں نے گویا کہ مجھے جگا دیا اور میں اپنی چادر لیے اُٹھ کھڑا ہُوا اور (فوراً) رسول

---

[۱] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) بحار الانوار، ج ۳ ص ۱۳۷ بحوالہ: اقبال الاعمال و دیگر اسناد

[۲] علاء الدین علی متقی ہندی (متوفی: ۱۵۶۷ء مکہ) کنز العمال، ج ۷ حصّہ سیزدہم ص ۳۱۲

[۳] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) بحار الانوار، ج ۳ ص ۱۲۶، ۱۲۷

اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہُوا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''علی! کیا چاہتے ہو؟'' میں نے عرض کی، ''آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فاطمہ (علیہا السلام) سے میرا ازدواج فرمادیں۔'' فرمایا، ''تمہارے پاس (حق مہر کے لئے) کوئی چیز ہے؟'' میں نے کہا، ''میرے پاس گھوڑا اور زِرّہ ہے۔'' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ''گھوڑا تو (تمہارے لئے) ضروری ہے ہاں البتہ زِرّہ بیچ دو۔'' پس میں نے ۴۸۰ درہم میں زِرّہ بیچ دی اور رقم لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہُوا۔ (وہ رقم جناب سیّدہ علیہا السلام کا مہر قرار پائی) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک چارپائی اور ایک تکیہ جو چھال سے بھرا ہُوا تھا جہیز میں دیا اور فرمایا کہ (رخصتی کے بعد) جب فاطمہ (علیہا السلام) تمہارے گھر پہنچ جائیں تو میرا انتظار کرنا۔ [1] روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی زِرّہ ۵۰۰ درہم میں حضرت عثمان کے ہاتھ فروخت کی اور اُس رقم سے مہر ادا کیا۔ [2]

بروایتے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حضرت علی علیہ السلام نے اِزدِواج کی درخواست پیش کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سیّدہ فاطمہ علیہا السلام سے اُن کی مرضی دریافت فرمائی۔ سیّدۃ نساء العالمین علیہا السلام چُپ ہو رہیں۔ یہ ایک طرح کا اظہارِ رضامندی تھا۔ [3]

بعض علماء نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے خود فرمایا تھا کہ اے علی! مجھے خدا نے کہہ دیا ہے کہ فاطمہ (علیہا السلام) کا عقد تمہارے ساتھ کردوں، کیا تمہیں منظور ہے؟ حضرت علی علیہ السلام نے عرض کی، ''بیشک۔'' [4] یہی روایت صحاح میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت انس بن مالک اور اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہ (علیہا السلام) کا نکاح علی (علیہ السلام) سے کردوں۔'' [5] علامہ مجلسیؒ لکھتے ہیں کہ شادی کا پیغام محمود نامی ایک فرشتہ لے کر آیا تھا۔ [6] کچھ علماء نے جبرائیل علیہ السلام کا حوالہ دیا ہے کہ وہ

---

[1] علاء الدین علی متقی ہندی (متوفی: ۱۵۶۷ء مکہ) کنز العمال، ج ۷ حصّہ سیزدہم، ص ۳۱۲

[2] محمد بن علی ابنِ شہر آشوب (متوفی: ۵۸۸ ہجری، حلب)، مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴ ص ۱۴
علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان)، چودہ ستارے، ص ۹۵

[3] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان)، چودہ ستارے، ص ۹۵

[4] ابوالعباس محب الدین طبری (متوفی: ۶۹۴ء، مکہ)، ریاض النضرہ، ج ۲ ص ۱۸۴، طبع مصر

[5] حافظ ابی القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (متوفی: ۳۶۰ ہجری، اصفہان)، المعجم الکبیر، ۱۰: ۱۵۶
یوسف بن فرغلی سبط ابن جوزی (متوفی: ۶۵۴ ہجری، دمشق) تذکرۃ الخواص

[6] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) بحار النوار، ج ۳ ص ۱۳۴

پیغام لے کر آئے تھے۔ [1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ جناب سیّدہ فاطمہ زہرا علیہا السلام اور حضرت علی علیہ السلام کا عقد ۲ ہجری ماہِ رمضان میں ہُوا جب کہ اس کی بناء ماہِ ذوالحجہ میں ہے۔ ماہِ صفر میں اور غزوۂ اُحد کے بعد کی روایات بھی ملتی ہیں۔ نکاح کے وقت سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کی عمر سولہ سال اور بعض کے نزدیک اٹھارہ سال تھی اور حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کی عمر مبارک اُس وقت اکیس سال پانچ ماہ تھی۔ [2]

جمال الدین محدث ''روضۃ الاحباب'' میں بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل وخواص میں سے ہیں اس لیے آپ اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر جناب سیّدہ علیہا السلام کے ساتھ عقد کی درخواست پیش کریں۔ علی علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس میں شرم محسوس کرتا ہوں۔ صحابہؓ نے کہا کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں بہت زیادہ مقرب ہیں اور اُن کے پیارے چچا ابوطالب کے فرزند بھی ہیں اس لئے جائیں اور شرم محسوس نہ کریں۔ چنانچہ علی مرتضیٰ علیہ السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اے ابنِ ابی طالب کیا بات ہے؟ کیسے آنا ہُوا؟ عرض کی کہ میں فاطمہ (علیہا السلام) سے اپنے اِزدِواج کی درخواست لے کر حاضر ہُوا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''مَرْحَبًا وَ اَھْلاً''۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود تھا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وہ کیفیت طاری ہوگئی جو نزولِ وحی کے وقت ہوتی ہے اور جب وہ کیفیت دُور ہوئی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ''اے انس! ربُ العرش کی طرف سے جبرائیل (علیہ السلام) میرے پاس آئے اور کہا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ فاطمہ (علیہا السلام) کا نکاح علی مرتضیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ کردو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلوایا اور جب سب حاضر ہو گئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بلیغ خطبہ پڑھا اور اللہ ربُ العزت کی حمد وثنا کے بعد حضرت فاطمہ علیہا السلام کا نکاح جناب علی علیہ السلام کے ساتھ بحق مہر چار سو مثقال چاندی، کیا اور فرمایا، ''اے علی! تم قبول کرتے ہو اور راضی ہو؟'' حضرت علی (علیہ السلام) نے عرض کی کہ میں نے قبول کیا اور راضی ہُوا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک طباق کھجور کا لیا اور صحابہؓ میں تقسیم کیا۔ [3] اسی بنا پر فقہا کی ایک جماعت کہتی ہے نکاح کے وقت کھجور وغیرہ کی ضیافت مستحب

---

[1] محمد بن علی ابنِ شہر آشوب (متوفی: ۵۸۸ ہجری، حلب) مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴ ص ۱۴
علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۹۵

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۹

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۹ بحوالہ: روضۃ الاحباب

ہے۔ پس علی علیہ السلام اور سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کے نکاح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک سے کھجور کی تقسیم کی سُنت پر مومنین آج تک عمل پیرا ہیں۔ شاید ہی کوئی نکاح ایسا ہو جس میں اس سُنت پر عمل نہ کیا جاتا ہو۔

''المواھبُ اللدنیۃ'' میں خطبہ نکاح کو یوں نقل کیا گیا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْمَحْمُوْدُ بِنِعْمَتِہٖ الْمَعْبُوْدُ بِقُدْرَتِہٖ الْمُطَاعُ بِسُلْطَانِہٖ الْمَرْھُوْبُ مِنْ عَذَابِہٖ وَسَطْوَتِہٖ النَّافِذُ اَمْرُہٗ فِیْ سَمَاءِہٖ وَاَرْضِہِ الَّذِیْ خَلَقَ الْخَلْقَ بِقُدْرَتِہٖ وَ مَیَّزَھُمْ بِاَحْکَامِہٖ وَ اَعَزَّ ھُمْ بِدِیْنِہٖ وَ اَکْرَمَھُمْ بِنَبِیِّہٖ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ اسْمُہٗ وَ تَعَالٰی عَظَمَۃً جَعَلَ الْمُصَاھَرَۃَ سَبَبًا لَّاحِقًا وَ اَمْرًا مُّفْتَرَضًا وَ شَبَّحَ بِہِ الْاَرْحَامَ وَ اَکْرَمَ الْاَنَامَ فَقَالَ عَزَّمَنْ قَالَ وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّ صِھْرًا وَّکَانَ رَبُّکَ قَدِیْرًا فَاَمْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی یَجْرِیْ اِلٰی قَضَائِہٖ وَقَضَاءٌ یَّجْرِیْ اِلٰی قُدْرَۃٍ وَلِکُلِّ قَضَاءٍ قُدْرٌ وَّلِکُلِّ قَدْرٍ اَجَلٌ وَلِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ یَّمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ عِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ ثُمَّ اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِیْ اَنْ اُزَوِّجَ فَاطِمَۃَ مِنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ.....الخ [1]

خطیب بغدادی نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کے وقت سیّدہ فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے زمین پر دو اشخاص کو برگزیدہ فرمایا ہے۔ جن میں سے ایک تمہارے والد ہیں اور دوسرے تمہارے شوہر ہیں۔ [2]

حضرت علی علیہ السلام کی زبانی شادی کی روایت

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ابوالحسن محمد بن علی بن شاہ نے ہمیں یہ حدیث سنائی، اُنہوں نے یہ حدیث ابوالعباس احمد بن مظفر بن حسین سے سُنی، اُنہوں نے ابوعبداللہ محمد بن زکریا بصری سے سُنی، اُنہوں نے محمد بن سابق سے، اُنہوں نے امام علی رضا علیہ السلام سے، اُنہوں نے اپنے والد امام جعفر صادق علیہ السلام سے، اُنہوں نے اپنے والد امام محمد باقر علیہ السلام سے، اُنہوں نے امام زین العابدین علیہ السلام سے اور اُنہوں نے امام حسین علیہ السلام سے روایت کی، اُنہوں نے فرمایا کہ میرے والد علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا، ''میں نے فاطمہ زہرا (علیہا السلام) سے اِزدواج کا ارادہ کیا لیکن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے خواستگاری کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''یا علی!'' میں نے

---

[1] شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی (متوفی: ۱۵۱۷ء، قاہرہ)، المواھبُ اللدنیۃ

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۹ بحوالہ: روضۃ الاحباب

عرض کی، ''لبیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''کیا تم شادی کرنے کی خواہش رکھتے ہو؟'' میرے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کی کسی عورت سے میرا نکاح نہ کر دیں اور اگر ایسا ہُوا تو میں فاطمہ (علیہا السلام) سے محروم ہو جاؤں گا چنانچہ میں نے عرض کی، ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیادہ بہتر جانتے ہیں۔'' پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حضرت اُمّ سلمہؓ کے گھر بلایا۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا تو مجھے دیکھتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ مبارک روشن ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندانِ مبارک کی چمک مجھے نظر آئی پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''علی! تمہیں مبارک ہو، تمہاری شادی کے لیے اللہ نے میری کفالت فرمائی۔'' میں نے عرض کی، ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ کیسے؟'' فرمایا، ''میرے پاس جبرائیل (علیہ السلام) جنّت کا ایک خوشہ اور لونگ لے کر آئے۔ میں نے اُنہیں سونگھا اور پوچھا، ''جبرائیل! یہ خوشہ اور لونگ کیسا ہے؟'' اُنہوں نے کہا، ''اللہ تعالیٰ نے بہشت کے ملائکہ اور وہاں رہنے والوں کو حکم دیا کہ وہ جنّت کی نہروں، پھلوں، اشجار اور محلات کو مزیّن کریں اور ہوا کو حکم دیا کہ عطر و خوشبو کے جھونکے نثار کرے اور حور العین کو حکم دیا کہ سورۃ طٰہٰ، طٰسٓ (سورۃ نمل) اور حٰمٓ عسق (سورۃ شوریٰ) کی تلاوت کریں پھر اللہ تعالیٰ نے ایک منادی کو حکم دیا جس نے اذنِ خدا سے یہ منادی کی، ''اے میرے ملائکہ اور میری جنّت میں رہائش پذیر مخلوق! گواہ رہو کہ میں نے فاطمہ بنت محمدؐ (علیہا السلام) کی تزویج علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) سے کر دی ہے اور یہ تزویج اُن دونوں کی اور میری رضامندی سے ہوئی ہے۔'' تب اللہ تعالیٰ نے جنّت کے ایک فرشتے کو جس کا نام ''راحیل'' ہے اور جو تمام ملائکہ میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے، خطبۂ نکاح پڑھنے کا حکم صادر فرمایا۔ اُس نے حکمِ الٰہی سے ایسا فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جیسا آج تک زمین و آسمان میں نہیں پڑھا گیا۔ اس کے بعد منادی نے حق کی طرف سے ندا دی، ''میرے ملائکہ اور میری جنّت کے باسیو! تم علی بن ابی طالب (علیہ السلام) اور میرے حبیب محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور فاطمہ بنت محمدؐ (علیہا السلام) پر برکت بھیجو، اور میں بھی اُن پر برکت بھیجتا ہوں۔'' راحیل فرشتے نے عرض کی، ''پروردگار! ہم نے علی (علیہ السلام) اور فاطمہ (علیہا السلام) کے لیے تیری جنّت اور تیری دارِ کرامت میں بھی برکت دیکھی ہے، دُنیا میں اُن پر تُو کیسی برکت نازل کرے گا؟'' خداوندِ عالم نے فرمایا، ''راحیل! اُن دونوں پر میری برکت یہ ہے کہ میں اُن کو اپنی محبت پر جمع کروں گا اور اُنہیں اپنی مخلوق پر حُجّت بناؤں گا اور اُن سے اُن کی ذریّت جاری کروں گا، اُنہیں اپنی زمین میں اپنا خازِن بناؤں گا اور اُنہیں اپنی حکمت کا معدِن بناؤں گا، اور انبیاء و مرسلین (علیہم السلام) کے بعد اُنہی کے ذریعے اپنی مخلوق پر حُجّت قائم کروں گا۔'' لہٰذا اے علی (علیہ السلام)! تمہیں مبارک اور خوشخبری ہو، میں نے تمہارا نکاح اُسی مہر پر اپنی بیٹی فاطمہ (علیہا السلام) سے کیا ہے جو اللہ نے اُس کے لیے مقرر کیا ہے اور جس مہر پر اللہ راضی ہے میں بھی اُسی

پر راضی ہوں۔ تم اپنی زوجہ کو لے جا سکتے ہو، کیونکہ اب مجھ سے زیادہ تم اُس کے حقدار ہو۔ مجھے جبرائیل امین (علیہ السلام) نے خبر دی ہے کہ جنّت اور اہلِ جنّت تم دونوں کے مشتاق ہیں، اگر اللہ نے تم دونوں سے اپنی حجتوں کا ظہور نہ کرانا ہوتا تو جنّت اور اہلِ جنّت کی خواہش پر تم دونوں کو فوراً وہاں بھیج دیتا۔ تم میرے بہترین بھائی، بہترین داماد اور بہترین ساتھی ہو، رضائے الٰہی تمہاری رضامندی کے لیے کافی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے کہا، ''پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تُو نے مجھے عطا کی ہے۔'' رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''آمین۔''[1] یہی حدیث علی بن احمد بن محمد بن عمران نے بھی بیان کی ہے، اُنہوں نے یہ حدیث احمد بن یحییٰ بن زکریا قطان سے، اُنہوں نے ابو محمد بکر بن عبداللہ بن جندب (حبیب) سے، اُنہوں نے احمد بن حرث (حارث) سے، اُنہوں نے امام حسین علیہ السلام سے اور اُنہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث اور بھی کئی طریقوں سے مروی ہے جن کا تذکرہ جناب شیخ الصدوق علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب مدینۃ العلم میں کیا ہے۔

(بحذفِ اسناد) حسین بن خالد بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے اُن کے آبائے طاہرین علیہم السلام کی سند سے سُنا کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، ''یا علی (علیہ السلام)! قریش کے کئی افراد فاطمہ (علیہا السلام) کی تزویج کے معاملے میں مجھ سے ناراض ہوئے اور کہا کہ ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صاحبزادی کا رشتہ طلب کیا تھا لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں رشتہ دینا گوارہ نہ کیا اور علی (علیہ السلام) سے اُن کا نکاح کر دیا۔ میں نے اُنہیں کہا کہ خدا کی قسم تمہیں میں نے اِس رشتہ سے محروم نہیں کیا اور میں نے اپنی مرضی سے علی (علیہ السلام) کو رشتہ نہیں دیا بلکہ اللہ نے تمہیں محروم رکھا اور اللہ ہی نے علی (علیہ السلام) کا نکاح کیا۔ مجھے جبرائیل نے کہا کہ یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر میں علی (علیہ السلام) کو پیدا نہ کرتا تو رُوئے زمین پر فاطمہ (علیہا السلام) کا کوئی ہمسر نہ ہوتا..... الخ۔''[2]

خاتونِ جنّت علیہا السلام کا حق مہر

جناب سیّدہ فاطمہ زہرا علیہا السلام کے حق مہر سے متعلق روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب فاطمہ علیہا السلام کا نکاح حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ بحق مہر چار سو مثقال چاندی باندھا۔[3] اور یہ بھی مروی ہے کہ

---

[1] شیخ ابی جعفر الصدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے)، عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج ۱ ص ۳۹۲

[2] شیخ ابی جعفر الصدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے) عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج ۱ ص ۳۹۵

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ میں نے تمہارا نکاح اُسی مہر پر اپنی بیٹی فاطمہ (علیہا السلام) سے کیا ہے جو اللہ نے اُس کے لیے مقرر کیا ہے اور جس مہر پر اللہ راضی ہے میں بھی اُسی پر راضی ہوں۔ [1] پہلی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُس حق مہر سے متعلق ہیں جو ''زمین'' پر مقرر ہُوا۔ جب کہ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سیّدہ علیہا السلام کا ایک حق مہر اللہ تعالیٰ نے جنت میں نکاح کے موقع پر مقرر فرمایا تھا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتوں نے خداوند تعالیٰ سے درخواست کرتے ہوئے کہا کہ اے خدا اور ہمارے مالک! ہمیں آگاہ فرما کہ حضرت فاطمہ علیہا السلام کا حق مہر کس قدر تھا تاکہ ہم جان سکیں اور ہمارے اُوپر واضح ہو جائے کہ وہ تمہارے نزدیک بہترین مخلوق ہے۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا، ''اے میرے فرشتو اور میرے آسمان پر رہنے والو! میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ فاطمہ بنتِ محمد علیہا السلام کا حق مہر آدھی دُنیا ہے۔'' [2]

سیّدہ کونین علیہا السلام کی رُخصتی

روایت ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کی بارات طعام کے بعد امیر المومنین علی علیہ السلام کے گھر روانہ ہوئی تو سیّدۃ نساء العالمین علیہا السلام اشہب نامی ناقے پر سوار تھیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ساربان تھے، ازواجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناقے کے آگے تھیں اور بنی ہاشم ننگی تلواریں لیے بارات کے جلوس کے ساتھ ساتھ تھے۔ سب سے پہلے بارات کو مسجد کا طواف کرایا گیا اور پھر جناب سیّدہ علیہا السلام کو حضرت علی علیہ السلام کے گھر اُتارا گیا۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا خچر منگوایا جس کا نام شہباء تھا، اُس پر چادر ڈالی اور حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام سے فرمایا کہ بیٹی اس پر سوار ہو جاؤ۔ پھر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ خچر کی لگام تھام کر چلو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود خچر کے پیچھے پیچھے تھے اور ابھی راستے ہی میں تھے کہ جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام ستر ہزار فرشتوں کے ہمراہ پہنچے اور کہا کہ ہم فاطمہ زہرا علیہا السلام کی رخصتی میں شرکت کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور اُنہیں علی بن ابی طالب علیہ السلام کے گھر تک پہنچائیں گے۔ پھر ایک طرف جبرائیل علیہ السلام نے تکبیر کہی اور دوسری طرف میکائیل علیہ السلام نے اور اُن کے ساتھ ملائکہ نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کیا اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

[1] شیخ ابی جعفر الصدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے) عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج ۱ ص ۳۹۴

[2] شیخ ابی جعفر الصدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے)، عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج ۱ ص ۳۹۲

بھی ''اللہ اکبر'' کہا۔ بروایتے جناب سیّدہ علیہا السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دُل دُل نامی خچر پر بٹھایا گیا اور رخصتی کے وقت جبرائیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام اور اسرافیل علیہ السلام ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ نازل ہوئے۔ جبرائیل علیہ السلام نے دُل دُل کی لگام پکڑی، اسرافیل علیہ السلام نے رکاب تھامی اور میکائیل علیہ السلام پیچھے پیچھے ہو لیے۔ پھر تمام ملائکہ نے تکبیر کہی۔ [1]

روایت ہے کہ سیّدۃ نساء العالمین علیہا السلام کی رخصتی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواتین سے فرمایا کہ رَجَز پڑھو، اللہ کی حمد کرو، تکبیر کہو اور کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالو جس سے اللہ ناراض ہوتا ہو۔ چنانچہ حضرت سیّدۃ نساء العالمین علیہا السلام کی رخصتی کے جلوس کے آگے آگے چلتے ہوئے ازواجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رَجَز پڑھے۔ حضرت اُمّ سلمہ، حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ نے مندرجہ ذیل رَجَز پڑھے: [2]

حضرت اُمّ سلمہ کا رَجَز:

''اے پڑوسنو! چلو اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہے اور ہر حال میں اُس کا شکر ادا کرو۔ پریشانیوں اور مصیبتوں کو دُور کر کے اللہ نے احسان فرمایا ہے، پس اُسے یاد کرو۔ آسمانوں کے پروردگار نے ہمیں کفر کی تاریکیوں سے نکالا اور ہر طرح کا عیش و آرام دیا۔ اے پڑوسنو! چلو سیّدۂ زنانِ عالم (علیہا السلام) کے ساتھ جن پر اُن کی پھوپھیاں اور خالائیں نثار ہوں۔ اے عالی مرتبت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیٹی! جسے اللہ نے وحی اور رِسالت کے ذریعے تمام لوگوں پر فضیلت دی، (سلام ہو آپ پر)۔''

حضرت عائشہ کا رَجَز:

''اے عورتو! چادریں اوڑھ لو اور یاد رکھو کہ اجتماع میں یہ اچھی سمجھی جاتی ہیں۔ یاد رکھو اُس پروردگار کو جس نے اپنے دوسرے شکر گذار بندوں کے ساتھ ہمیں بھی اپنے دینِ حق کے لیے مخصوص فرمایا۔ اللہ کی حمد اُس کے فضل و کرم پر اور شُکر ہے اُس کا جو عزت و قدرت والا ہے۔ فاطمہ زہرا (علیہا السلام) کو ساتھ لے کر چلو کہ اللہ نے اِن کے ذِکر کو بلند کیا ہے اور اِن کے لیے ایک ایسے پاک و پاکیزہ مرد (حضرت علی علیہ السلام) کو مخصوص کیا ہے جو اِن ہی کے خاندان سے ہے۔''

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) بحار النوار، ج ۳ ص ۱۴۰

[2] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء اصفہان) بحار النوار، ج ۳ ص ۱۴۳
سید محسن امین عاملی (متوفی: ۱۹۵۳ء، دمشق) اعیان الشیعہ، جز الثانی

حضرت حفصہ کا رَجَز:

''اے فاطمہ (علیہا السلام)! آپ (علیہا السلام) دُنیا کی تمام عورتوں سے بہتر ہیں۔ آپ (علیہا السلام) کا چہرہ چاند کی مثل ہے۔ آپ (علیہا السلام) کو اللہ نے تمام عالم پر فضیلت دی ہے اُس شخص کی فضیلت کے ساتھ جس کا فضل و شرف سورۃ زُمر کی آیتوں میں مذکور ہے۔ اللہ نے آپ (علیہا السلام) کی تزویج ایک صاحبِ فضیلت و مناقب نوجوان (علی علیہ السلام) سے کی ہے جو تمام لوگوں سے بہتر ہے۔ اے پڑوسنو! فاطمہ (علیہا السلام) کو لے کر چلو کیونکہ یہ بڑی شان والے باپ کی عزت مآب دختر ہیں۔''

جب بارات علی علیہ السلام کے گھر پہنچی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی منگوایا اور اُس پر دَم کر کے سیّدہ علیہا السلام اور علی علیہ السلام کے سر، سینے اور بازوؤں پر چھڑکا اور بارگاہِ احدیت میں عرض کی کہ بارِالٰہا! میں اِنہیں اور اِن کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان رجیم (کے شر) سے۔[1] پھر فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ علی (علیہ السلام) سے بے جا سوال نہ کرنا، یہ دولت مند نہیں ہیں لیکن دُنیا میں سب سے اعلیٰ اور افضل ہیں۔ اس کے بعد علی علیہ السلام سے فرمایا کہ یہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ اِسے ملال ہو۔[2]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں، ''حضرت فاطمہ علیہا السلام اُم ایمنؓ کے ہمراہ میرے گھر تشریف لائیں اور ایک طرف بیٹھ گئیں جب کہ میں دوسری طرف بیٹھا ہُوا تھا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تشریف لائے اور آتے ہی فرمایا، ''علی میرا بھائی ہے۔'' اُمّ ایمنؓ نے کہا، ''وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بھائی ہے؟ جبکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُس سے اپنی بیٹی کی شادی کرائی ہے۔'' فرمایا، ''ہاں۔'' پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اندر تشریف لائے اور فاطمہ (علیہا السلام) سے فرمایا، ''پانی لایئے۔'' چنانچہ فاطمہ (علیہا السلام) ایک پیالے میں پانی لے کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پانی میں کُلی کی اور پھر فاطمہ (علیہا السلام) سے فرمایا، ''کھڑی ہو جایئے۔'' جب وہ کھڑی ہو گئیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وہ پانی اُن کے جسمِ اطہر پر بہایا اور فرمایا، ''یا اللہ میں اِسے اور اِس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان مردُود (کے شر) سے۔'' پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے بھی پانی لانے کو کہا۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں، ''میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارادے کو جانتا تھا، اس لئے اُٹھا اور پانی سے بھرا پیالہ لے آیا۔'' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پانی میں کُلی کی اور پھر میرے سینے اور

---

[1] ابنِ حجر مکی (متوفی: ۹۷۴ھ، مکہ) الصواعق المحرقۃ، ص ۸۴

[2] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۹۶

سر پر بہا دیا اور فرمایا، ''یا اللہ میں اِسے اور اِس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان مردُود (کے شر) سے۔'' پھر فرمایا پیٹھ پھیرو۔ میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف پیٹھ پھیر دی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرے کاندھے پر بھی پانی بہایا اور فرمایا، ''یا اللہ میں اِسے اور اِس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان مردُود (کے شر) سے۔'' پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ''اللہ تعالیٰ کے نام اور اُس کی برکت کے ساتھ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ گھر میں داخل ہو جاؤ۔[1] یہ روایت جزری نے ''حصن حصین'' میں ابنِ حبان سے اپنی صحیح میں یوں بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام اور سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کا نکاح کرنے کے بعد اپنے کاشانۂ اقدس میں تشریف لے گئے اور سیّدہ فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ تھوڑا سا پانی لائیں۔ جناب سیّدہ علیہا السلام لکڑی کے پیالے میں پانی لائیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس میں اپنا مبارک لعابِ دَہن ملایا اور وہ پانی سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کے بدنِ اطہر پر چھڑکا اور فرمایا، ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُعِیْذُہَا وَ ذُرِّیَّتَہَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○'' اے اللہ! میں اِس کو اور اِس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان رجیم سے۔ پھر فرمایا کہ اور پانی لائیں۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں سمجھ گیا تھا کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا کریں گے چنانچہ میں پانی لے کر آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس میں اپنا لعابِ دَہن مبارک ملایا اور مجھ سے فرمایا کہ میرے سامنے آؤ۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سر اور چہرے پر پانی چھڑکا اور فرمایا، ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُعِیْذُہُ وَ ذُرِّیَّتَہُ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○'' الٰہی! میں اِس کو اور اِس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان رجیم سے۔ پھر مجھ سے فرمایا، ''بِسْمِ اللّٰہِ وَالْبَرَکَۃُ ○'' کہہ کر اپنی زوجہ کے پاس جاؤ۔[2]

بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کو نمازِ عشاء کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے گھر لائے۔ پھر پانی کا پیالہ لے کر اُس میں اپنا لعابِ دَہن ملایا، معوذتین اور دُعا پڑھی اور حضرت علی علیہ السلام اور سیّدہ فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ اِس پانی کو پی جاؤ اور فرمایا، ''یا خدا! یہ دونوں جانیں مجھ سے ہیں اور میں اِن سے ہوں۔ اے رب! جس طرح تُو نے مجھ سے ناپاکی کو دُور رکھا اور پاک بنایا ہے اسی طرح ان دونوں کو پاکیزہ رکھ۔'' اس کے بعد دونوں سے فرمایا کہ جاؤ اور دُعا کی، ''اے خدا! اِن کے درمیان محبت و

---

[1] علاء الدین علی متقی ہندی (متوفی: ۱۵۶۷ء مکہ) کنز العمال، ج ۷ حصّہ سیزدہم، ص ۳۱۲

[2] محمد بن محمد جزری شافعی (متوفی: ۱۴۲۹ء، شیراز) حصن حصین، ص ۱۵۷

اُلفت شامل فرما اور اِن میں اور اِن کی اولاد میں برکت دے اور اِن سے پریشانی کو دُور فرما۔ اِن کے نصیب کو نیک گردان اِن پر برکت نازل فرما اور اِن سے بکثرت اولاد پیدا فرما۔'' [1] بروایتے جناب سیّدہ علیہا السلام کی رخصتی شوال ۲ ہجری/ اپریل ۶۲۴ء میں ہوئی۔ [2] روایت ہے کہ جس وقت علی علیہ السلام کی شادی ہوئی اُن کے گھر میں ایک چمڑا تھا جسے رات کو بچھاتے تھے اور دن میں اُس پر اُونٹ کو چارہ کھلاتے تھے۔ [3]

ملکہ کونین سیّدہ فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کا جہیز

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو جہان کے تاجدار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اکلوتی اور پیاری صاحبزادی کی شادی بڑے تُزک واحتشام سے کر سکتے تھے اور شاہانہ طرز کا جہیز بھی دے سکتے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی شادی بالکل سادگی کے ساتھ کی اور جہیز میں ضروریاتِ زندگی کی چند معمولی اشیاء دیں۔ حضرت سیّدۃُ نساء العالمین علیہا السلام کی رُخصتی کا یہ انداز اُن لوگوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے جو شادی کو نمود ونمائش کا ایک قیمتی موقع یا بیوپار کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آج کل شادیوں پر ایک طرف تو بے پناہ خرچ کیا جاتا ہے، انواع واقسام کے کھانے، ریشمی ملبوسات، قیمتی زیورات اور بے شمار جہیز کا اہتمام ہوتا ہے تو دوسری طرف لاکھوں غریب بچیاں محض جہیز نہ ہونے کے سبب ماں باپ کی چوکھٹ پر بیٹھی بیٹھی جوانی کی دہلیز پار کر جاتی ہیں اور ہمیشہ غیر شادی شدہ رہتی ہیں۔ اس سے نہ صرف وہ اپنے بنیادی حقوق سے محروم رہتی ہیں بلکہ معاشرے میں کئی طرح کے مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ لڑکیوں کی شادی تو کسی نہ کسی طرح ہو جاتی ہے لیکن قیمتی جہیز نہ لے جانے کے سبب وہ اپنے سسرال کی نگاہوں میں کھٹکنے لگتی ہیں اور آئے دن طعنوں کا سامنے کرتے کرتے ایک روز زندہ جلا دی جاتی ہیں۔ اگر ہم اس معاملے میں بھی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کریں تو معاشرے میں کئی خرابیاں خود بخود دُور ہو سکتی ہیں۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہستی میں ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب سیّدۃُ العالمین علیہا السلام کو جہیز میں ایک بان کی چارپائی، ایک چمڑے کا گدّا، ایک مَشک، دو چکیاں اور مٹی کے دو گھڑے دے کر رخصت فرمایا۔ بقولے، جہیز میں سات درہم مالیت کی ایک قمیض، ایک سفید چادر، چمڑے کا فرش، دو موٹے ٹاٹ، کھجور کے پتوں سے بنا ہُوا ایک

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، بھارت) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۰

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۸۲

[3] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۹۶ بحوالہ: سبط ابن جوزی، تذکرۃ الخواص

بستر، چمڑے کے چار تکیے، ایک سیاہ کمبل، آٹا پیسنے کی چکی، کپڑے دھونے کا ٹب، ایک مشک، ایک لوٹا، کھجور کے پتوں سے بنا ہُوا ایک برتن، مٹی کی ایک صراحی، ایک پیالہ لکڑی کا اور دو پیالے مٹی کے تھے۔ [1]

مروی ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام نے اپنی زِرّہ فروخت کر کے جو رقم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بطور حق مہر پیش کی تھی اُس میں سے کچھ رقم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دی اور فرمایا کہ عطر و خوشبو خرید لائیں اور باقی رقم حضرت اُمّ سلیم رضی اللہ عنہا کو دی کہ اس سے جناب سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کے لیے جہیز اور اُمورِ خانہ داری کا سامان مہیا کریں۔ اُنہوں نے چاندی کے دو بازو بند، دو چادریں، دو بستر، گدّا، تکیہ، چار بالشت کپڑا، ایک پیالہ، ایک چکی، ایک مشکیزہ اور کچھ مشروبات وغیرہ خریدے۔ [2] بروایتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کو رقم دے کر اشیاء خریدنے کے لیے بھیجا اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مدد کے لیے ساتھ بھیجا۔ [3] اُنہوں نے چیزیں لا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے رکھیں۔ اُس وقت حضرت اسماء بنت عمیس بھی موجود تھیں۔ مختلف روایات میں جہیز کی فہرست میں ایک قمیض، ایک مقنع (سر ڈھانکنے کے لیے کپڑا)، ایک سیاہ کمبل، کھجور کے پتوں سے بنا ہُوا ایک بستر، موٹے ٹاٹ کے دو فرش، چار چھوٹے تکیے، ہاتھ کی چکی، کپڑے دھونے کے لیے تانبے کا ایک برتن، چمڑے کی مشک، ایک بادیہ (پانی پینے کا لکڑی کا برتن)، کھجور کے پتوں کا ایک برتن جس پر مٹی کا لیپ ہوتا ہے، دو مٹی کے آبخورے، مٹی کی صراحی، زمین پر بچھانے کا ایک چمڑا، ایک سفید چادر اور ایک لوٹا شامل تھے۔ [4] روایت ہے کہ یہ جہیز اُسی رقم سے خریدا گیا تھا جو حضرت علی علیہ السلام نے اپنی زِرّہ بیچ کر حاصل کی تھی۔ [5]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

❁

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۹۵

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء دہلی، بھارت) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۱

[3] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) بحار الانوار، ج ۳ ص ۱۶۸

[4] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۹۵

[5] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) بحار الانوار، ج ۳ ص ۱۶۸

ولادتِ امام حسن علیہ السلام

(۱۵ رمضان ۳ ہجری، یکم مارچ ۶۲۵ء)

۱۵ رمضان ۳ ہجری بمطابق یکم مارچ ۶۲۵ء کی رات امیر المومنین علیہ السلام اور سیّدۃ النساء العالمین علیہا السلام کے ہاں پہلے فرزند امام حسن علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ مؤرّخین کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی خوشی تھی۔ کفّارِ مکّہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''ابتر'' کہہ کر طعنہ زنی کیا کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی فرزند نہیں چنانچہ سورۃ الکوثر نازل ہُوا جس کی عملی تفسیر امام حسن علیہ السلام کی ولادت کی صورت میں سامنے آئی۔ روایت ہے کہ امام حسن علیہ السلام کی ولادت سے پہلے، حضرت اُمّ الفضل نے خواب میں دیکھا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اطہر کا ایک ٹکڑا اُن کے گھر میں پہنچا۔ اُنہوں نے وہ خواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب میری لختِ جگر فاطمہ (علیہا السلام) کے بطن سے ایک بچّہ پیدا ہوگا جس کی پرورش آپ کریں گی۔ بقولے، اُمّ الفضل نے یہ خواب حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت سے پہلے دیکھا۔[۱] روایت ہے کہ امام حسن علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ اس نومولود کا نام ''حسن'' رکھ دیجئے۔[۲] چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نواسے کا نام حسن (علیہ السلام) رکھا۔ ماہرِ علم النسب علامہ ابوالحسین کا کہنا ہے کہ خداوندِ عالم نے حضرت فاطمہ علیہا السلام کے دونوں شاہزادوں کے نام انظارِ عالم سے پوشیدہ رکھے تھے اور اِن سے پہلے حسن و حسین نام سے کوئی موسوم نہیں ہُوا تھا۔ اعلام الوریٰ کے مطابق یہ نام لوحِ محفوظ میں پہلے سے لکھا ہُوا تھا۔[۳] روایت ہے کہ ولادت کے بعد جب امام حسن علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں دیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے حد خوش ہوئے اور اُن کے دہنِ مبارک کو اپنی زبانِ اطہر سے سیراب فرمایا۔ بروایتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسن علیہ السلام کو آغوش میں لے کر پیار کیا، دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی۔ زبانِ اطہر چوسائی اور دُعا کی

---

[۱] شیخ مفید (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد) الارشاد، ص ۴۳۲

[۲] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) بحار النوار، حصّہ دہم، در حالات امام حسن علیہ السلام، ص ۲۰

[۳] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ

علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے ص ۱۷۸

کہ خدایا! اِس کو اور اِس کی اولاد کو اپنی پناہ میں رکھنا۔ [1]

غزوۂ اُحد

(۶ شوال ۳ ہجری/ ۲۲ مارچ ۶۲۵ء)

''اُحد'' مدینہ منوّرہ کا ایک مشہور پہاڑ ہے جو شمال کی جانب تقریباً دو میل کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ پہاڑ دیگر پہاڑوں سے منقطع اور بالکل الگ ہونے کی وجہ سے ''اُحد'' کہلاتا ہے اور یہ غزوہ اسی پہاڑ کے دامن میں واقع ہُوا اس لئے اسے غزوۂ اُحد کہا جاتا ہے۔ یہ غزوہ ۷ شوال اور بقولے ۱۵ شوال کو ہجرت کے بتیس ماہ بعد ۳ ہجری میں ہُوا۔ [2] مؤرّخین نے اس کی تاریخ ۳ ہجری ۶ شوال، ۷ شوال، ۱۱ شوال اور نصف شوال کے بعد بھی بیان کی ہے۔

اسلام کی روز افزوں بڑھتی ہوئی طاقت کفّار کے لئے سخت پریشانی کا باعث تھی۔ وہ اس قوّت کا قلع قمع کر دینا چاہتے تھے۔ طلوعِ اسلام سے لے کر تا حال وہ ہر طرح سے اسلام کا نام و نشان مٹانے کی کوششوں میں مصروف تھے لیکن اُن کی کوئی کوشش بار آور ثابت نہیں ہو رہی تھی حتیٰ کہ بدر میں بھی اُن کو سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے اُن کا جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھا تھا۔ اس جنگ کے لئے سب سے زیادہ پر جوش ابوسفیان اور اُس کی بیوی ہندہ تھے کیونکہ جنگِ بدر میں اُن کا بیٹا حنظلہ، ہندہ کا باپ عتبہ، چچا شیبہ اور بھائی ولید اپنے ساتھیوں کے ساتھ مارے گئے تھے اور اُن کے انتقام نے اُنہیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔ روایت ہے کہ ابوسفیان نے اپنے اُس تجارتی قافلے کے مال کو (جسے وہ بدر کے موقع پر شام سے مکّہ لا یا تھا) دار الندوہ میں رکھا اور لوگوں سے کہا کہ اپنے اموال سے ہماری اعانت کرو تا کہ ہم ایک عظیم لشکر تیار کریں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جنگ کر کے بدر کا انتقام لیں۔ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ تجارتی قافلے کا وہ مال ایک ہزار اُونٹ کے بوجھ کا تھا جس کی اصل قیمت پچاس ہزار مثقال تھی جبکہ اُس کا نفع بیس ہزار مثقال تھا۔ عبداللہ بن اُبی، ربیعہ، عکرمہ بن اَبُوجَہل، صفوان بن اُمیّہ اور کئی اور روسائے قریش ابوسفیان کے پاس آئے اور پھر سب مل کر اُن لوگوں کے پاس گئے جن کا سرمایہ اُس تجارتی قافلے میں لگا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے تجویز پیش کی کہ اس

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) بحار النوار، حصّہ دہم، در حالات امام حسن علیہ السلام، ص ۲۳ بحوالہ: علل الشرائع، معانی الاخبار

[2] سید محسن امین عاملی (متوفی: ۱۳۷۱ ہجری، دمشق) اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۱۷۷

مرتبہ تجارت میں جو رقم حاصل ہوئی ہے سب کی سب جنگ کے فنڈ میں جمع کرادی جائے۔ غیض وغضب میں مبتلا تمام کافر اس تجویز پر متفق ہوگئے۔ پھر اُنہوں نے عرب کے چرب زبانوں کی ایک جماعت کو جس میں عمرو بن عاص بھی تھا، عرب کے قبائل کنانہ، تہامہ اور ثقیف وغیرہ کی طرف بھیجا تا کہ اُن کو بھی جنگ کے لئے مدد واعانت پر آمادہ کریں۔ چنانچہ وہ اس مہم میں خوب کامیاب رہے اور عرب قبائل سے کثیر مالی معاونت اور بڑی تعداد میں جنگجو حاصل کر لیے۔ غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد کو بھی اس جنگ میں اس وعدے پر شامل کیا گیا کہ فتح کے بعد اُنہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ جبیر بن مطعم کا غلام وحشی بن حرب جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، اُنہیں میں سے ایک تھا۔

عربوں میں اپنی عورتوں کو جنگ پر لے جانے کا رواج نہیں تھا مگر اس جنگ کے لئے ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بن ربیعہ مُصر تھی کہ لشکر کے ساتھ عورتیں بھی ہوں جو مقتولینِ بدر پر نوحہ کریں اور ایسے ترانے گائیں جن سے مسلمانوں کے خلاف جوشِ انتقام پیدا ہو اور لوگوں میں جنگ کرنے کا ولولہ اُبھرے نیز اُن کی موجودگی میں لوگ میدانِ جنگ سے فرار نہ ہوں۔ چنانچہ ہندہ کی تجویز کا خیر مقدم کیا گیا اور چند مَردوں نے اپنی عورتوں کو بھی ساتھ لے لیا۔ اُن میں سے خاص خاص عورتوں اور اُن کے ساتھیوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں: [1]

۱۔ ابوسفیان بن حرب امیرِ جماعت کے ساتھ اُس کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بن ربیعہ

۲۔ عکرمہ بن اَبُوجہل بن ہشام بن مغیرہ کے ساتھ اُمّ حکیم بنت حارث بن ہشام بن مغیرہ

۳۔ عکرمہ بن اَبُوجہل کے چچا حارث بن ہشام بن مغیرہ کے ساتھ بنتِ ولید بن مغیرہ

۴۔ صفوان بن اُمیّہ بن خلف کے ساتھ برزہ یا برہ بنت مسعود بن عمرو بن عمیر ثقیفہ

۵۔ عمرو بن عاص بن وائل کے ساتھ عبداللہ بن عمرو بن عاص کی ماں ریطہ بنت منبہ بن حجاج

۶۔ طلحہ بن ابی طلحہ کے ساتھ سلافہ بنت سعد بن شہیہ

۷۔ ابوعزیز بن عمیر کے ساتھ اُس کی ماں خناس بنت مالک بن الفرب تھی۔

اس جنگ کے لئے کافروں نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا تھا جو ابوسفیان کی سرداری میں مدینہ

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۲۵
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۷۴

طیبہ کی طرف روانہ ہُوا۔ بروایتے اُس کی تعداد تین ہزار (۳۰۰۰) سے چار ہزار (۴۰۰۰) تھی۔[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''مدارج النبوّت'' میں لکھتے ہیں کہ اس لشکر کی نفری تین ہزار (۳۰۰۰) تھی جن میں سات سو (۷۰۰) زِرّہ پوش تھے، دو سو (۲۰۰) گھوڑے، تین ہزار (۳۰۰۰) اُونٹ اور پندرہ سو (۱۵۰۰) عورتوں کے ہَودَج (کجاوے) تھے۔ ''الرحیق المختوم'' میں ہے کہ لشکر میں پندرہ (۱۵) عورتیں تھیں۔[2] (اگر عورتوں کی تعداد پندرہ ہو تو ہَودَج بھی پندرہ ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ پندرہ سو، پس کتاب مدارج النبوّت میں کتابت کی غلطی کا گمان ہے۔ مؤلف) لشکرِ کفّار نے مدینہ سے پانچ چھ میل پہلے ذوالحلیفہ کے مقام پر قیام کیا، پھر پیش قدمی کی اور اُحد کے کنارے وادی بطن میں مدینہ طیبہ کے مقابل پڑاؤ ڈالا۔[3]

کہتے ہیں کہ قریش کی فوج مکّہ سے روانہ ہوئی تو کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ابواء کے مقام پر پہنچی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ محترمہ کی آخری آرام گاہ ابواء میں ہی تھی۔ قریش کے چند لوگوں نے اصرار کیا کہ پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی والدہ کا جسدِ مبارک قبر سے نکال لیا جائے۔ بروایتے یہ تجویز ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے پیش کی۔[4] تاہم اُن میں موجود کچھ لوگوں نے اس تجویز کی مذمت کی اور کہا کہ ایسا کرنے سے ممکن ہے کہ مستقبل میں یہ رواج بن جائے اور ہمارے دشمن ہمارے مُردوں کی قبریں اُکھاڑ کر اُن کی بے حرمتی کیا کریں۔[5] چنانچہ اللہ نے اُنہیں اس گھناؤنے فعل کی جسارت سے باز رکھا۔

قریش کا لشکر مسلمانوں سے پہلے ہی میدان جنگ میں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے اُحد کی وادی میں چھاؤنی ڈالی اور فوجوں کو مدینہ منوّرہ کے شمال میں بئر رومہ اور غابہ کے درمیان پھیلا دیا۔ جغرافیائی اور جنگی لحاظ سے وہ بہترین جگہ تھی۔ وہاں پانی بھی تھا اور جانوروں کے لیے چارے کی سہولت بھی تھی۔ عقب اور دائیں بائیں سے اچانک حملے کا امکان بھی بہت کم تھا۔ ابوسفیان کو اپنی مرضی کا مقام اور محاذِ جنگ حاصل کرنے کا موقع مل گیا تھا چنانچہ اُس نے میدانِ جنگ کے جغرافیائی و عسکری حالات کا جائزہ لیا اور اُن کے مطابق اپنی افواج کی صف آرائی کی۔ جنگ کے واقعات و کوائف کے مطالعہ سے اِس بات کا سراغ ملتا

---

[1] آیت اللہ جعفر سبحانی (متولد: ۱۹۲۹ء، تبریز) دی میسیج (The Message)، ص ۳۴۲

[2] مولانا صفی الرحمن مبارکپوری (متوفی: ۲۰۰۶ء مبارکپور، بھارت) الرحیق المختوم، ص ۳۳۹

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی، بھارت) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۴

[4] مولانا صفی الرحمن مبارکپوری (متوفی: ۲۰۰۶ء مبارکپور، بھارت) الرحیق المختوم، ص ۳۴۱

[5] آیت اللہ جعفر سبحانی (متولد: ۱۹۲۹ء، تبریز) دی میسیج (The Message)، ص ۳۴۳

ہے کہ ابوسفیان کی جنگی چال یہ تھی کہ مسلمانوں کو جُل دے کر اُن کے عقب میں کوہِ عینین کے دَرّے پر قبضہ کر لیا جائے اور اس طرح پیچھے سے بھی حملہ کر کے اُنہیں گھیرے میں لے کر اُن کا قلع قمع کر دیا جائے اور پھر مدینہ کو تاخت و تاراج کر دیا جائے۔ چنانچہ اُس نے میمنہ پر خالد بن ولید کو، میسرہ پر عکرمہ بن ابوجہل کو اور قلب پر صفوان بن اُمیّہ کو سالار مقرر کیا اور تیراندازوں کے دستے عبداللہ کی کمان میں دیئے۔ دَرّے پر قبضہ کر کے لشکرِ اسلام پر عقب سے حملہ کرنے کی ذمہ داری بھی خالد بن ولید کی تھی اور اُس کو بروقت کمک پہنچانے کا کام عکرمہ بن اَبُوجہل کے سپرد کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں لشکرِ کفّار کیونکہ مسلمانوں سے پہلے میدان میں پڑاؤ ڈال چکا تھا اس لیے ابوسفیان نے ایک اور مکّاری یہ کی کہ مسلمانوں کی متوقع صف بندی کے مقام کے آس پاس جابجا گڑھے کھدوا کر اُن کو کھجور کے پتوں اور چھال وغیرہ سے ڈھانپ دیا تاکہ جب مسلمانوں پر عقب سے حملہ کیا جائے اور وہ سراسیمہ ہو کر یا دفاع کے لیے اِدھر اُدھر بھاگیں تو ان گڑھوں میں جا گریں۔ اُن گڑھوں کا دوسرا مقصد اُن سے کمین گاہوں کا کام لینا تھا۔ اس کے لیے اُس نے اُن میں اپنے فوجی چھپا دیئے تھے چنانچہ ایسے ہی ایک گڑھے سے نکل کر شداد بن اسود لیثی نے حضرت حنظلہؓ پر حملہ کر کے اُنہیں شہید کیا جب وہ ابوسفیان پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ [1]

اسلامی لشکر کی تعداد نو سو (۹۰۰) یا بروایتے ایک ہزار (۱۰۰۰) تھی جن میں صرف ایک سو زِرّہ پوش تھے۔ [2] روانگی کے وقت عبداللہ بن اُبی بن سلول اپنے تین سو (۳۰۰) ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا اس طرح لشکر کی تعداد سات سو (۷۰۰) رہ گئی۔ لشکر میں صرف دو (۲) گھوڑے تھے۔ [3] تین پرچم مرتب کیے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین کا علم حضرت علی علیہ السلام کو، قبیلہ اوس کا پرچم حضرت سعد بن عبادہؓ کو اور قبیلہ خزرج کا جھنڈا حضرت خباب بن منذرؓ کو دیا۔ [4] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابنِ اُمّ مکتومؓ کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا اور ۶ شوال ۳ھ بمطابق ۲۲ مارچ ۶۲۵ء کو نمازِ جمعہ کے بعد اُحد کی طرف کُوچ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس وقت گھوڑے پر سوار تھے، کندھے پر کمان اور ہاتھ میں نیزہ تھا۔ صحابہ کرامؓ آپ

---

[1] مولانا سید ظفر حسن، کتاب مستطاب مجمع الفضائل (ترجمہ: مناقب علامہ ابن شہر آشوب) ج ۱ ص ۸۸

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۷

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۳ ص ۱۲

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۷

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عزم پختہ، ہمت جوان اور حوصلہ بلند تھا۔

عینین کا دَرّہ:

اسلامی لشکر، کفّار کے بعد میدان جنگ میں پہنچا تھا لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ ایک ذہین اور مثالی ماہرِ حربیات اور سپہ سالار کی طرح فوراً عینین کے دَرّے پر پڑی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صف بندی کے وقت جغرافیائی ماحول سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے لشکر کے عقب اور دائیں بائیں اُحد کی پہاڑیوں کو رکھا اور فوج کو تین اطراف سے محفوظ کرلیا۔ عینین کے اُس دَرّے پر جس سے عقبی جانب سے حملہ ہوسکتا تھا، حضرت عبداللہ بن جُبیرؓ کی کمان میں پچاس تیز اندازوں کا ایک دستہ مقرر کردیا اور اُنہیں واضح اور قطعی ہدایات دیں کہ لڑائی کے دوران یا بعد میں، نیز فتح ہو یا شکست، کسی حال میں بھی دَرّے کو خالی چھوڑ کر نہ جانا۔ بروایتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لشکرِ کفّار اس طرف سے حملہ آور ہو تو تیر اندازی کے ذریعے اُسے ناکام کر دینا اور کسی صورت میں بھی اس جگہ سے مت ہلنا چاہے ہم غالب ہوں یا مغلوب۔[1] پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم دیکھو کہ ہمیں پرندے اُٹھا کر لے جا رہے ہیں تب بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرنا جب تک کہ میں کسی کو تمہارے بلانے کے لئے نہ بھیجوں، اور اگر دیکھو کہ ہم نے کفّار کو شکست دے دی ہے تب بھی تم اپنی جگہ مت چھوڑنا اور اگر وہ ہم سب کو قتل کر دیں تو بھی یہاں سے جنبش نہ کرنا۔[2] وہ مقام اس اعتبار سے بھی اہم تھا کہ اگر قریش کے دباؤ کی صورت میں مجاہدین پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائیں تو تیر انداز اُن کی بھرپور مدد کرسکیں۔ صف بندی میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ مجاہدین اور قریش کی عددی نسبت ایک اور چار کی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجاہدین کی صف بندی اس طرح کی کہ قریش اپنی ساری فوج بیک وقت اُن کے مقابل نہیں لا سکتے تھے اور نہ اُنہیں گھیرے میں لے سکتے تھے۔

آغازِ جنگ اور علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام:

آغازِ جنگ قریش کی طرف سے ہُوا۔ سب سے پہلے اُن کی عورتیں اپنے سپہ سالار ابوسفیان کی

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۰۹
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۷۷

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۹

بیوی ہندہ کی قیادت میں دَف بجاتی اور رجَزیہ اشعار الاپتی ہوئی میدان میں آئیں اور گا گا کر اپنے سورماؤں کا حوصلہ بڑھانے لگیں۔ اُس موقع پر ہندہ کے گائے ہوئے اشعار بہت مشہور ہیں، وہ کہہ رہی تھی: [1]

نَحْنُ بَنَاتُ طَارِقِ نَمْشِي عَلَى النَّمَارِقِ ○
إِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِقِ أَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِقِ ○
فِرَاقَ غَيْرِ وَامِقِ ○

(ہم ستاروں کی بیٹیاں ہیں جو ناز و نعم میں پلی ہیں، آگے قدم بڑھاؤ گے تو ہم تمہارے گلے ملیں گی اور اگر پیٹھ دکھاؤ گے تو تم سے منہ موڑ لیں گی اور ایسے جُدا ہو جائیں گی جیسے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔)

پھر قریش کے حلیف قبیلہ ہوازن کے دستے نے طاقت کے نشے میں پیش قدمی کی لیکن قوتِ ایمانی سے سرشار مسلمان تیر اندازوں نے اُن کا نشہ ہرن کر دیا۔ [2] ایک روایت کے مطابق کفّار کی طرف سے سب سے پہلے ابو عامر راہب نے، جسے ابو عامر فاسق بھی کہا جاتا تھا، لشکرِ اسلام کی جانب تیر پھینکا تھا۔ وہ اپنی قوم کے پچاس آدمیوں کو ہمراہ لے کر آیا تھا۔ اُنہوں نے مل کر تیر چلائے لیکن مسلمانوں کی جوابی کاروائی سے ابو عامر بھاگ کھڑا ہُوا۔ [3] کفّار میں سے قبیلہ بنو عبدالدار پرچم لے کر آگے بڑھا۔ اُن کے علمبردار طلحہ بن عثمان ابو طلحہ نے مردِ مقابل کے لیے نعرہ بلند کیا تو حضرت علی علیہ السلام شیر کی طرح اُس پر جھپٹے اور تلوار کے ایک ہی وار سے اُس کے سر کو دولخت کر دیا۔ [4]

مدارجُ النبوّت، تاریخِ طبری اور تاریخِ ابنِ کثیر میں حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت کے ساتھ ساتھ بے مثال شرم و حیا اور کمالِ ظرف کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ طبری کی روایت ہے کہ طلحہ بن عثمان جو کفّارِ قریش کا علمدار تھا میدان میں نکلا اور پکارا، ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھیو! تمہارا دعویٰ ہے کہ اللہ ہم کو تمہاری تلواروں سے جہنم واصل کرے گا اور تمہیں ہماری تلواروں کے ذریعے جنّت میں پہنچائے گا، تو ہے کوئی تم میں ایسا جو اپنی تلوار سے مجھے جہنم رسید کرے یا میری تلوار سے جنّت میں جانا چاہے؟'' اُس کی للکار سُن کر شیرِ خدا

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۷۹
حافظ ابن عبدالبر قرطبی (متوفی: ۴۶۳ ہجری، شاطبہ) الاستیعاب، ج ۲ ص ۲۳۰

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۱۰

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۹

[4] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۱۰

سیّدنا علی مرتضیٰ علیہ السلام میدان میں تشریف لائے اور فرمایا، ''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں تجھے اپنی تلوار سے واصلِ جہنم کروں گا۔'' پھر علی علیہ السلام نے تلوار کے ایک ہی وار سے اُس کا پاؤں قطع کر دیا اور وہ اس طرح زمیں بوس ہُوا کہ اُس کی شرمگاہ کھل گئی۔ وہ منت سماجت کرنے لگا اور علی علیہ السلام نے اُسے چھوڑ دیا۔[1] ''مدارج النبوّت'' میں ہے کہ جناب علی علیہ السلام نے طلحہ بن ابی طلحہ کے سر پر ایسی ضرب لگائی جس سے وہ شدید زخمی ہوگیا۔ وہ ابھی ہلاک نہیں ہُوا تھا مگر علی علیہ السلام واپس تشریف لا کر اپنی صف میں شامِل ہوگئے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ آپ نے طلحہ کا کام تمام کیوں نہ کر دیا؟ فرمایا کہ جب وہ گرا تو اُس کا ستر کھل گیا تھا (یعنی وہ برہنہ ہوگیا تھا) اور اُس نے مجھے قسم دی کہ میں اُسے چھوڑ دوں، اُس حالت میں اُس پر دوبارہ حملہ آور ہونے میں مجھے حیا آئی... (پس میں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا)۔[2] تاریخ ابنِ کثیر (البدایہ والنہایہ) میں اُس کا نام ابوسعد بن ابی طلحہ بیان کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ علی علیہ السلام نے اُس کے شانے پر ایک کاری ضرب لگائی لیکن پھر واپس اپنی صفوں میں چلے آئے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ آپ اُس کو قتل کیے بغیر کیوں پلٹ آئے تو فرمایا کہ وہ کم بخت زخم کھا کر میرے سامنے ننگا ہوگیا تھا، لہٰذا اُس بے شرم پر دوبارہ تلوار اُٹھاتے ہوئے مجھے حیا آ گئی تھی۔ مندرجہ بالا واقعے کے ساتھ ہی لکھا ہے کہ اسی طرح جنگِ صفین میں جب حضرت علی (علیہ السلام) نے بسر بن ابی ارطات کو قتل کرنے کے لئے تلوار اُٹھائی تھی تو وہ (جان بچانے کے لئے) اُن کے سامنے برہنہ ہوکر کھڑا ہوگیا تھا اور حضرت علی (علیہ السلام) اُس بے شرم کو بھی قتل کیے بغیر پلٹ آئے تھے اور اسی طرح جنگِ صفین میں ہی عمرو بن عاص بھی حضرت علی (علیہ السلام) کے حملے سے بچنے کے لئے تہبند کھول کر عریاں ہوگیا تھا اور آپ علیہ السلام نے اُسے بھی چھوڑ دیا تھا۔[3]

اُحد کے اس واقعے میں مختلف نام کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً طلحہ بن عثمان، طلحہ بن ابوطلحہ اور ابوسعد بن ابی طلحہ وغیرہ۔ الغرض، طلحہ کے بعد اُس کے بھائی عثمان بن ابی طلحہ نے لپک کر جھنڈا اُٹھایا لیکن اُسے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ہلاک کر دیا۔ اب کفّار کا علم ابوسعید بن ابی طلحہ کے ہاتھ میں آیا لیکن اُسے سعد بن ابی

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۷۹

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۰

ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۷۸

[3] ابوالفداء عماد الدین ابن کثیر (متوفی: ۱۳۷۳ء، دمشق) تاریخ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد چہارم ص ۲۴

وقاص نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔[1] بروایتے طلحہ کے بعد بنی عبدالدار کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا شخص یکے بعد دیگرے میدان میں آئے اور سبھی امام علی علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہوئے۔[2]

علامہ مجلسیؒ لکھتے ہیں کہ ابوطلحہ کے بعد قریش کا علم اُس کے بیٹے ابوسعید نے اُٹھایا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اُسے بھی قتل کر دیا اور علم گر پڑا۔ پھر ابوطلحہ کے دوسرے بیٹے عثمان نے رایت کو اُٹھایا، اسد اللہ علیہ السلام نے اُسے بھی واصلِ جہنم کر دیا۔ جھنڈا زمین پر گرا تو ابوطلحہ کے تیسرے بیٹے منافع نے اُٹھالیا، وہ بھی یداللہ علیہ السلام کی تلوار سے مع نشان زمین بوس ہُوا۔ تب ابوطلحہ کے چوتھے لڑکے حارث نے پھریرا اُٹھایا اور شاہِ ولایت حضرت علی علیہ السلام کی ضربت سے وہ بھی خاک مذلّت پر گرا۔ اب کی بار عزیز بن عثمان نے لوا بلند کیا اور سیف اللہ کی ضربت سے وہ بھی جہنم میں جا پہنچا۔ پھر عبداللہ بن جمیلہ نے پرچم اٹھایا اور وہ بھی قتل ہو گیا تو جھنڈے کو عبدالدار کے غلام صواب نے اُٹھالیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اُس کو ایک ضرب لگائی، اُس کا داہنا ہاتھ قطع ہو گیا، اُس نے جھنڈا بائیں ہاتھ میں لے لیا، آپ نے وہ ہاتھ بھی کاٹ دیا لیکن اُس نے علم کو اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے سنبھالا اور کہا اے بنی عبدالدار! کیا جو شرطِ نصرت تھی میں نہیں بجالایا؟ حضرت علی علیہ السلام نے اُس کے سر پر تلوار کا ایک ہاتھ مارا اور اُس کو جہنم واصل کر دیا۔ یہ دیکھ کر کفّار کے دِلوں پر خوف و ہراس چھا گیا۔[3] عین اُسی وقت مسلمانوں نے بھرپور حملہ کیا اور دشمن کی صفیں اُلٹا کر رکھ دیں۔

اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ کفّار کے جھنڈے کو یکے بعد دیگرے دس اشخاص نے اُٹھایا تھا یہاں تک کہ ایک عورت جس کا نام عمرہ بنت علقمہ حارثیہ تھا علمبردارِ قریش بنی جبکہ ایک عورت سلافہ بنت سعد زنِ طلحہ بن ابی طلحہ کا نام بھی علمبردار کی حیثیت سے مرقوم ہے۔ پھر گھمسان کا رَن پڑا اور مسلمانوں نے مشرکوں پر پے در پے حملے کر کے اُن کی صفوں کو درہم برہم کر دیا اور میدانِ جنگ سے بھگا دیا۔ کفّار کے قتل عام پر اُن کی گانے بجانے والی عورتوں نے دَف پھینک دیئے اور رونے پیٹنے اور واویلا کرنے لگیں۔ خالد بن ولید نے مشرکوں کی ایک ٹولی کے ساتھ پہاڑی دَرّے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو وہاں متعین تیراندازوں کے دستے نے اُنھیں اپنے تیروں سے پسپا کر دیا۔ خالد نے کئی حملے کیے لیکن کوئی بھی کارگر نہ ہُوا۔ آخرکار

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۱۰

[2] سید محمد صحفی، حکایات القرآن، طبع جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

[3] علامہ باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیات القلوب، ج ۲ ص ۵۶۲

مسلمان غالب آ گئے اور کافروں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔[1] اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اپنی تالیف ''پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' میں لکھتے ہیں کہ (قریش کے پرچم بردار بنو عبدالدار کی ہلاکت کے بعد) قریش کے پرچم کے گرد گھمسان کا رَن پڑا، فریقین بے جگری سے لڑے۔ پرچم بلند رکھنے کی کوشش میں خاندانِ عبدالدار کے نو افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ اس معرکے میں حضرت ابودجانہ (رضی اللہ عنہ)، حضرت حمزہ (رضی اللہ عنہ) اور حضرت علی علیہ السلام نے خاص طور پر بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔[2] مؤرّخ مولانا شبلی نعمانی کے الفاظ ہیں، ''علمبرداروں کے قتل اور حضرت علی (علیہ السلام) اور حضرت ابودجانہ انصاری (رضی اللہ عنہ) کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے، پری وش نازنینیں جو اپنے سُریلے رَجزوں سے سپاہیوں کے دِل اُبھار رہی تھیں، وہ بھی بدحواسی کے ساتھ ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا۔[3]

ابوسفیان نے اُس موقع پر ایک چال چلی تھی جو بُری طرح ناکام ہوگئی۔ اُس نے چلّا کر انصار سے کہا کہ اے اوس وخزرج! ہماری تم سے کوئی لڑائی نہیں، تم واپس چلے جاؤ ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے، تم ہمیں اور ہمارے بھائیوں (مہاجرین) کو آپس میں نمٹنے دو، لیکن انصار نے اُس کی پیش کش نفرت وحقارت سے ٹھکرا دی۔[4] مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی ایک اور اُمید ابھی ابوسفیان کے دل میں باقی تھی، اور وہ تھی راہب ابوعامر کی کوشش۔ ابوعامر مدینہ میں رہنے والا ایک تارِک الدنیا قسم کا آدمی تھا جس کے گرد کمزور عقیدہ اور توہم پرست لوگ منڈلاتے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت و بزرگی دیکھ کر وہ حسد میں مبتلا ہو گیا تھا جس کی بنا پر مسلمانوں میں فاسق کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اُس نے قریش سے کہا تھا کہ جب میں میدان میں جا کر انصار کو پکاروں گا تو وہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ کر میری جانب چلے آئیں گے۔ چنانچہ وہ بڑی نخوت سے میدان میں آیا اور قبیلہ اوس کے لوگوں کو اپنی طرف بلایا مگر مسلمانوں نے اُسے فاسق کہہ کر اُس پر لعنت بھیجی تو وہ تلملا اُٹھا اور مرنے مارنے پر تل گیا۔ اُس نے خوب جنگ کی مگر بالآخر مجاہدین کی

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۰

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۱۰

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۳۵
مولانا شبلی نعمانی (متوفی: ۱۹۱۴ء، لکھنؤ) سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۲۷۶

[4] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۳۴

تلواروں کا لقمہ بن گیا۔[1]

پس، کفّار کے اکثر لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور اُن کے لشکر کا شیرازہ بکھر گیا جب کہ مجاہدینِ اسلام جن میں سب سے ممتاز علی بن ابی طالب علیہ السلام، حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ تھے، پورے جوش و خروش سے لڑ رہے تھے۔[2] وہ اپنے دِین کا بھرپور دفاع کر رہے تھے، یہاں تک کہ اُنہوں نے قریش کے بڑے بُت ''ہبل'' کو بھی (جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے) سر کے بل گرا دیا اور دشمن کی کمر توڑ ڈالی۔ یوں رفتہ رفتہ میدانِ جنگ کافروں سے خالی ہو گیا اور اکثر مسلمان مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت:

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، ارطاۃ بن عبد شرجیل کو قتل کر کے سباع بن عبدالعزیٰ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ گھات لگائے وحشی بن حرب نے اُنہیں دیکھ لیا۔ وہ حبشیوں کا خاص ہتھیار ''حربہ'' چلانے میں بہت مہارت رکھتا تھا، موقع ملتے ہی اُس نے حربہ مار کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے باوجود مجاہدین کا دباؤ کفار پر بڑھتا جا رہا تھا حتیٰ کہ اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت سے متعلق مختلف روایات ہیں، بعض کے مطابق وہ جنگ کے دوسرے حصّے میں شہید ہوئے۔) قریش کی پسپائی کو عصرِ حاضر کے کچھ مؤلفین نے ابوسفیان کی چال قرار دیا ہے حالانکہ ماضی کے مشہور و معروف مؤرّخین کے مطابق وہ شکست کھا کر بھاگے تھے جیسا کہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری میں لکھتے ہیں کہ ابودجانہ (رضی اللہ عنہ)، حمزہ بن عبدالمطلب (رضی اللہ عنہ) اور علی بن ابی طالب (علیہ السلام) نے کچھ اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنوں کا صفایا کر دیا۔ اللہ نے اپنی مدد اتاری اور اپنا وعدہ اُن سے پورا کیا۔ اُنہوں نے مخالف فوج کو تلواروں سے اتنا مارا کہ اُنہیں ہٹا دیا اور شکست دے دی جس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہ تھی۔''[3] اور ماضی قریب کے مشہور مؤرّخ علامہ شبلی کے الفاظ ہیں،

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۳۵

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۳۲

ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۳ ص ۱۵

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۳ ص ۱۶

''علمبر داروں کے قتل اور حضرت علی (علیہ السلام) اور ابو دجانہ انصاری (رضی اللہ عنہ) کے بے پناہ حملوں سے کفار کے پاؤں اُکھڑ گئے، پری وش نازنینیں جو اپنے سُریلے رَجزوں سے سپاہیوں کے دِل لبھا رہی تھیں، وہ بھی بدحواسی کے ساتھ ہٹیں اور مطلع صاف ہوگیا۔''[1] علامہ علی نقی نقن رقم طراز ہیں، ''زبیر سے روایت ہے کہ میں ہندہ بنت عتبہ کے ساتھ آئی عورتوں کو دیکھ رہا تھا، وہ پائنچے اُٹھائے بھاگی جارہی تھیں اور اُن کے گرفتار کیے جانے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔''[2] شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں کہ وہ مغنیات جو گارہی تھیں، بجائے گانے کے رونے پیٹنے، چیخنے چلانے اور واویلا کرنے لگیں۔ اُنہوں نے دَف ہاتھوں سے پھینک دیئے اور اپنے دامنوں کو اُٹھالیا یہاں تک کہ اُن کی پنڈلیاں اور اُن کے پازیب کھل گئے اور وہ پہاڑ کی طرف بھاگنے لگیں۔[3]

مالِ غنیمت کا لالچ اور دَرّہ عینین والوں کی غلطی:

جنگ اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی، مشرکین پسپا ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں کی اکثریت اُن کا پیچھا کر کے اُن پر کاری ضرب لگانے کی بجائے مالِ غنیمت کے دام میں پھنس گئی۔ لشکرِ اسلام مالِ غنیمت لُوٹنے میں مصروف ہُوا تو دَرّے پر متعین تیراندازوں کا وہ دستہ بھی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے واضح طور پر ہدایات دی گئی تھیں کہ چاہے فتح ہو یا شکست تمہیں اپنی جگہ سے نہیں ہلنا، مالِ غنیمت کے لالچ میں آ کر چل پڑا۔ اُن کے کمانڈر حضرت عبداللہ بن جبیر (رضی اللہ عنہ) نے اُنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت یاد دلائی اور روکنے کی بہت کوشش کی مگر اُنہوں نے ایک نہ سُنی اور اُن میں سے چالیس لوگ دَرّے کو خالی چھوڑ کر کر مالِ غنیمت لُوٹنے چلے گئے۔ عبداللہ بن جبیر (رضی اللہ عنہ) اپنے دس ساتھیوں کے ساتھ ثابت قدم رہے اور اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ خالد بن ولید نے دَرّے کے سپاہیوں کو منتشر ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اِسی تاک میں تھا، اُس نے عکرمہ بن ابوجہل کو ساتھ لیا اور ایک جماعت کے ساتھ عبداللہ بن جبیر (رضی اللہ عنہ) پر حملہ کر دیا۔ اُنہوں نے اپنے باقی ماندہ چند ساتھیوں کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن زیادہ دیر تک حملہ آوروں کو روک نہ سکے اور بالآخر ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔ بھاگتا ہُوا ابوسفیان خالی دَرّہ اور مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ

---

[1] مولانا شبلی نعمانی (متوفی: ۱۹۱۴ء، لکھنؤ) سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۲۷۶

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۳۵

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۰

اُٹھاتے ہوئے پلٹ آیا اور پوری قوّت کے ساتھ ہلّہ بول دیا۔ یہ بدقسمتی اور حرماں نصیبی محض رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی وجہ سے نازل ہوئی جو درّے پر متعین تیراندازوں سے سرزد ہوئی تھی۔

ایک تو مسلمانوں نے مالِ غنیمت کے لالچ میں اپنی صفوں کو خود ہی درہم برہم کر دیا تھا دوسرے قریش کے چاروں طرف سے غیر متوقع حملوں نے اُنہیں بدحواس کر دیا۔ نتیجۃً اُن میں نظم وضبط نہ رہا اور اپنے سالارِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ فوج میں نظم وضبط اور رابطہ نہ رہے تو اُن میں عسکریت بھی نہیں رہتی اور عسکریت نہ رہے تو وہ ایک مسلح ہجوم کی طرح ہو جاتی ہے اور اُس میں قوتِ تسخیر باقی نہیں رہتی۔ تقریباً یہی حال اسلامی لشکر کا ہو گیا تھا۔ حملہ آوروں سے نمٹنے کی بجائے جس کا جدھر رُخ تھا اُدھر بھاگ کھڑا ہُوا۔ ''مدارج النبوّت'' میں ہے کہ مسلمانوں کا لشکر تتر بتر ہو گیا اور اضطراب اور بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ اپنے علامتی نشان تک بھول گئے اور غلطی سے ایک دوسرے کو ہی قتل کرنے لگے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اُس بدحواسی کے سبب اسید بن حضیر کو دو زخم اپنے ہی ساتھیوں نے لگائے، ابو بردہ بھی اسی طرح زخمی ہوئے اور حذیفہ کے والد یمان بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مارے گئے۔[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے۔ کچھ مدینہ چلے گئے اور بعض ایک چٹان پر چڑھ گئے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بآوازِ بلند اُن کو پکارتے تھے کہ اے بندگانِ خدا میری طرف آؤ، میری طرف۔[2]

اِسی سے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:[3] ''اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ ....'' (اُس وقت کو یاد کرو) جب تم بے تحاشا بھاگے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ حالانکہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے....)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''مدارج النبوّت'' میں لکھتے ہیں، ''اُس وقت صحابہ چار قسموں میں بٹ گئے تھے۔ ایک قسم جنگ میں مصروف تھی اور وہ شہید ہو رہی تھی، دوسرا گروہ بھاگ رہا تھا اور پہاڑ کی گھاٹیوں اور کونوں میں چُھپ رہا تھا اور بعض شہر میں جا کر ٹھہر گئے تھے.....الخ، جو جنگ کی آگ ٹھنڈی ہونے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور ایک جماعت مرکزِ صدق پر ثابت قدم رہی اور راہِ فرار

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۱

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۳ ص ۲۶

[3] سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۳

سے محفوظ رہی۔''[1]

راہِ فرار سے محفوظ رہنے والی اور مرکزِ صدق پر ثابت قدم رہنے والی جماعت وہی تھی جس کے سردار رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار بھائی اور وزیر جناب علی علیہ السلام اور اُن کے چند ساتھی تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی نہیں رہ گیا تھا سوائے اُس جماعت کے جو چودہ آدمیوں پر مشتمل تھی، جس میں سات مہاجرین اور سات انصار تھے۔ جب قریش میدانِ جنگ میں چھائے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو تہہِ تیغ کیے جا رہے تھے تو صرف یہی جماعت ثابت قدم اور پرعزم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قریش مسلمانوں کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد گھیراؤ کرنے لگے، اُن کے حملے کا ہدف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آس پاس گھمسان کا رَن پڑا۔ مجاہدین پروانوں کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نثار ہونے لگے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب صرف حضرت علی علیہ السلام اور دو چار مجاہدین رہ گئے۔ دشمن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نرغے میں لے کر تیروں، تلواروں اور نیزوں سے مسلسل حملے کرتے رہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکے۔[2]

کہتے ہیں کہ عتبہ بن ابی وقاص، ابی قمیّہ لیثی، ابی بن خلف، عبداللہ بن حمید اسری اور عبداللہ بن شہاب زہری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کا حلف اُٹھایا تھا چنانچہ وہ کسی نہ کسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب پہنچ گئے۔ عبداللہ بن شہاب زہری ملعون نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو زخمی کیا، بدبخت عتبہ بن ابی وقاص نے سنگ باری کی اور ایک پتھر لگنے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نچلا دانت شہید ہو گیا اور ہونٹ زخمی ہوئے۔ (شیعہ علماء جسم کے کسی حصّے کی کمی یا معذوری کو شانِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف سمجھتے ہیں چنانچہ اُن کی روایات کے مطابق جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی دانت شکستہ نہیں ہُوا تھا، صرف چہرہ مبارک زخمی ہُوا تھا۔[3]) عبداللہ بن قمیّہ ملعون نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر اقدس پر پتھر سے ایسا وار کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خود کے دو حلقے چہرۂ مبارک میں دھنس گئے اور رُوئے اقدس خون سے گلنار ہو گیا۔ پھر عبداللہ بن حمید اسری ملعون

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۱

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۶

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۵۱ بحوالہ: فضل بن حسن طبرسی

آگے بڑھا لیکن حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے اُسے فی النار کر ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیروں کی بوچھاڑ اور تلواروں کے سائے میں تھے لیکن عزم و ہمت کا پیکر بنے ہوئے تھے۔ لڑائی کا سارا زور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آس پاس تھا۔ دشمن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان لینے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جان نثار سینہ سپر تھے۔ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ بھی اُن میں ایک تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چلائے جانے والے تیروں کو اپنے سینے کی ڈھال پر روک رہے تھے یہاں تک کہ زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔ ابنِ قمیّہ، آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ آور ہُوا تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بیچ میں حائل ہو گئے اور سخت مقابلے کے بعد جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ابنِ قمیّہ نے سمجھا کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کیا ہے پس وہ جوشِ مسرت میں اپنے رفیقوں کے ساتھ پلٹا اور ابوسفیان کے پاس ایک اُونچی جگہ چڑھ کر چلّایا، ''سنو! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شہید ہو گئے۔''[1] یہ افواہ پھیلی تو مسلمان مغموم اور مایوس ہو گئے جبکہ قریش نے اسے اپنی فتح سمجھتے ہوئے لڑائی سے ہاتھ روک لیا۔ یہ اُن کی ناقابلِ تلافی غلطی تھی کیونکہ چند مجاہدین نے مایوسی اور حزن و ملال کے اُس عالم میں بھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے اور جب اُنہیں معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیریت سے ہیں تو اُن کے تنِ مُردہ میں جان پڑ گئی، شکستہ حوصلوں میں توانائی لوٹ آئی اور وہ سرفروشانہ انداز میں پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار:

روایت ہے کہ جب مسلمانوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی اور وہ میدان سے فرار ہو گئے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمن کے نرغے میں گھر گئے۔ اُس وقت امام علی علیہ السلام ایک متحرک سپر کی مانند آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد گھومتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کرنے لگے اور دشمنوں کو مار مار کر بھگانے لگے۔ علی علیہ السلام نے ایسی شمشیر زنی کی کہ تلوار تابِ جلالِ علی نہ لا سکی اور ٹوٹ گئی۔ بقولے، آپ نے جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ بہادر اپنے ہتھیار سے لڑتا ہے اور میری تلوار ٹوٹ گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تلوار ''ذوالفقار'' عطا کی اور فرمایا کہ اِس سے جنگ کرو۔ شیرِ خدا نے ذوالفقار اٹھائی اور جو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بڑھتا ہُوا پایا اُسے جہنم رسید کر دیا۔ پھر آپ کوہِ اُحد کی طرف بڑھے اور اُس پہاڑ کی جانب پشت کر لی تا کہ جنگ ایک ہی سمت سے ہو کیونکہ اُس وقت سوائے آپ کے کوئی بھی آنحضرت

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۷۳ تا ۱۷۴

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نہیں تھا۔ آپ تمام وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے شمشیر زن رہے یہاں تک کہ آپ کے بدن پر نوے زخم آئے اور بہت سا خون بہہ گیا لیکن پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور برابر دفاعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مصروف رہے۔[1] جبرائیل علیہ السلام نے آپ کی جاں نثاری دیکھی تو بآوازِ بلند کہا: ''لَا فَتیٰ اِلاَّ عَلِی لَا سَیْفَ اِلاَّ ذُوْالْفِقَار○'' (علی علیہ السلام کے سوا کوئی جوانمرد نہیں اور ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں۔)

ہر مسلک کے علماء اور ہر دَور کے مؤرّخین نے اُحد کے دن امام علی علیہ السلام کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یاور اور مددگار قرار دیا ہے، اُن کے جذبۂ ایمانی اور ثابت قدمی کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ دشمن کا محاصرہ تنگ ہو رہا تھا اور وہ پوری قوّت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک آ رہے تھے لیکن علی علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یوں سینہ سپر تھے کافروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے میں کامیابی نہیں ہو پا رہی تھی۔[2]

''مدارج النبوّت'' میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''منقول ہے کہ جب مسلمانوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی طرف دیکھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں کھڑے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''یا علی! تم اپنے بھائیوں کے ساتھ کیوں نہیں مِل گئے؟'' (یعنی تم کیوں نہیں فرار ہو گئے؟) حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، ''لَا کُفْرَ بَعْدَ الْاِیْمَانِ اِنَّ لِیْ بِكَ اُسْوَۃً○'' (ایمان کے بعد کفر نہیں ہے، بے شک میرے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی اقتدا ہے۔) مطلب یہ کہ مجھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سروکار ہے، اُن سے نہیں جو غنیمت کے درپے ہو گئے اور ہزیمت میں مبتلا ہو گئے۔ عین اُسی لمحے کافروں کی ایک جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب حملہ آور ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''یا علی (علیہ السلام)! اِس ٹولی سے میری حفاظت و خدمت کا حق بجالاؤ کیونکہ یہی وقتِ نصرت ہے۔'' حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ اُس جماعت کی طرف متوجہ ہوئے اور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد سے اُن کا گھیرا توڑ کر اُنہیں منتشر کر دیا اور بہت سوں کو واصلِ جہنم کیا۔ اربابِ سیر بیان کرتے ہیں کہ جب علی مرتضیٰ علیہ السلام نے کمال بہادری دکھائی اور حضور

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، لکھنؤ) حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۵۶۵

[2] سید محمد صحفی، حکایاتُ القرآن، طبع جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کی تو جبرائیل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ علی مرتضیٰ (علیہ السلام) نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خاطر کمال بہادری اور جوانمردی دکھائی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اِنَّهٗ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْهُ○'' (بے شک یہ میرے ہیں اور میں اِن کا ہوں)۔ حدیث میں ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کلمہ ارشاد فرمایا تو جبریل علیہ السلام نے عرض کی، ''وَاَنَا مِنْکُمَا○'' (اور میں آپ دونوں کا ہوں)۔ روایت ہے کہ اُس وقت لوگوں نے غیب سے ایک آواز سُنی ''لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار○'' (کوئی جوانمرد نہیں بجز علی کے اور کوئی تلوار نہیں بجز ذوالفقار کے)[1] ''معارج النبوۃ'' اور ''کشف الغمہ'' میں اس واقعے کے آخر میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی! تم نے اپنی تعریف سُنی جو رضوان نامی فرشتہ کر رہا تھا؟ وہ کہتا تھا، ''لَافَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوْالْفِقَار○'' اور ''روضۃ الاحباب'' میں منقول ہے کہ یہ حدیث اسی طریقے سے بعض اکابر محدثین سے مروی ہے اور اہلِ سیر نے اپنی کتابوں میں بیان کی ہے۔ الغرض حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ نے مقابلہ و محاربہ اور مجادلہ و شجاعت کا ایسا حق ادا کیا کہ اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔[2]

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے خاص طور پر بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔[3] مروی ہے کہ جنگ میں سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زخمی ہوئے تو امیر المومنین علیہ السلام اور سیّدۃُ نساء العالمین علیہا السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روئے مبارک سے خون صاف کرتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام پانی لے کر آتے اور جناب سیّدہ فاطمہ زہرا علیہا السلام والد گرامی کا خون دھوتیں۔ نمازِ ظہر کا وقت ہُوا تو حالتِ جنگ میں اور زخمی ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے لیے تیار ہو گئے۔ فضا خونیں اور دہشت ناک تھی، دشمن ابھی میدان جنگ میں موجود تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے باقی ماندہ مجاہدین کے ساتھ اپنے پروردگار کے حضور سربسجود تھے۔ رَزم ہوتی یا بزم، غم و اندوہ ہوتا یا مسرت و

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۶

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۷
علی بن عیسیٰ اربیلی (متوفی: ۶۹۴ ہجری) کشف الغُمۃ

[3] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۱۰

شادمانی کا عالم، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ تو اپنے معبودِ برحق کو بھول سکتے تھے اور نہ ہی کبھی بھولے۔

انجام:

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ نامراد کفّار صحنِ معرکہ میں اِدھر اُدھر کتوں کی مانند دوڑ رہے تھے۔ وہ خوشی و شادمانی کا اظہار کرتے ہوئے رَجز خوانی اور سیر و تفریح کر رہے تھے۔ اُن کی عورتیں مثلاً ہندہ وغیرہ مسلمان شہیدوں کے پاس آئیں اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے سوا تمام شہیدوں کا مُثلہ کرنے لگیں۔ وہ اُن کے شکم چاک کرتیں، کلیجے نکالتیں، ناک کان کاٹتیں، ڈوریوں میں پرو کر ہار بناتیں اور اپنے گلوئے ناہنجار اور ناپاک ہاتھوں میں پہنتیں۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے مُثلہ نہ کرنے کا سبب یہ تھا وہ ابو عامر راہب کے بیٹے تھے جو مشرکوں میں سے تھا۔ [1]

اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود چند اہلِ ایمان ثابت قدم بھی تھے اور رَحمتِ الٰہی کے منتظر بھی جبھی قادرِ مطلق نے ہاری ہوئی جنگ کو اپنے بندوں کے حق میں پلٹ کر اُنہیں فتح سے ہمکنار کر دیا۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ جنگ کی ہار جیت کا انحصار فریقین کے مجموعی طور پر ہونے والے جانی نقصان پر نہیں ہوتا بلکہ دشمن کے سرداروں اور علمبرداروں کی موت یا پسپائی اور مقاصدِ جنگ میں کامیابی کے حصول پر ہوتا ہے۔ اس جنگ میں ستر مجاہدینِ اسلام درجہ شہادت پر فائز ہوئے جن میں مردِ میدان حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ دوسری طرف کافروں کا اگرچہ زیادہ جانی نقصان نہیں ہُوا تھا لیکن ابوسفیان کے سوا اُن کے تمام علمبردار اور سردار جہنم رسید ہوئے تھے اور جو فوج باقی رہ گئی تھی وہ فوج نہیں محض عوام کی ایک غیر منظّم بھیڑ بن گئی تھی۔ اور اگرچہ مسلمانوں نے ابتدا میں فرار ہو کر اور بھاری جانی نقصان اُٹھا کر تاریخ کو اپنا گواہ تو بنا لیا تھا لیکن چند مومن جو ثابت قدم رہے اُن کی جانفشانی کے انعام کے طور پر اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت کے طفیل بالآخر فتح اسلام کی پیشانی کا جھومر بنی۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ شکست کے بعد ابوسفیان ہارے ہوئے جواری کی طرح اِدھر اُدھر ناکام و نامراد پھر رہا تھا۔ وہ ایک پہاڑ پر چڑھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر اپنی خجالت چھپانے کی خاطر نعرہ لگایا، ''اے ہبل تُو بلند رہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی جوابی نعرہ بلند کیا، ''اللہ بلند اور جلیل ہے۔'' ابوسفیان بولا، ''ہمارے لیے عزّیٰ ہے تمہارے

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۷۶

لیے عزّیٰ نہیں ہے۔'' صحابہؓ بولے، ''اللہ ہمارا مددگار ہے تمہارا کوئی مددگار نہیں۔'' پھر ابوسفیان نے چیلنج دیا کہ آئندہ سال بدر میں پھر ہمارا تمہارا مقابلہ ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کا چیلنج قبول فرمایا اور ایک صحابی کے ذریعے جواب دیا کہ ٹھیک ہے یہ بات ہمارے تمہارے درمیان طے ہوگئی۔ [1] یہ جواب سُن کر ابوسفیان اپنے لشکر کو لے کر پلٹ گیا۔ اُس کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا کیونکہ قریش نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے میں کامیاب ہوئے تھے اور نہ ہی مسلمانوں کو شکستِ فاش دے کر ہلاک و اسیر کر سکے تھے۔

اگلے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کے تعاقب کا فیصلہ کیا۔ مجاہدین نے اس پر لبیک کہا اور ایک نئے ولولے اور عزم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اُسی روز شام کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حمراء الاسد میں پڑاؤ ڈالا اور لشکر کی حفاظت کے لئے سخت انتظامات کیے تاکہ دشمن شبخون نہ مار سکے۔ صبح ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مضبوط دفاعی مورچہ قائم کیا اور مجاہدین کی صف بندی فرمائی۔ مومنین کے دِل قوّتِ ایمانی سے لبریز تھے اور اُن کا جذبۂ جہاد اپنے عروج پر تھا چنانچہ جب وہ صف آراء ہوئے تو ہیبت و طاقت کا ایک فقید المثال نظارہ پیش کر رہے تھے۔ اُدھر ابوسفیان مسلمانوں کے مکمل استیصال کے لیے بھرپور تیاری کیے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کے زبردست حملہ کر کے مسلمانوں کا صفایا کر دوں گا۔ اُسے مجاہدین کے حمراء الاسد میں اس طرح صف آراء ہونے کی خبر ملی تو اُس کا دِل بیٹھ گیا اور وہ خوف اور مایوسی کے عالم میں بے نیل و مرام مکّہ لوٹ گیا۔ [2]

جب مشرکین مکّہ لوٹ گئے تو بعض صحابہ کے دلوں میں خدشہ پیدا ہُوا کہ مبادا وہ لوٹ کر مدینہ طیبہ پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ وہ دشمنوں کے تعاقب میں جا کر اطمینان کر لیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے اُن کا تعاقب کیا اور یہ خبر لائے کہ مشرکین مکّہ کی طرف چلے گئے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سُن کر فرمایا کہ آج کے بعد کفّارِ قریش کبھی بھی کامیاب نہ ہوں گے اور انشاءاللہ ہمیں مکّہ مکرمہ کی فتح نصیب ہوگی۔ [3]

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۸۸

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۱۷
عبدالملک ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ، ج ۲ ص ۱۷۲

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۷۷

تاریخ طبری میں اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ تم مشرکین کے پیچھے جا کر دیکھو کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اُن کا لائحہ عمل کیا ہے؟ اگر اُنہوں نے گھوڑوں کو کوتل (بغیر سوار کے خالی گھوڑے) ساتھ لیا ہوا اور خود اُونٹوں پر سوار ہوں تو سمجھ لینا کہ اب وہ مکّہ پلٹ رہے ہیں اور اگر اس کے برعکس وہ گھوڑوں پر سوار ہوں اور اُونٹوں کو خالی ساتھ لے جا رہے ہوں تو سمجھ لینا کہ اُن کا ارادہ مدینہ کا ہے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر وہ مدینہ کا رُخ کریں گے تو میں فوراً مدینہ پہنچ کر اُن سے لڑوں گا۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حسبِ حکم میں اُن کے پیچھے چلا کہ دیکھوں وہ کیا کرتے ہیں؟ جب میں نے دیکھا کہ اُنہوں نے گھوڑوں کو کوتل کر دیا ہے اور اُونٹوں پر سوار ہو گئے ہیں تو میں سمجھ گیا کہ اب وہ مکّہ جا رہے ہیں۔ [1]

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کی تلواریں حضرت فاطمہ علیہا السلام کے سپرد:

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ سے واپس تشریف لائے تو اپنی تلوار حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کے سپرد کی، جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے اپنی تلوار جناب زہرا علیہا السلام کے سپرد کی اور فرمایا کہ بخدا آج اس نے میرے ساتھ خوب وفاداری کی۔ اُس موقع پر حضرت علی علیہ السلام نے یہ اشعار بھی کہے: [2]

افاطم هاك السيف غير ذميم ○ فلست برعديد ولا بملیم ○

اے فاطمہ (علیہا السلام)! یہ تلوار لو جس سے مجھے کوئی شکایت نہیں

اور نہ ہی میں بزدل اور نکما ہوں

لعمری لقد قاتلت فی حب احمد ○ وطاعة رب بالعباد رحیم ○

قسم ہے میری جان کی میں احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت

اور اپنے رب کی اطاعت میں جو اپنے بندوں پر رحیم ہے، لڑا

وسیفی بکفی کالشهاب اهزه ○ اجذبه من عاتق وضمیم ○

اس حال میں کہ تلوار میرے ہاتھ میں روشن ستارے کی طرح تھی

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۸۸

[2] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۹۲

جسے میں چلا رہا تھا اور اس سے کاندھوں اور پسلیوں کو قطع کر رہا تھا

فماذلت حتی فضی ربی جموعھم ○ وحتی شفینا نفس کل حلیم ○

میں اسی طرح شمشیر زنی کرتا رہا یہاں تک کہ میرے رب نے اُن کی جماعت کو پراگندہ کر دیا اور ہم نے ہر حلیم شخص کے دِل کو دشمن کے قتل سے ٹھنڈا کر دیا

جنگ میں مسلمان خواتین کی خدمات:

جنگِ اُحد میں مسلمان خواتین نے بھی اپنی بساط کے مطابق حصّہ لیا اور جذبۂ انسانی و ایمانی سے سرشار ہو کر ایسی خدمات انجام دیں جو ہمیشہ کے لیے مشعلِ راہ بن گئیں۔ اس جنگ میں مجاہدین بڑی تعداد میں زخمی یا شہید ہوئے تھے، بقولے، شہداء کی تعداد ستّر اور زخمیوں کی چالیس تھی۔ جب یہ خبر مدینہ منوّرہ پہنچی تو مسلمان خواتین سے نہ رہا گیا اور وہ اپنے دینی بھائیوں کی مدد کرنے میدانِ جنگ میں پہنچ گئیں۔ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، پانی پلاتیں اور اُن کی خدمت اور دیکھ بھال کرتیں۔ اُن خواتین کی سربراہ جناب سیّدۃ نساء العالمین حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام سب میں نمایاں تھیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ''نرسنگ'' کی بانی فلورنس نائٹنگیل (Florence Nightingale) تھی جو ۱۲ مئی ۱۸۲۰ء کو اٹلی میں پیدا ہوئی اور ۱۳ اگست ۱۹۱۰ء کو برطانیہ میں فوت ہوئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کا سنگِ بنیاد خاتونِ جنّت سیّدۃ نساء العالمین حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام نے جنگِ اُحد میں رکھا تھا۔

حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا پس منظر:

حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ ایک عام سپاہی کی طرح میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے اتفاقاً شہید نہیں ہوئے تھے۔ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ اُن کی شہادت کے پیچھے ایک گہری سازش تھی جسے ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ اور جبیر بن مطعم نے تیار کیا تھا۔ اُن دونوں کو جنگِ بدر میں اپنے اقرباء کے مارے جانے کا شدید غم و غصہ تھا جس کی بنا پر اُنہوں نے جبیر بن مطعم کے غلام وحشی ابووسمہ بن حرب کو لالچ دے کر تیار کیا کہ وہ مسلمانوں کی تین اہم ترین شخصیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین علی علیہ السلام اور حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کو قتل کرے گا تو اُسے آزاد کر دیا جائے گا۔[1] وحشی ابووسمہ ایک خطرناک ہتھیار ''حربہ''

---

[1] آیت اللہ جعفر سبحانی (متولد: ۱۹۲۹ء، تبریز) دی میسیج (The Message)، باب ۳۲

(نیزہ/ بھالا) کے استعمال میں بہت مہارت رکھتا تھا اور اُس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔ جبیر کا چچا طعیمہ جنگِ بدر میں جناب علی علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہُوا تھا۔ اُس نے وحشی سے کہا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچا کو میرے چچا طعیمہ کے بدلے قتل کردو تو میں تمہیں آزاد کردوں گا۔ ہندہ بنت عتبہ کا یہ حال تھا کہ جب وہ وحشی کے پاس سے گزرتی یا وہ اُس کے پاس سے گزرتا تو اُسے کہتی، ''ابو وسمہ! تُو میرا دل ٹھنڈا کر اور اپنا بھی۔''[1]

اربابِ سیر بیان کرتے ہیں کہ طعیمہ بن عدی کے کہنے پر جب وحشی اُحد کی طرف چلا تو راہ میں ہندہ بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان ملی۔ وہ وحشی کے پاس پہنچی اور کہا کہ جب تک تُو ہماری خاطر داری نہیں کرے گا تجھے آزادی نہیں ملے گی، میں تجھے بہت کچھ دوں گی کیونکہ میرے باپ عتبہ کو روزِ بدر حمزہ نے ہی مارا تھا۔ وحشی ابو وسمہ سے منقول ہے، ''میں حربہ خوب چلاتا ہوں اور میرا نشانہ کم ہی خطا ہوتا ہے۔ پس جب حمزہ بے خبری میں میرے پاس سے گذرے تو میں نے اپنا حربہ اُن کے عانہ (ناف سے نیچے کا حصّہ) پر پھینکا جو دوسری طرف پار ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں تو میں بھاگ کھڑا ہُوا، پھر وہ زمین پر گر پڑے۔ کچھ دیر بعد میں پھر اُن کی طرف گیا اور اپنے خنجر سے اُن کا پیٹ چاک کر کے جگر نکالا اور ہندہ کو دیا جسے اُس نے منہ میں ڈال کر چبایا اور پھر تھوک دیا (گویا کہ ہندہ نے وحشی سے کہہ رکھا تھا کہ جب تُو حمزہ (رضی اللہ عنہ) کو شہید کردے تو اُن کا جگر نکال کر مجھے دینا، یا پھر یہ سیاہ قاسی القلب از خود اُسے اُس کے پاس لے گیا تھا کیونکہ اُس نے اسے لالچ دے رکھا تھا) تب ہندہ نے اپنے کپڑے، زیور اور تمام سونا چاندی مجھے دے دیئے اور وعدہ کیا کہ جب مکّہ پہنچوں گی تو سرخ سونے کی دس اشرفیاں مزید دُوں گی۔'' وحشی سے یوں بھی منقول ہے کہ ہندہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں حمزہ کی لاش ہے۔ میں اُسے وہاں لے گیا۔ اُس نے حمزہ کے ناک، کان اور ہاتھ پاؤں کاٹ لیے اور اپنے ساتھ مکّہ لے آئی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر چبانے کی وجہ سے ہی ہندہ کو ''آکِلَۃُ الْاَکْبَاد'' یعنی ''جگر خورہ'' کہا جاتا ہے۔[2]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

❁

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ ح اوّل ص ۱۷۴

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت ج ۲ ص ۱۶۵

ولادتِ امام حسین علیہ السلام

۳ شعبان ۴ ہجری (۷ جنوری ۶۲۶ء)

سنہ ۴ ہجری کا اہم واقعہ ۵ شعبان کو حضرت امام حسین (علیہ السلام) کی ولادتِ سعید ہے۔[۱] ولادت کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام حسین علیہ السلام کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دَہن لگایا اور زبانِ اطہر اُن کے منہ میں دے کر بڑی دیر تک چساتے رہے۔ اس کے بعد دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی پھر دُعائے خیر فرما کر حُسین نام رکھا۔ حسین (علیہ السلام) نام رکھنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ بیٹی جس طرح حسن (علیہ السلام) کا عقیقہ کیا گیا تھا اُسی طرح حسین (علیہ السلام) کے عقیقے کا بھی اہتمام کرو اور جس طرح حسن (علیہ السلام) کے بالوں کے ہم وزن چاندی تصدق کی گئی تھی اُسی طرح حسین (علیہ السلام) کے بالوں کے ہم وزن چاندی تصدق کرو۔ چنانچہ ایک مینڈھا منگوایا گیا اور رسمِ عقیقہ ادا کی گئی۔[۲]

وفات حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام

(۴ یا ۵ ہجری/ سنہ ۶۲۶ء)

ہجرت کے چار یا پانچ سال بعد سنہ ۶۲۶ء میں امیر المومنین علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام آپ کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کی وفات سے بہت صدمہ پہنچا۔ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے گھر تشریف لے گئے اور اُن کے سرہانے بیٹھ کر فرمایا، ''اے میری ماں! اللہ آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے، بہت دفعہ آپ نے مجھے کھلانے کے لیے خود بھوک برداشت کی۔ آپ نے مجھے اتنا اچھا کھلایا اور اتنا اچھا پہنایا جس سے آپ نے خود کو (میری خاطر) محروم رکھا۔ خدا یقیناً آپ کے ان اعمال سے خوش ہے کیونکہ آپ کی نیت اللہ کی رضا حاصل کرنا اور آخرت میں کامیاب ہونا تھی۔''

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۳۶

[۲] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے، ص ۲۱۳ بحوالہ:
مؤمن بن حسن شبلنجی (متوفی: ۱۲۹۰ ھجری، شبلنجا، مصر) نور الابصار، ص ۱۱۳
محمد بن طلحہ الشافعی (متوفی: ۶۵۲ ھجری، دمشق) مطالب السؤول فی مناقب آل الرسول، ص ۲۱۳

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے کفن کے لیے اپنا کرتہ عنائت فرمایا اور قبر میں خود اُتر کر اُنھیں لحد میں اُتارا اور اُن کے ساتھ لیٹ گئے۔ [1]

غزوۂ خندق

(ذیقعد یا شوال ۵ ہجری)

غزوۂ خندق ۲۸ ذیقعد ۵ ہجری میں [2] اور بروایتے شوال ۵ ہجری میں ہُوا۔ [3] خواجہ محمد لطیف انصاری نے ذیقعد ۵ ہجری کے ساتھ عیسوی تاریخ مارچ/اپریل ۶۲۷ء لکھی ہے۔ [4] ''روضۃ الاحباب'' میں بھی یہ غزوہ ۵ ہجری میں بیان کیا گیا ہے لیکن یہ بھی مشہور ہے کہ یہ چوتھے سال میں ہُوا۔ [5] اس غزوہ میں مدینہ کے اردگرد خندق کھودی گئی تھی اسی وجہ سے اسے غزوۂ خندق کہا جاتا ہے۔ اس کو غزوۂ احزاب کا نام بھی دیا جاتا ہے کیونکہ احزاب کے معنی ''گروہ'' کے ہیں اور اس جنگ میں قریش، یہود اور دیگر قبائل متحد ہو کر یعنی گروہ کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف نکلے تھے۔ اس سے پہلے غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد میں قریش نے اپنی ساری طاقت جھونک دی تھی لیکن مسلمانوں کو زیر کرنے کی بجائے نہ صرف شکستِ فاش سے دو

---

[1] علی بن محمد اثیر الجزری (متوفی: ۸۳۸ ہجری، موصل) اسد الغابۃ، ج ۵ ص ۵۱۷
طبرانی (متوفی: ۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الاکبیر ۲۴: ۳۵۱؛ المعجم الاوسط، ۱: ۶۷
ابنِ عبد البر القرطبی (متوفی: ۴۶۳ ہجری، شاطبہ) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ۴: ۱۸۹۱
ابو نعیم اصفہانی (متوفی: ۱۰۳۸ء، اصفہان)، حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء، ۳: ۱۲۱
عبد الرحمٰن ابن جوزی (متوفی: ۱۲۰۱ء، بغداد) العلل المتناہیہ فی احادیث الوابیتہ، ۱: ۲۶۹
عبد الرحمٰن ابن جوزی (متوفی: ۱۲۰۱ء، بغداد) صفوۃ الصفوۃ، ۲: ۵۴
ابن حجر عسقلانی (متوفی: ۱۴۴۹ء، قاہرہ) الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ، ۸: ۶۰
نور الدین علی بن ابی بکر بن سلیمان ہیثمی (متوفی: ۸۰۷ ہجری، قاہرہ) مجمع الزوائد، ۹: ۲۵۶

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۸۴ بحوالہ:
عبد الباری ایم اے، دعوت دہلی سیرۃ طیبہ نمبر ربیع الاوّل ۱۳۷۹ھ

[3] سید محسن امین عاملی (متوفی: ۱۳۷۱ ہجری، دمشق) اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۲۲

[4] پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری (متوفی: ۱۹۸۸ء، پاکستان) اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۱۰۹

[5] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۱۹ بحوالہ: روضۃ الاحباب

چار ہوئے بلکہ اپنے کئی سردار بھی مروا بیٹھے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال یہودیوں کا بھی تھا۔ اُنہوں نے جب بھی بغاوت کیلئے سر اُٹھایا منہ کی کھائی، کبھی تحریری معاہدے کر کے جان بچائی اور کبھی ملک بدر ہو کر۔ پس قریش اور یہود دونوں نے اپنی اپنی جگہ یہ جان لیا تھا کہ ہم اکیلے مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لہٰذا ہمیں متحد ہو کر اور اسلام مخالف تمام اندرونی و بیرونی قوتوں کو یکجا کر کے مسلمانوں سے فیصلہ کن جنگ کرنا ہوگی۔ اسلام مخالف بیرونی قوتیں وہ تھیں جو کھلم کھلا اسلام کی دشمن تھیں یعنی مشرکینِ مکّہ اور وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدے میں شریک نہیں تھے اور اندرونی قوتیں وہ تھیں جو تحریری معاہدوں کے ذریعے مسلمانوں کی حلیف تو بن گئی تھیں لیکن در پردہ حریف تھیں۔ اُن میں یہود اور دیگر ایسے لوگ شامل تھے جو بظاہر غیر جانبدار تھے یا اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے لیکن حقیقت میں منافق تھے۔

اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کیلئے ایک طرف تو سرداران یہود حیَ بن اخطب، سلام بن ابی حقیق، سلام بن مشکم اور کنانہ بن ربیع وغیرہ مکّہ جا پہنچے اور مشرکینِ مکّہ کے ساتھ مل کر مدینہ پر اجتماعی چڑھائی کا منصوبہ بنایا تو دوسری طرف مشرکین کا سردار ابوسفیان تھا جو بہت خوش اور پُر جوش تھا۔[1] علامہ طبرسی کے بقول یہودی بنو کنانہ اور بنو غطفان کے پاس بھی گئے اور کہا کہ مسلمانوں کے خلاف قریش بھی ہمارے ساتھ ہیں لہٰذا تم بھی ہمارا ساتھ دو، اور وہ اس پر تیار ہو گئے۔[2] پس، مکّہ سے قریش کا لشکر لے کر ابوسفیان نکلا، قبیلہ غطفان کی قیادت عنیہ بن حصین بن فزارہ نے کی، بنی مرہ کو لے کر حارث بن عوف اور قبیلہ اشجع کے ساتھ دبرۃ بن طریف نے پیش قدمی کی۔ یہود کا کوئی لشکر اُن کے ساتھ نہیں تھا کیونکہ اُن کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ مدینہ کے اندر سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوں گے اور یوں مسلمان چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ جائیں گے۔[3] لشکرِ قریش میں ایک ہزار (۱۰۰۰) اُونٹ اور تین سو (۳۰۰) گھوڑے تھے۔ قبائلِ عرب اسلم، اشجع، ابومرہ، کنانہ، فرازہ اور غطفان بھی بڑی تعداد میں آ کر شامل ہوئے تھے۔ اس طرح اُن سب کی مجموعی تعداد دس ہزار (۱۰۰۰۰) ہو گئی تھی۔[4] جب کہ لشکرِ اسلام کی مجموعی تعداد تین ہزار (۳۰۰۰) تھی جن میں صرف

---

[1] ابن خلدون (متوفی: ۱۴۰۶ء، قاہرہ) تاریخ ابن خلدون، ج ۲ ص ۷۷۴
فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ

[2] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۸۵

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۱۹

چھتیس (۳۶) گھوڑے تھے۔

خندق:

اُدھر مشرکین نے مدینہ کی طرف کُوچ کیا اِدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی خبر ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ کی حکمت عملی تیار کرنا شروع کی۔ واقدی نے لکھا ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ دشمن کا رستہ روکنے کے لئے مدینہ کے گرد خندق کھودی جائے۔[۱] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ تجویز پسند آئی چنانچہ ایک گہری خندق تیار کی گئی۔[۲] کفّار کی فوجیں مدینہ کے قریب پہنچیں تو راہ میں حائل خندق کو دیکھ کر ششدر رہ گئیں۔ عربوں نے اس سے پہلے خندق نہیں دیکھی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں خندق پار کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ناکام ہوکر وہیں صف آرا ہوگئے۔ اب خندق کے ایک طرف مدینہ کی جانب مسلمان مورچہ بند تھے جبکہ دوسری طرف کفّار کا اتحادی لشکر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مورچہ بندی بیس دن سے زیادہ جاری رہی، اس دوران تیراندازی اور سنگ باری ہوتی رہی اور باقاعدہ جنگ کی نوبت نہ آئی۔[۳]

بنوقریظہ کی بغاوت:

یہودیوں کا ایک قبیلہ بنوقریظہ مدینہ کے اندر آباد تھا اور بظاہر مسلمانوں کے ساتھ اپنے دوستی کے معاہدے پر قائم تھا لیکن در پردہ اپنے ہم مذہب قبیلوں کے ساتھ مل چکا تھا۔ اس قبیلے میں ساڑھے سات سو (۷۵۰) جنگجو موجود تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جب اتحادی فوجیں مدینہ پہنچ کر سامنے سے حملہ آور ہوں گی تو یہ اندر سے حملہ کر دیں گے۔[۴] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی سازش معلوم ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعد بن معاذ انصاریؓ کی سربراہی میں ایک وفد اُن سے مذاکرات کے لئے بھیجا لیکن خلافِ توقع بنوقریظہ بہت توہین آمیز طریقے سے پیش آئے۔ چنانچہ یہ لوگ ناکام و دلبرداشتہ واپس آگئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی کمزور دِل اور ناپختہ ایمان رکھنے والے مسلمان جنگ کے خوف میں مبتلا ہوکر بوکھلا گئے۔ اُن کی آنکھیں پھر گئیں، کلیجے منہ کو

---

[۱] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی: ۸۲۲ء) المغازی للواقدی، ص ۴۴۵

[۲] مسٹر کے اے حمید، تاریخ مسلمانان عالم، ج ص ۷۹

[۳] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ

[۴] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی: ۸۲۲ء، بغداد) المغازی للواقدی، ص ۴۵۶

آنے لگے، حتیٰ کہ وہ اللہ عزوجل کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ یہ موقع سخت آزمائش اور تکلیف کا تھا۔ پس ارشادِ پروردگارِ عالم ہُوا: [1]

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝۱۱

(جب وہ تم پر اُوپر اور نیچے سے چڑھ آئے اور (خوف سے تمہاری) آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اُس وقت ایمان والوں کو خوب آزمایا گیا اور اُنہیں خوب جھنجھوڑا گیا۔)

واقدی لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے کہا، ''ہمیں اب سامنے والے دشمن قریش وغطفان وغیرہ سے زیادہ بنوقریظہ کا خوف لاحق تھا کیوں کہ ہمارے اہل وعیال جو مدینہ میں تھے اُن کے رحم وکرم پر تھے اس لئے میں سلع پہاڑی پر چڑھ کر مدینہ کے مکانوں پر نظر ڈالتا اور جب وہاں سکون پاتا تو خدا کا شکر ادا کرتا۔ [2]

کئی مسلمان خوفزدہ ہوکر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ وقت یہاں رُکنے کا نہیں لہٰذا واپس چلو۔ بنوحارثہ بن الحارث کے اوس بن قیظی نے اپنی قوم کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ ہمارے گھر دشمن کی زد میں ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ [3]

قرآن حکیم میں اس کا ذِکر یوں آیا ہے: [4]

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝۱۳

(اور وہ وقت یاد کرو جب اُن میں سے ایک گروہ کہنے لگا کہ اے یثرب والو! اب (یہاں) تمہارے ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے سو واپس چلو اور اُن میں سے ایک گروہ یہ کہہ کر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجازت مانگ رہا تھا کہ ہمارے گھر خالی (غیر محفوظ) ہیں حالانکہ وہ خالی (غیر محفوظ) نہیں تھے وہ تو صرف (محاذ سے) بھاگنا چاہتے

---

[1] سورۃ الاحزاب، آیت ۱۰ تا ۱۱

[2] محمد بن عمر بن واقدی (متوفی: ۸۲۳ء، بغداد) التاریخ وَ المغازی والمبعث، ص ۴۶۰

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۸۸

[4] سورۃ الاحزاب، آیت ۱۳

تھے۔) بقولے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی: [1] ''وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ○ (اور اپنے پروردگار پر توکل کرو بے شک اللہ تعالیٰ کارسازی کیلئے کافی ہے)۔ مدارج النبوّت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، [2] '' حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ○'' (ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بڑا اچھا کارساز ہے)

بغاوت کا تدارک:

بنوقریظہ کے ساتھ مذاکرات ناکام ہو چکے تھے، تلوار کی زبان میں بھی بات نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ وہ تو چاہتے ہی یہی تھے کہ مسلمانوں کو چکّی کے دونوں پاٹوں میں لاکر پیس دیا جائے، لہٰذا آگے کنواں پیچھے کھائی والی اُس صورت حال میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دانش اور تدبر پر دل بے اختیار سبحان اللہ پکار اُٹھتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی لشکر کو خندق پر چھوڑ کر خود تو کہیں جا نہیں سکتے تھے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمہ بن اسلم اشہلی ؓ کو دوسو آدمیوں کے ساتھ اور حضرت زید بن حارثہ ؓ کو تین سو آدمیوں کے ساتھ مقرر کیا کہ دو جانب سے مدینہ کے اندر صدائے تکبیر بلند کرتے ہوئے جایا کرو تا کہ گھروں میں موجود مسلمانوں کی ڈھارس بندھی رہے اور وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے رہیں اور دشمن بھی یہ جان لے کہ ہم غافل نہیں اور نہ کمزور ہی ہیں۔ یہ ایک ایسی تدبیر تھی جس نے مسلمانوں کو بھی حوصلہ دیا اور بنوقریظہ کی ہمت بھی پست کر دی اور اُنہیں اندر سے حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوسکی۔ [3]

مقابلہ:

مدینہ کے اندر سے اُٹھنے والی بنوقریظہ کی شورش کو تو اندر ہی اندر دبا لیا گیا تھا لیکن مشرکین کی فوجیں ہنوز خندق کے دوسری طرف موجود تھیں۔ اُن کے جنگجو اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح خندق پار کر کے مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں مگر اس میں اُنہیں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ اپنا غم وغصہ تیر اندازی اور سنگ باری کر کے نکال رہے تھے اور مسلمان بھی اُسی طریقے پر عمل پیرا تھے۔ پھر اُن کے کچھ سورما کسی نہ کسی

---

[1] سورۃ الاحزاب، آیت ۳

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۲

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۹۳
محمد بن عمر بن واقدی (متوفی: ۸۲۳ء، بغداد) التاریخ وَ المغَازِی والمَبْعث، ص ۴۶۰

طرح خندق پار کر کے مسلمانوں کے سر پر آ پہنچے جو انفرادی مقابلوں میں علی علیہ السلام کے ہاتھوں فی النار ہو گئے۔ مشہور مؤرّخ مسٹر کے اے حمید (بیرسٹر ایٹ لاء، لاہور) لکھتے ہیں، ''بیس دن تک دشمنوں نے مدینہ کا محاصرہ رکھا لیکن باوجود انتہائی کوشش کے وہ شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ فرداً فرداً لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں کبھی کفّار کامیاب ہوتے کبھی مسلمان۔ حضرت علی علیہ السلام نے مردانگی کے وہ جوہر دکھائے کہ قریش دنگ رہ گئے۔''[1] شاہ عبدالحق محدث دہلوی رقمطراز ہیں، ''حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے اس غزوے میں ایسا مقابلہ و مقاتلہ کیا جو عقل و فہم کی حدود سے ماوراء ہے جیسا کہ احادیث میں وارد ہُوا: لَمُبَارَزَةُ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ اَعْمَالِ اُمَّتِيْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ○ (حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا خندق کے دن مقابلہ کرنا میری اُمت کے قیامت تک کے اعمال سے افضل ہے)۔ ایسا ہی روضة الاحباب میں بھی مذکور ہے۔''[2]

ابن الوردی لکھتے ہیں، ''مشرکین نے بیس شب و روز سے زیادہ قیام کیا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے مقابلے پر جمے رہے اور اُن کے درمیان اس عرصہ میں کوئی جنگ نہ ہوئی سوائے تیر اندازی کے، پھر عمر بن عبدود میدان میں نکلا۔''[3] ابنِ خلدون نے تحریر کیا ہے، ''مسلمان ایک مہینے کے قریب محصور رہے اور کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی اور اس سلسلے نے طول کھینچا یہاں تک کہ کچھ شہسوار قریش کے خندق کے اس طرف آ گئے جن میں عکرمہ بن ابی جہل اور عمرو بن عبدود (وغیرہ) تھے۔[4] حافظ ذہبی نے اپنی کتاب ''العبر فی خبر من غبر'' میں لکھا ہے، ''اس معرکے میں بس تیر اندازی ہوتی رہی اور قوتِ برداشت کا مقابلہ بیس دن سے زیادہ رہا اور پھر جنگ کرنے کے لئے عمرو بن عبدوَد نکلا۔[5]

عمرو بن عبدوَد:

عمرو بن عبدوَد ہی وہ واحد سُورما تھا جس سے قریش کی ساری اُمیدیں وابستہ تھیں کیونکہ اس سے

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۹۳ بحوالہ: مسٹر کے اے حمید، تاریخ مسلمانان عالم

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۳۳، ۲۳۴ بحوالہ: روضۃ الاحباب

[3] ابن الوردی (متوفی: ۷۴۹ھ ۱۳۴۹ء، حلب) تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۲۲

[4] ابنِ خلدون (متوفی: ۱۴۰۶ء، قاہرہ) تاریخ ابنِ خلدون، ج ۲ ص ۷۷۵

[5] حافظ شمس الدین ذہبی (متوفی: ۱۳۴۸ء، دمشق) العبر فی خبر من غبر، مطبع کویت، ج ۱ ص ۷

پہلے ہونے والی دو بڑی جنگوں، بدر اور اُحد میں اُن کے تمام چوٹی کے سردار اور جنگجو مارے جا چکے تھے۔ عمرو بن عبدود عامری بن ابی قیس، عامر بن لوی بن غالب کی نسل سے تھا۔ وہ جنگ بدر میں شدید زخمی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اُحد میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔ اب خندق میں بہت جوش و خروش سے آیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ممتاز سمجھتا تھا اسی لئے اُس نے اپنے سر پر ایک امتیازی پٹی باندھ رکھی تھی۔[1] وہ بلا کا طاقتور اور بہادر آدمی تھا۔ راتوں کو بھی خندق کے پاس آ کر اپنی دلیری اور طاقت کا مظاہرہ کیا کرتا اور بیچ میں خندق حائل ہونے کے باوجود کئی مسلمان اُسے دیکھ کر دہل جاتے، اُن میں ایک طلاطم بپا ہو جاتا کہ عمرو بن عبدود آ گیا اور وہ گھبرا کر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمے کی طرف بھاگتے اور اکثر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نیند سے جگا دیتے، تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کی ڈھارس کے لئے بلا وجہ شبِ تار میں خندق کے پاس تشریف لانے کی زحمت گوارا کرنا پڑتی۔[2]

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ عمرو بن عبدود مسلسل اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح خندق پار کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ وہ خندق کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا اور عقابی نگاہوں سے جائزہ لیتا۔ آخر کار اُس نے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کر لیا جسے پار کرنا کسی عام شخص کے لئے تو بظاہر ممکن نہیں تھا مگر اُسے اپنی طاقت، جرأت اور شہسواری پر ایسا ناز تھا کہ اُس نے وہاں سے اپنے گھوڑے کے ذریعے جست لگا کر خندق پار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں کہ عکرمہ بن ابی جہل مخزومی، قبیلہ بنی محارب کا ضرار بن خطاب، ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی اور نوفل بن عبداللہ جیسے پہلوان بھی اُس کے ساتھ ہو لیے تھے۔ پس، جنگ کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانے کا فیصلہ کر کے پہلوانوں کا یہ دستہ مسلح ہو کر اپنے گھوڑوں پر نکلا اور بنو کنانہ کے پاس آ کر کہا، ''لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ، آج تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ جواں مرد کون ہے؟'' پھر وہ اُس جگہ پہنچے جہاں سے اُنہوں نے خندق پار کرنا تھی۔ اُنہوں نے اپنے گھوڑوں کو چابک مارے تو عربی گھوڑے جست لگا کر خندق کے پار پہنچ گئے۔ علی بن ابی طالب علیہ السلام چند مسلمانوں کے ساتھ مقابلے پر نکلے اور خندق کا وہ حصّہ جہاں سے وہ کود کر آئے تھے اپنے قبضے میں لے کر اُن کی واپسی کا راستہ مسدود کر دیا۔[3]

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ ص ۲۱۸

[2] ابو عبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی: ۸۲۲ء، بغداد) التاریخ وَ المغَازِی والمَبْعث

[3] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ ص ۲۱۷، ۲۱۸

نامور مؤرّخ اور عالم دین جناب علی نقی نقوی نقن اپنی تالیف ''تاریخ اسلام'' میں لکھتے ہیں، ''ظاہری حیثیت سے دیکھا جائے تو بہادری کے جوش میں اُنہوں نے یہ انتہائی حماقت کا کام کیا تھا۔ اس طرح وہ گنتی کے آدمی اپنی پوری فوج سے کٹ کر الگ ہو گئے تھے کیونکہ وہاں کوئی تختے تو ایسے موجود نہ تھے جنہیں وہ خندق پر پُل کر طرح رکھ کر اپنی پوری فوج کو اُن پر سے گذار سکتے۔ اُس طرف وہ صرف چار پانچ آدمی ہی تھے اور اِدھر مسلمانوں کا پورا لشکر تھا۔ اگر یہ سب مسلمان نہتے ہی دوڑ پڑتے تو دو چار سپاہیوں کو پیس ڈالنے کے لئے ان کی یورش ہی کافی ہو سکتی تھی مگر کیا کیا جائے کہ اس پوری فوج پر اُس اکیلے عمرو بن عبدوَد کی ہیبت بُری طرح چھائی ہوئی تھی جس میں اُس کی اس حیرت انگیز غیر معمولی جرأت نے (کہ اُس نے خندق کو پار کر لیا تھا) اُس وقت خاص طور پر اضافہ کر دیا تھا اس لئے پوری مسلم فوج ہکّا بکّا ہو کر اُسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے سُن ہو گئی ہو۔ اُس وقت اُن کا عالم جو تھا، اُس کی مرقع کشی کے لئے تاریخ کے یہ الفاظ کافی ہیں، ''تمام اصحاب یوں بے حس و حرکت تھے جیسے اُن کے سروں پر طائر بیٹھے ہوئے ہوں۔''[1]

اسد اللہ کی جنگ:

مؤرّخین کی روایات کا بنظرِ غائر جائزہ لینے کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ معرکۂ خندق صرف ایک فردِ واحد کے کارنامے کا ہی نام ہے جسے اسد اللہ کہتے ہیں۔ یہ جنگ، علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کے کارنامے سے شروع ہوئی اور اُسی پر ختم ہو گئی۔ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ جب عمرو بن عبدوَد اپنے ساتھی پہلوانوں کے ساتھ خندق پار کر کے آ گیا تو اُس نے مسلمانوں کو للکارا۔ اُس کی للکار سُن کر مسلمان سہم گئے۔ حضرت علی علیہ السلام اُس وقت نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں موجود تھے، اُس کی للکار سُنی تو فوراً کہا، ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اس کا مقابلہ کروں گا۔'' رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معنی خیز انداز میں فرمایا، ''علی! بیٹھ جاؤ، کیا تم جانتے نہیں کہ وہ عمرو بن عبدوَد ہے؟'' نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد علی علیہ السلام کو عمرو بن عبدوَد سے جنگ کرنے سے باز رکھنا تھا؟ یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سمجھتے تھے کہ نوجوان

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۹۹
بحوالہ حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۸۹۲ھ، مکہ)، تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۴۸۶

علی علیہ السلام اُس طاقتور پہلوان کو زیر نہیں کر سکیں گے؟ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ علی علیہ السلام نے آغوشِ رِسالت میں پرورش پائی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بھائی کو خوب اچھی طرح جانتے تھے اور اُس کا اندازِ شجاعت اور فنِ حرب بارہا ملاحظہ فرما چکے تھے۔ بدر اور اُحد میں زورِ بازوئے حیدر کا مظاہرہ تو ابھی کل کی بات تھی۔ پھر وہ کیا وجہ تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، کیا تم نہیں جانتے کہ وہ عمرو بن عبدوَد ہے؟ محققین کہتے ہیں کہ اس انداز میں علی علیہ السلام کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیٹھنے کو کہنا اس لئے نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی علیہ السلام کو اُس کے بارے میں متنبّہ کرنا چاہتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح دوسرے مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دینا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے، علی علیہ السلام میدان میں آتے تو اُس کا خاتمہ کر دیتے۔ پھر عمرو کے مارے جانے کے بعد کوئی یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ علی (علیہ السلام) نے جلد بازی سے کام لیا، عمرو کے مقابلے میں جانے کا ارادہ تو میرا تھا۔ پس، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار نہیں، تین بار ایسا کیا، ہمارا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو بھرپور طریقے سے آزما رہے تھے۔ علامہ علی نقی نقوی لکھتے ہیں کہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے مسلمانوں کو بھی موقع دینا چاہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بھی معلوم تھا کہ عمرو بن عبدوَد سے متعلق ''جہاندیدہ'' اور ''تجربہ کار'' اصحاب کے کیا تاثرات ہیں اور کیسے کیسے مشاہدات دُہرائے جا رہے ہیں جس سے تمام فوجِ اسلام کے لئے وہ ایک بہت بڑا ''ہوّا'' بن گیا ہے۔ ہوسکتا تھا اُس وقت کسی کو یہ گمان بھی ہو کہ علی علیہ السلام کمسن ہیں اور اس کمسنی کی بنا پر عمرو بن عبدوَد کی شخصیت سے واقف نہیں ہیں لہٰذا انہوں نے نوجوانی کے الھڑپن میں بنا سوچے سمجھے یہ بات کہہ دی کہ میں اُس کا مقابلہ کروں گا۔ پس اُن تمام حالی تصورات اور امکانی خیالات کے پیشِ نظر پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معنی خیز انداز میں علی علیہ السلام سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، کیا تم جانتے نہیں کہ وہ عمرو بن عبدوَد ہے؟[1] مسلمانوں پر چھائے ہوئے گہرے سکوت سے ابنِ وَدکا حوصلہ بڑھا اور للکار کر کہنے لگا، ''کہاں ہے وہ تمہاری جنت جس سے متعلق تم کہتے ہو کہ تمہارا شہید اُس میں داخل ہوگا؟ اب کسی کو میری طرف بھیجتے کیوں نہیں؟'' (تاکہ میں اُسے اُس جنّت میں پہنچاؤں)

علی علیہ السلام اُس کی للکار سُن کر پھر اُٹھے لیکن نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ ارشاد فرمایا، ''علی! بیٹھ جاؤ، جانتے

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۰۰

نہیں کہ وہ عمرو بن عبدوَد ہے؟'' مسلمانوں کے لشکر میں پھر سناٹا چھا گیا۔ عمرو نے تیسری مرتبہ پھر مبارَزت طلب کی۔ علی علیہ السلام بے قرار ہو کر پھر اُٹھے، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر وہی جملہ ارشاد فرمایا تو علی علیہ السلام سے نہ رہا گیا۔ بے ساختہ کہا،'' وہ عمرو بن عبدود ہے تو ہُوا کرے۔'' (مجھے اُس سے کیا خوف؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی چاہتے تھے یعنی تین مرتبہ علی علیہ السلام کو روک کر دوسروں کو موقع دیا اور جب کوئی آگے نہ بڑھا تو مردِ میدان علی علیہ السلام کو اجازت دے دی۔ تاریخ خمیس میں ہے،'' جو مقصد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُس تَوَقُّف سے تھا وہ حاصل ہو چکا تھا پس پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں اجازت دی۔''[1]

رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو صرف اذنِ جہاد ہی نہیں دیا بلکہ اپنے دستِ مبارک سے جنگ کے لئے تیار بھی کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو اپنی تلوار عطا فرمائی، اپنی زِرّہ پہنائی اور اپنا عمامہ اُن کے سر پر رکھ کر دُعائے خیر فرمائی۔ تاریخ خمیس میں ہے،'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب علی علیہ السلام کو اجازت مرحمت فرمائی تو اُنہیں اپنی تلوار دی، اپنی خاص زِرّہ پہنائی، اپنا عمامہ اُن کے سر پر رکھا اور فرمایا میرے اللہ! اُس کے مقابلے میں اِس کی مدد فرما۔ اور روایت ہے کہ اپنا عمامہ آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا، ''رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ○'' اور پھر فرمایا،'' میرے اللہ! تُو نے روزِ بدر عبیدہ کو مجھ سے لے لیا اور روزِ اُحد حمزہ کو مجھ سے لے لیا، اب یہ ایک علی ہی ہے جو میرا بھائی اور میرے چچا کا فرزند ہے، اب تُو مجھے (اِس) وارث کے بغیر تنہا نہ چھوڑ نا کیونکہ تُو خود بہترین وارث ہے۔''[2] قرآن حکیم کے مطابق یہ کلمات ''رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ○'' حضرت زکریا علیہ السلام سے منسوب ہیں جیسا کہ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:[3] اور اب رسولِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رب کے حضور وہی کلمات عرض کر رہے ہیں یعنی اے میرے پروردگار! مجھے وارث کے بغیر اکیلا نہ چھوڑ جبکہ تُو خود بہترین وارث ہے۔ تو نبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِن کلمات سے اور اپنا عمامہ مبارک حضرت علی علیہ السلام کے سر پر رکھنے سے ایک طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا وارث صرف اور صرف علی علیہ السلام ہی کو قرار دیا اور باقی تمام مسلمانوں اور صحابہ کرامؓ میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وارث کوئی اور نہیں تھا اور دوسری طرف یہ پتا چلتا ہے کہ

---

[1] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۹۸۲ ہجری، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۲۸۶

[2] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۹۸۲ ہجری، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۴۷۷

[3] سورۃ الانبیاء، آیت ۸۹، ۹۰

نبی گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اکلوتے وارث کو راہِ خدا میں روانہ کرنے کے بعد اپنا حامی و مددگار صرف خدائے یکتا کو ہی سمجھ رہے تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زِرّہ اور عمامہ زیب تن کر کے اور ذوالفقار کو ہاتھ میں لے کر حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے قدم بڑھایا۔ طبری نے لکھا ہے کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام آگے بڑھے تو کچھ اور مسلمان فوجی بھی آپ کے ساتھ ہو لیے۔ آپ نے اُن لوگوں کو اُس تنگ راستے پر کھڑا کر دیا جہاں سے عمرو بن عبدوَد اور اُس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے تھے۔ [1] جناب امیر المومنین علیہ السلام عمرو کے رُوبرو آئے تو وہ اپنے مدِ مقابل ایک نوجوان کو دیکھ کر سخت متعجب ہُوا اور حیران ہو کر پوچھا، ''اے نوجوان! تم کون ہو؟'' عمرو کی حیرانی بجا تھی، کہاں تو یہ عالم تھا کہ تین مرتبہ مبارزت طلب کرنے کے باوجود کوئی سامنے نہیں آیا تھا اور کہاں یہ حال کہ مکّہ کے نام نہاد سُورما اور ناقابلِ تسخیر سمجھے جانے والے دیوہیکل پہلوان کے مقابلے پر ایک نوجوان؟

شیرِ خدا علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اُس کی متعجب آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُرجلال لہجے میں جواب دیا، ''میں علی ہوں۔''

عمرو نے پوچھا، ''کیا عبدِ مناف کی نسل سے؟''

کہا، ''ہاں! میں علی بن ابی طالب (علیہ السلام) ہوں۔''

وہ کہنے لگا، ''بھتیجے! تمہارے چچاؤں میں سے جو تم سے زیادہ بڑا ہو اُسے میرے مقابلے پر بھیجو مجھے تمہارا خون بہانے میں ناگواری محسوس ہوتی ہے۔'' عمرو کا حضرت علی علیہ السلام کو ''بھتیجے'' کہہ کر مخاطب کرنا اور بڑوں کو مقابلے پر بلانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ آپ کو ایک بچّہ سمجھ رہا تھا۔

آپ نے سرد لہجے میں فرمایا، ''بخدا! مجھے تیرا خون بہانے میں کوئی ناگواری محسوس نہیں ہوگی۔''

ایسا خشک جواب سُن کر وہ تلملا اُٹھا اور تلوار کھینچ لی جو آگ کا شعلہ معلوم ہوتی تھی۔ [2]

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ اُس نے تلوار نکالی اور غصے میں اپنے گھوڑے کے پیروں پر ماری تو اُس کے چاروں پاؤں کٹ گئے۔ پھر وہ آپ کی طرف بڑھا۔ [3]

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ ص ۲۱۷، ۲۱۸

[2] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۹۸۲ ہجری، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۴۸۴

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۰۳ بحوالہ: ابن الوردی اسماعیل ابوالفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابوالفداء، ج ۱ ص ۱۸۰

علی علیہ السلام نے اُس سے فرمایا کہ تم نے عہد کر رکھا ہے کہ تمہارا مقابل تمہارے سامنے کوئی سی دو (اور بروایتے تین) خواہشات پیش کرے گا تو تم اُن میں سے ایک ضرور پوری کرو گے۔''

اُس نے کہا، ''بے شک ایسا ہی ہے۔''

آپ نے فرمایا، ''میری پہلی خواہش یہ ہے کہ تم اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آؤ۔''

عمرو کہنے لگا، ''مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، دوسری خواہش بیان کرو۔''

دیار بکری روایت کرتے ہیں کہ علی علیہ السلام نے فرمایا، ''دوسری یہ ہے تم واپس چلے جاؤ اور اپنے گھر میں جا بیٹھو۔''

اُس نے کہا، ''بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ عرب کی عورتیں مجھ پر طعنہ زنی کریں گی کہ میں میدان چھوڑ کر بھاگ آیا۔''

آپ نے کہا، ''پھر آگے بڑھو، اور مجھ سے مقابلہ کرو۔''

تاریخ خمیس میں جو مکالمے درج ہیں، اُن کے مطابق اس مقام پر اُس نے کہا، ''تمہیں قتل کرنا مجھے پسند نہیں۔''

تو علی علیہ السلام نے کہا، ''لیکن تمہیں قتل کرنا مجھے پسند ہے۔'' یہ سُن کر وہ جوش میں آیا اور اپنے گھوڑے سے کود پڑا۔ اُس نے تلوار سے گھوڑے کے پاؤں قطع کیے پھر اُس کے مُنہ پر وار کیا اور آخر میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف بڑھا۔ [1]

طبری نے لکھا ہے، ''علی علیہ السلام نے اُس سے کہا، ''اے عمرو! تم ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر قریش کا کوئی شخص میرے سامنے دو باتیں پیش کرے گا تو میں اُن میں سے ایک ضرور مانوں گا۔'' اُس نے کہا، ''ہاں میرا یہی عہد ہے۔'' علی علیہ السلام نے کہا، ''اچھا تو پھر میں تم کو اللہ عزوجل، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔''

اُس نے کہا، ''میں نہیں مانتا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

علی علیہ السلام نے کہا، ''تو پھر میں تم سے کہتا ہوں کہ گھوڑے سے نیچے آؤ۔''

اُس نے کہا، ''اے میرے بھتیجے یہ کیوں؟ بخدا میں نہیں چاہتا کہ تم کو قتل کروں۔''

علی علیہ السلام نے کہا، ''بخدا میں تو چاہتا ہوں کہ تم کو ضرور قتل کروں۔''

یہ سُن کر اُسے جوش آ گیا۔ وہ گھوڑے سے کود پڑا، اُس کو ذبح کر دیا یا اُس کے منہ پر تلوار ماری اور پھر

---

[1] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۸۹۲ ہجری، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۴۸۷

علی علیہ السلام کے مقابل آ گیا۔''[1]

دونوں اطراف کی فوجوں نے دیکھا کہ میدانِ جنگ سے گرد و غبار بُلند ہُوا۔ لوہے آپس میں ٹکرائے، دُھول کے کچھ اور بادل آسمان کی طرف اُٹھے، کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ یکا یک اُس گرد میں سے تکبیر کی صدا بلند ہوئی اور غبار آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ لوگوں نے دیکھا کہ فاتحِ بدر و اُحد ایک اور جنگ فتح کر چکا تھا۔ حیدر کرار علیہ السلام نے عمرو بن عبدوَد کا سر تن سے جُدا کر دیا تھا۔

ابن الوردی کے مطابق، ''دونوں نے باہم جنگ کی اور جولانی کرتے رہے۔ دونوں پر غبار چھا گیا اور مسلمانوں نے تکبیر کی آواز سُنی تو سمجھے کہ علی علیہ السلام نے اُسے قتل کر دیا اور غبار ہٹا تو یہ نظر آیا کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام اُس کے سینے پر سوار اُس کا سر تن سے جُدا کر رہے تھے۔''[2]

ابنِ خلدون کہتے ہیں، ''علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام نے عمرو بن عبدوَد کو قتل کر دیا۔''[3]

علامہ طبرسی لکھتے ہیں، ''حضرت علی علیہ السلام نے اُس کے مقابلے میں نکل کر اُسے قتل کر دیا۔''[4]

شیخ حسین بن محمد حسن دیار بکری لکھتے ہیں، ''سابق گفتگو ختم ہونے کے بعد اُس نے حضرت علی علیہ السلام کی جانب رُخ کیا تو آپ سپر لیے ہوئے اُس کے مقابلے پر آئے مگر اُس نے تلوار کا ایسا وار کیا جو سپر کو کاٹتی ہوئی آپ کے سر تک پہنچ گئی اور آپ زخمی ہو گئے۔ پھر آپ نے اُس پر وار کیا۔ آپ کی تلوار اُس کے کاندھے پر پڑی جس سے وہ گر گیا۔ پھر غبار بلند ہُوا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر سنی تو سمجھے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اُس کو قتل کر دیا ہے۔''[5]

تاریخ گواہ ہے کہ علی علیہ السلام کے مقابلے میں کبھی کوئی نہیں ٹھہر سکا۔ علی علیہ السلام کی ایک ہی ضرب مقابل کا قِصّہ تمام کر دیا کرتی تھی۔ اس کی تائید آپ کی ضرب کی اُس خصوصیت سے ہوتی ہے جو اکثر مؤرّخین نے لکھی ہے کہ آپ کی تلوار کی ضربیں یکتا ہُوا کرتی تھیں، جب آپ سر پر وار کرتے تو لمبائی

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۱۸

[2] ابن الوردی (متوفی: ۷۴۹ھ، حلب) تاریخ ابن الوردی، ج ۲ ص ۱۲۲

ابو الفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابو الفداء، ج ۱ ص ۱۴۲

[3] ابنِ خلدون (متوفی: ۱۴۰۶ء، قاہرہ) تاریخ ابنِ خلدون، ج ۲ ص ۷۷۵

[4] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۰۲

بحوالہ: فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ

[5] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء) تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۴۸۴

میں (یعنی اُوپر سے نیچے) کاٹ دیتے اور جب پہلو پر وار کرتے تو عرض میں دو ٹکڑے کر دیتے تھے۔ [1]

عمرو بن عبدوَد اب تک کے مقابلوں میں وہ واحد فرد تھا جو علی علیہ السلام کے سامنے کچھ دیر ٹکا۔ مقابلہ کیا جبھی دھُول کے بادل پیدا ہوئے اور وہ بھی ایسے کہ دیکھنے والوں کو لڑائی کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا، بس صدائے تکبیر سے اندازہ لگایا کہ علی علیہ السلام نے عمرو کا کام تمام کر دیا ہے۔

عربوں میں رواج تھا کہ جنگوں میں جب کوئی کسی کو قتل کرتا تو اُس کے قیمتی لباس یعنی زِرّہ وغیرہ پر اپنا حق سمجھتے ہوئے اُسے اُتار کر اپنے قبضے میں لے لیتا۔ محمد و آل محمد علیہم السلام نے کبھی اس رواج کو نہیں اپنایا اور اسے اپنی شان کے منافی سمجھتے ہوئے ہمیشہ اس عمل سے اجتناب فرمایا۔ عمرو بن عبدوَد اپنی شخصیت کی مناسبت سے نہایت قیمتی زِرّہ پہنے ہوئے تھا لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اُسے قتل کرنے کے بعد اُس کی زِرّہ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور اُسے یونہی چھوڑ کر چلے آئے۔ تاریخ میں ہے کہ جنگ کے بعد اُس کی بہن اُس کی نعش پر پہنچی تو اُس کے جسم پر لباس اور قیمتی زِرّہ موجود پا کر حیران رہ گئی۔ کہنے لگی کہ لگتا ہے اسے کسی شریف و کریم شخص نے قتل کیا ہے۔ پھر اُس نے قاتل کا نام پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اسے علی بن ابی طالب علیہ السلام نے قتل کیا ہے۔ یہ سُن کر بولی:

لو کان قاتل عمرو غیر قاتلہ ○ لکنت ابکی علیہ آخر الابد ○

لکن قاتلہ من لا یعاب بہ ○ من کان یدعی قدیما بیضۃ البلد ○ [2]

(اگر اس قاتل کے علاہ عمرو کا قاتل کوئی اور ہوتا تو میں ہمیشہ رویا کرتی مگر اس کا قاتل تو وہ ہے جس کے ہاتھوں مرنا کوئی عیب نہیں، کیونکہ وہ تو ہمیشہ سے شہر کا ممتاز آدمی سمجھا جاتا رہا ہے۔)

بعض مؤرّخین نے کچھ اضافے کے ساتھ یہ اشعار عمرو بن عبدوَد کی ماں سے منسوب کیے ہیں۔ [3]

عمرو بن عبدوَد کے ساتھی:

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عمرو بن عبدوَد کے ساتھ عکرمہ بن ابوجہل مخزومی، قبیلہ بنی محارب کا ضرار بن

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۰۵

[2] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۴۸۸

[3] ابنِ صباغ مالکی (متوفی: ۸۵۵ ھجری، یروشلم) الفصول المھمّہ فی معرفۃ احوال الائمہ، ص ۵۰

خطاب، ہبیرہ بن ابووہب مخزومی اور نوفل بن عبداللہ جیسے پہلوان بھی اُس کے ساتھ ہو لیے تھے۔ اُنہوں نے علی علیہ السلام کے ہاتھوں اپنے سب سے بڑے پہلوان کا یہ انجام دیکھا تو راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی اور خندق کے اُس تنگ حصّے کو جہاں سے وہ آئے تھے گھوڑوں کے ذریعے پھلانگ کر واپس پہنچ گئے۔[1] ابنِ خلدون کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خندق کے اُس حصّے پر علی علیہ السلام نے جن لوگوں کو مامور کیا تھا وہ اُن بھاگتے ہوئے لوگوں کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے یا اُنہوں نے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ علی علیہ السلام نے خود بھی اُن کا پیچھا نہیں کیا جیسا کہ تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ آپ بھاگنے والوں کا تعاقب کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ علامہ دیار بکری لکھتے ہیں کہ عمرو کے قتل کے بعد ضرار بن خطاب اور ہبیرہ بن ابی وہب نے مل کر حضرت علی علیہ السلام پر حملہ کر دیا۔ جب آپ اُن دونوں کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ بھاگ گئے۔[2]

علی علیہ السلام کے ہاتھوں ایک اور پہلوان کا قتل:

ابنِ خلدون نے تو لکھ دیا کہ عمرو کے باقی ساتھی فرار ہو کر خندق کے پار واپس پہنچ گئے لیکن طبری کے بقول عمرو کے ساتھ دو اور آدمی بھی قتل ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک منبہ بن عثمان بن عبید بن سباق بن عبدار تھا جسے ایک تیر لگا تھا جس سے وہ زخمی ہُوا لیکن جانبر نہ ہو سکا اور مکّہ پہنچ کر ہلاک ہو گیا اور دوسرا بنی مخزوم کا نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ تھا۔ نوفل بن عبداللہ واپسی پر خندق پار کرتے ہوئے اُس میں گر گیا تھا یا بقولے اُس میں کود پڑا تھا۔ بلندی سے گرنے کی وجہ سے وہ زخمی ہو گیا، مسلمانوں نے اُسے خندق میں پڑے دیکھا تو اُس پر پتھر برسانے لگے۔ زمانۂ قدیم میں رواج تھا، جو آج بھی جنگلوں اور بیابانوں میں رہنے والے چند قبیلوں میں پایا جاتا ہے، کہ جانوروں کا شکار کرنے کے لئے زمین میں ایک گڑھا کھود دیتے ہیں جس میں سے نکلنا جانور کے لئے ممکن نہیں ہوتا تھا۔ جب کوئی جانور اتفاق سے اُس میں جا گرتا تو لوگ اُسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا کرتے تھے۔ اُن جانوروں کی طرح مارے جانے پر نوفل نے احتجاج کرتے ہوئے کہا، ''اے قومِ عرب کے سپوتو! قتل ہی کرنا ہے تو اس سے بہتر طریقے سے کرو۔'' طبری نے لکھا ہے کہ پھر علی علیہ السلام خندق

---

[1] ابنِ خلدون (متوفی: ۱۴۰۶ء، قاہرہ) تاریخ ابنِ خلدون، ج ۲ ص ۵۷۵

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۰۸

میں اُترے اور اُسے تلوار سے قتل کیا۔ [1]

مشرکین کی خفت:

عمرو بن عبدود اور اُس کے ساتھیوں کے قتل اور فرار سے مشرکین کے لشکر پر سخت مایوسی، بے چینی اور جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔ علی علیہ السلام کے ہاتھوں اُن کا غرور خاک میں مل چکا تھا اور ناپاک ارادوں پر پانی پھر گیا تھا۔ اپنی خفت مٹانے کی غرض سے یا پھر اس خوف سے کہ کہیں مسلمان خندق عبور کر کے اُن کے سر پر نہ پہنچ جائیں، اُنہوں نے اجتماعی تیراندازی شروع کر دی۔ [2] تیراندازی مسلسل جاری تھی جو رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ادھر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد خوفزادہ اور ہراساں تھی۔ اُن کے خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اللہ عزوجل کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں دھوکا دیا اور اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اس کا ذکر قرآن پاک نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾

(اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے کہ اللہ (عزوجل) اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے (فتح کا) جو وعدہ کیا تھا وہ دھوکے کے سوا کچھ نہیں تھا۔) [3]

منافقوں کی ایسی گفتگو سُن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت کوفت ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خالق و مددگار کی بارگاہ میں دُعا فرمائی، ''اے میرے اللہ! تُو قرآن نازل کرنے والا ہے اور جلد حساب لینے والا ہے، اِن قبیلوں کو شکست دے اور اِن کے قدم لڑکھڑا دے اور اِن پر ہماری نصرت فرما۔'' حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خندق کی جنگ کے آخری تین دنوں میں ظہر و عصر (کی نمازوں) کے درمیان مسجد فتح میں مسلسل دُعا مانگی۔

پس، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُعا قبول ہوئی اور حق تعالیٰ جل جلالہ نے ایسی آندھی اور زلزلہ بھیجا کہ کفّار کا لشکر تہس نہس ہوگیا، اُن کے خیمے اُکھڑ گئے، چہرے خاک آلودہ ہوگئے، سنگریزوں کی بارش ہونے لگی اور وہ حواس باختہ ہوگئے۔ بروایتے خداوند متعال نے فرشتوں کی ایک جماعت بھیجی جنہوں نے اُن کے خیموں کی طنابیں کاٹ

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصہ اوّل، ص ۲۱۸

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۴

[3] سورۃ الاحزاب، آیت ۱۲

کر آگ لگادی اور اُن کو ایسا خوفزدہ کیا کہ وہ فرار پر مجبور ہو گئے۔[1] اس کا ذِکر قرآن کریم میں اللہ جل جلالہ نے یوں فرمایا ہے:

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا ۚ﴿۹﴾

(اے ایمان والو! اللہ کے اُس احسان کو یاد کرو جو اُس نے تم پر کیا ہے جب (کفّار کے) لشکر تم پر چڑھ آئے اور ہم نے (تمہاری مدد کیلئے) اُن پر ہوا (آندھی) بھیجی اور (فرشتوں کے) ایسے لشکر بھیجے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے۔ اللہ اُسے خوب دیکھ رہا تھا۔)''[2]

اور دوسری جگہ فرمایا:

'' وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِغَیْظِهِمْ لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا ؕ وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِیًّا عَزِیْزًا ۚ﴿۲۵﴾

(اور اللہ نے کافروں کو غم و غصہ کی حالت میں (بے نیل مُرام) لوٹایا کہ وہ کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے اور اللہ نے مؤمنوں کو جنگ (کی زحمت) سے بچا لیا اور اللہ بڑا طاقتور (اور) غالب ہے۔)''[3]

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○



---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۱۳
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۶

[2] سورۃ الاحزاب، آیت ۹

[3] سورۃ الاحزاب، آیت ۲۵

غزوۂ بنو قریظہ

(ذیقعد ۵ ہجری/ مارچ ۶۲۷ء)

یہ غزوہ، غزوۂ خندق کے فوراً بعد ہی ذیقعد ۵ ہجری، مارچ ۶۲۷ء کو واقع ہُوا۔ بعض مؤرّخین اِس کا مہینہ ذی الحجہ ۵ ہجری لکھتے ہیں [۱] لیکن تاریخ کی مستند کتب ذیقعد ہی بتاتی ہیں۔ [۲]

بنو قریظہ یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو بنو نضیر کی طرح بہت بڑا اور طاقتور تھا، اُنہی کی نسبت سے اِس کو غزوۂ بنو قریظہ کہا جاتا ہے۔ بنو قریظہ کی عہد شکنی اور بغاوت کا کچھ ذِکر گزشتہ صفحات پر غزوۂ خندق کے باب میں ہو چکا ہے۔ جنگِ خندق کے نازک موقع پر اُن کی عہد شکنی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مشرکین خندق میں شکست کھا کر واپس ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ پہنچتے ہی بنو قریظہ کے قلعے کی طرف کُوچ کا حکم صادر فرما دیا۔ [۳] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابنِ اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا عامل مقرر فرمایا، لشکر کا علم حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا اور اُن کو مقدمۃ الجیش پر مقرر فرمایا پھر تین ہزار مجاہدینِ اسلام کے ساتھ بنو قریظہ کی طرف پیش قدمی فرمائی۔ [۴] طبری نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی بن ابی طالب علیہ السلام کو علم دے کر خود سے پہلے بنو قریظہ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ [۵]

حضرت علی علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ بنو قریظہ کے قلعے کے سامنے پہنچے تو اُنہوں نے قلعے کے اُوپر سے آپ کو دیکھ کر گالیاں بکنا شروع کر دیں اور نہ صرف آپ کی بلکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بھی طرح طرح کے رکیک الفاظ کہے۔ اس جاہلانہ حرکت پر آپ خاموش رہے اور پیچھے تشریف لائے جہاں رسول

---

[۱] مولوی عبد الباری، دعوت دہلی، سیرت طیبہ، ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ، ص ۱۸۳

[۲] ابو الفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابو الفداء، ج ۱ ص ۱۴۳
سید محسن امین عاملی (متوفی: ۱۹۵۳ء، دمشق)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۳۹

[۳] ابنِ عماد حنبلی (متوفی: ۱۶۷۹ء، مکہ) شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، ج ۱ ص ۱۱

[۴] ابن الوردی (متوفی: ۱۳۴۹ء، حلب) تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۲۲
ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۲۴
ابو الفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابو الفداء، ج ۱ ص ۱۴۲
شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۹

[۵] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۲۴

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرامؓ کے حلقے میں تشریف لا رہے تھے۔ آپ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آگے تشریف نہ لے جائیں تو کیا حرج ہے؟ انشاءاللہ! وہ رُسوا ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھ گئے کہ وہ لوگ بدزبانی پر اُتر آئیں ہیں۔ علامہ طبرسی کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہیں قیام فرمایا لیکن دیگر مؤرّخین لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی یاوہ گوئی کی کوئی پروا نہیں کی اور قلعے کے سامنے تشریف لے گئے۔[1] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں شام ڈھلے پہنچے تھے۔ مجاہدین نے وہاں پہنچتے ہی محاصرہ کرلیا جو پندرہ دن[2]، یا پچیس دن رہا۔[3] جب محاصرہ طویل ہُوا تو حق تعالیٰ نے یہودیوں کے دِلوں پر ایسا رعب وخوف ڈالا کہ اُنہوں نے جنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا اور اپنے ایک آدمی نباش بن قیس کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ ہم اس شرط پر ہتھیار ڈالنے کو تیار ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں چھوڑ دیں تاکہ ہم اپنے اہل وعیال، مال واسباب اور ہتھیاروں کے ساتھ کہیں اور چلے جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی پیشکش کو بحکمِ خدا مسترد کر دیا۔ وہ عرض پرداز ہوئے کہ ہم اپنے مال واسباب اور اسلحے سے بھی دستبردار ہوتے ہیں ہمیں اجازت دیں کہ بنونضیر کی طرح اپنے اہلِ خانہ ہی کو لے کر نکل جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحکمِ الٰہی اُن کی یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی اور فرمایا کہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالو، میں جو چاہوں گا وہ فیصلہ کروں گا۔[4] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حکم پر بنوقریظہ ششدر رہ گئے۔ اُن کا سردار کعب بن اسد تھا اور اُس کا دوست حیی بن اخطب اُس وقت اُس کا مہمان تھا، دونوں نے اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آؤ کیونکہ یہ وہی ہیں جن کے اوصاف تورات میں بیان کیے گئے ہیں اور اگر تم ان پر ایمان لے آتے ہو تو تمہاری جان اور مال محفوظ رہے گا۔ یہودیوں نے کہا کہ ہم اپنا دِین نہیں چھوڑ سکتے اور تورات پر کسی اور کتاب کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ کعب نے کہا کہ تمہارے پاس تین راستے ہیں اُن میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلو۔

ایک یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آؤ جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔

دوسرا یہ کہ ہم اپنے بیوی بچّوں کو اپنے ہاتھوں قتل کر دیں اور پھر قلعے سے باہر نکل کر مسلمانوں سے مقابلہ کریں۔ اگر مارے گئے تو ہمارے پیچھے مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل ورسوا ہونے کو کوئی نہ ہوگا اور کامیاب ہو گئے تو نئی

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۱۵ بحوالہ: اعلام الوریٰ

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۸، بحوالہ: ابن سعد

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۸، بحوالہ: ابن اسحٰق

[4] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی: ۸۲۲ء، بغداد) المغازی للواقدی، ج ۲ ص ۵۰۱

عورتیں بھی حاصل کرلیں گے اور بچّے بھی پیدا کرلیں گے۔

تیسرا یہ کہ آج کی رات مسلمانوں پر شب خون ماریں اور پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

بنوقریظہ نے کعب کے تینوں مشوروں کو مسترد کردیا تو اُس نے کہا کہ اپنی پیدائش سے لے کر اب تک تم میں سے کوئی ایک شخص بھی دُور اندیش ثابت نہیں ہُوا۔ [1]

ایک روز محاصرے کی طوالت سے گھبرا کر، شکست خوردہ حالت میں وہ قلعے سے باہر آ گئے اور کہا ہمارے متعلق سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) جو فیصلہ کریں گے وہ ہمیں منظور ہے۔ علامہ طبرسی لکھتے ہیں، ''رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پچیس دن تک اُن کا محاصرہ قائم رکھا یہاں تک کہ اُن لوگوں نے سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کے فیصلے پر انحصار کر کے ہتھیار ڈال دیئے۔'' [2] حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر بڑے احترام کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر کیا گیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے فرمایا، ''اے سعد! ان کے بارے میں حکم دو۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا، ''حکم تو صرف خدا اور اُس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی دے سکتے ہیں۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''بے شک، (لیکن) تمہیں حق تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا فیصلہ تم کرو۔'' [3] اربابِ سیر نے یہاں بڑی عجیب ولطیف اور گہری بات لکھی ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتوقیر اور ادب واحترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو براہِ راست مخاطب کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب رُخ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متوجہ کرنے سے اجتناب کیا اور یوں کہا، ''جو یہاں موجود ہیں کیا وہ میرے حکم پر راضی ہیں؟''

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''حکم وہی ہے جو تم کرو گے۔''

پس، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا، ''بنی قریظہ کے مردوں کو قتل کر دیا جائے، ان کی عورتوں اور بچّوں کو باندیاں اور غلام بنالیا جائے اور ان کے ساز وسامان اور اموال کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔''

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے سعد! تم نے ان کے بارے میں وہ حکم دیا ہے جو حق تعالیٰ نے ساتوں

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۲۵، ۲۲۶

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۱۷، ۳۱۸ بحوالہ:
فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ

[3] ابن الوردی (متوفی: ۷۴۹ھ ۱۳۴۹ء، حلب) تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۱۲

آسمانوں کے اُوپر سے کیا تھا۔"[1]

بنوقریظہ کا انجام:

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ بنوقریظہ کا تمام مال ومتاع اور اسلحہ جمع کرلو اور اُنہیں گرفتار کر کے مدینہ لے چلو۔ اُن کے قلعے سے برآمد ہونے والے سامان میں پندرہ سو (۱۵۰۰) تلواریں، تین سو (۳۰۰) زِرّہیں، دو ہزار (۲۰۰۰) نیزے اور پانچ سو (۵۰۰) یا بروایتے پندرہ سو (۱۵۰۰) مختلف اقسام کی ڈھالیں تھیں، اس کے علاوہ شراب کا بہت بڑا ذخیرہ بھی تھا جسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے بہادیا گیا۔[2] اسلحے کی اتنی بڑی مقدار سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بڑی جنگ کے لئے تیار تھے۔ مدینہ پہنچ کر مرد قیدیوں کو اُسامہ بن زید کے مکان میں بھیج دیا گیا اور عورتوں اور بچّوں کو ایک خاتون بنتِ حارث کے مکان میں پہنچا دیا گیا، پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر قیدیوں کے لئے دونوں جگہ کھجوروں کے ٹوکرے بھجوائے گئے جو اُنہوں نے سیر ہو کر کھائے۔[3] اگلی صبح رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر جا بجا گڑھے کھودے گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ اصحاب کے ساتھ ایک جگہ تشریف فرما ہوئے جہاں بنی قریظہ کے لوگوں کو لایا جاتا اور اُن کی گردنیں قلم کردی جاتیں۔

واقدی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرزِ عمل سے بالکل نمایاں تھا کہ وہ اُسے ایک ناخوشگوار فریضہ سمجھ رہے تھے جسے مجبوراً اُن جرائم کی شدت کی بنا پر ادا کیا جارہا تھا جن کا ارتکاب بنوقریظہ نے کیا تھا اور اس فریضے کی ادائیگی میں کوئی انتقام یا دشمنی کا جذبہ قطعاً نہیں تھا چنانچہ جو لوگ قتل کیے جارہے تھے اُن کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ترحم کے جذبات بھی کارفرما تھے اس لئے دوپہر کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اب گرمی زیادہ ہوگئی ہے اِنہیں سائے میں لے جاؤ اور لیٹنے کا موقع دو اور ٹھنڈا پانی پلاؤ تاکہ اِنہیں سکون ملے اور باقی ماندہ لوگوں کو دوسرے وقت قتل کرنا، ایسا نہ ہو کہ سورج کی تپش اور ہتھیار کی گرمی دونوں کو

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۲۸
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۳۲

[2] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی: ۸۲۲ء، بغداد) المغازی للواقدی، ج ۲ ص ۵۰۹
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۳۱

[3] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی: ۸۲۲ء، بغداد) المغازی للواقدی، ج ۲ ص ۵۱۲

ایک ساتھ ان پر مسلط کردو۔ یہ سُن کر اصحاب اُنہیں لے گئے، آرام دہ جگہوں پر رکھا اور کھانا پانی پہنچایا۔ جب ٹھنڈا وقت ہُوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر تشریف لائے اور باقی افراد کو قتل کیا گیا۔ [1]

اسی دوران بنونضیر کے سردار حیی بن اخطب کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ ملعون آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انتہائی بغض و عناد رکھتا تھا۔ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ میں رونق افروز ہوئے تھے تو وہ صبح و شام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب موجود رہتا اور منافقت برتا کرتا۔ اُس کے بھائی یاسر بن اخطب نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اُس سے پوچھا کہ کیا یہ وہی مقدس ہستی ہیں جن کے اوصاف ہم تورات میں پڑھتے ہیں؟ اُس نے تمسخر سے کہا ''ہوہو'' یعنی یہ ہیں تو وہی لیکن میرے دل میں اُن کے لئے عداوت کے سوا کچھ نہیں۔ جب اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے دشمنِ خدا! آخر کار حق تعالیٰ نے تجھے میرا اسیر بنا دیا، تجھ پر ذلت وخواری مسلط کردی اور مجھے تجھ پر غالب کر کے حاکم بنایا۔'' وہ شقیُ القلب اب بھی گستاخی سے باز نہ آیا اور کہنے لگا، ''میں خود کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عداوت کی وجہ سے ملامت نہیں کروں گا مگر جس کو اللہ رسوا کرے اُسے کوئی عزت نہیں ملتی، میں نے اپنی عزت تلاش کی اور خدا نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ظفر مند کیا۔'' شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن حیدر کرار علی علیہ السلام نے ذوالفقار کھینچی اور اُس گستاخ کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اُس کے بعد کعب بن اسد کو لایا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس سے فرمایا، ''اے کعب! ایمان لے آؤ، تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ میں رسولِ برحق ہوں۔'' کعب نے کہا، ''میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق اور اطاعت کرتا لیکن مجھے شرم آتی ہے کہ لوگ کہیں گے عاجز ہو کر اور جان کے خوف سے ایمان لے آیا، پس میں دینِ یہود پر ہوں اور اُسی پر مروں گا۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے اُسے بھی جہنم واصل کر دیا۔

اربابِ سیر کہتے ہیں اُس دن حضرت علی علیہ السلام اور حضرت زبیر، رات تک بنوقریظہ کے قتل میں مصروف رہے جن کی مجموعی تعداد چار سو تھی۔ بعض نے یہ تعداد چھ سو، سات سو اور نو سو بھی لکھی ہے لیکن مؤرّخین کی اکثریت چار سو والی روایت پر متفق ہے۔ کچھ قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا، بعض کو ہِبہ (کسی

---

[1] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی: ۸۲۲ء، بغداد) المغازی للواقدی، ج ۲ ص ۵۱۴

کو دے دینا) کر دیا گیا اور اُن کا مال و اسباب مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔[1] واقدی کے مطابق مقتولین کی تعداد ساڑھے سات سو تھی۔ عورتوں اور بچّوں کو کنیزوں اور غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا جن کی تعداد ایک ہزار تھی۔ اُن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ کسی ماں سے اُس کے بچّے کو اُس وقت تک جُدا نہ کیا جائے جب تک وہ سنِ بلوغت کو نہ پہنچ جائے۔[2]

علامہ علی نقی نقوی نے ''تاریخ اسلام'' میں میرے دل کی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں، ''دل کہتا ہے اگر وہ (بنو قریظہ) اپنے کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رحم و کرم پر چھوڑتے تو اُنہیں اتنے تباہ کن انجام کا سامنا شاید نہ کرنا پڑتا۔ مگر اُنہوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلقِ عظیم پر بے اعتمادی سے کام لیتے ہوئے اپنے ذاتی تعلقات پر بھروسا کیا اور سعد بن معاذؓ کو ثالث بنا دیا جس کے بعد فیصلہ کی ذمہ داری خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بالکل نہ رہی۔ اُنہیں سعد بن معاذؓ کے ذاتی تعلقات پر بھروسا تھا جو اُنہوں نے اُن کا نام ثالثی کے لئے پیش کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سعدؓ کے خلوصِ ایمانی پر اعتماد تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی اس پیشکش کو قبول فرما لیا۔''[3]

سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ مناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن شریعت، قانون اور عدل و انصاف کی رُو سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔ جیسا کہ اُوپر ذِکر کیا جا چکا ہے کہ فیصلے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذؓ سے فرمایا، ''اے سعد! تم نے ان کے بارے میں وہ حکم دیا ہے جو حق تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں کے اُوپر سے کیا تھا۔''[4]

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذؓ نے جو فیصلہ کیا وہ تورات کے مطابق تھا، تورات کتاب تثنیہ اصحاح ۲۰ فقرہ ۱۰ میں ہے، ''جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تُو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح کر لیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے لیکن اگر صلح نہ کریں تو اُن کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو اُن پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد

---

[1] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۷

[2] ابو عبد اللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی: ۸۲۲ء، بغداد) المغازی للواقدی، ج ۲ ص ۵۱۸، ۵۲۳، ۵۲۴

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۱۹

[4] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۷

ہوں سب کو قتل کر دے۔ باقی بچّے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لئے مالِ غنیمت ہوں گی۔''[1]

ڈاکٹر عبدالعلیم لکھتے ہیں، ''دراصل بنوقینقاع اور بنونضیر کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا وہ انصاف نہیں تھا بلکہ اس میں رحم کی کارفرمائی نظر آتی ہے اس لئے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا رحیم انسان اُس (رحم کی کار فرمائی) کا ذمہ دار ہے۔ ہاں بنوقریظہ کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا اور سختی کے ساتھ وہ سزا دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر کسی کو اس میں بے جا شدت نظر آتی ہے تو اُس کے ذمہ دار رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں بلکہ سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) ہیں جو بنوقریظہ کے دوست تھے اور جنہیں خود اُنہوں نے نامزد کیا تھا۔ یورپی مورّخ لین پول لکھتا ہے کہ سزا سخت تھی لیکن یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اُن لوگوں کا جرم حکومت سے کھلم کھلا بغاوت تھی اور وہ بھی محاصرے کے زمانے میں۔ جو لوگ یہ پڑھ چکے ہیں کہ ولنگٹن کی فوج کے راستے کا پتا غداروں اور ڈاکوؤں کی اُن لاشوں سے چلتا تھا جو اِدھر اُدھر درختوں پر لٹکتی ہوتی تھیں تو اُنہیں تو کم از کم ایک غدار قبیلے کے قتل کیے جانے پر متعجب نہیں ہونا چاہیے۔''[2]

سریۂ علی مرتضیٰ علیہ السلام یا سریۂ فدک

(شعبان ۶ ہجری/جنوری ۶۲۸ء)

شعبان ۶ ہجری/جنوری ۶۲۸ء میں بنی سعد بکر نے یہود کی مدد کے لئے فدک کے قریب ایک لشکر جمع کیا جس کی سرکوبی کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت مولا علی علیہ السلام کی کمان میں دوسو مجاہدین کا ایک دستہ روانہ کیا۔ امیر المومنین علی علیہ السلام نے اس تیزی سے اُن کو جا لیا کہ وہ اس غیر متوقع اور اچانک حملے سے حواس باختہ ہو کر بھاگ گئے۔[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فدک اور خیبر کے درمیان اُن پر اچانک حملہ کر دیا۔ بنوسعد نے شکست کھائی اور اُن کے پانچ سو اُونٹ اور ایک ہزار بکریاں مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں۔ اس کے بعد علی المرتضیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ بغیر کوئی نقصان اُٹھائے مدینہ طیبہ واپس آ گئے۔[4]

---

[1] مولانا شبلی نعمانی (متوفی: ۱۹۱۴ء، لکھنؤ) سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حصّہ اوّل ص ۴۳۵

[2] ڈاکٹر مولوی عبدالعلیم احراری (متوفی: ۱۹۷۶ء، بھارت) سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مستشرقین، ص ۷۶

[3] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۷۳

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۴۸

حدیبیہ کا معرکہ

(یکم ذیقعد ۶ ہجری/ ۱۲ مارچ ۶۲۸ء)

حدیبیہ کے واقعے کو کئی مؤرّخین نے ''معاہدۂ حدیبیہ'' کے عنوان سے لکھا ہے لیکن چند اہلِ نظر نے اسے بھی ایک معرکہ قرار دیا ہے۔ بادی النظر میں تو یہ ایک معاہدہ ہی تھا لیکن تحریکِ اسلام کے تناظُر میں دیکھا جائے تو بدر و اُحد کی طرح یہ بھی ایک معرکہ ہی تھا اگرچہ اس میں جنگ وجدال اور قتل وغارت گری کی نوبت نہیں آئی مگر صبر وثبات اور ایمان واستقامت کا ایک کڑا امتحان ضرور تھا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثاروں کو گذرنا پڑا۔ دورِ حاضر کے محققین ومبصرین جس طرح یہ کہتے ہیں کہ آنے والے وقتوں میں جنگیں میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ میز پر (مذاکرات کی صورت میں) ہُوا کریں گی، اُسی طرح ہمارے نزدیک یہ بھی ایک ایسی جنگ تھی جو میدانِ جنگ میں شمشیر وسناں کے ذریعے نہیں بلکہ مذاکرات کی صورت میں قلم کے ذریعے ہوئی اور نبی معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُور اندیشی، حکمتِ عملی اور تدبر ودانش کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لازوال فتح وکامرانی پر منتج ہوئی۔

اربابِ سیر بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب دیکھا کہ خانہ کعبہ کی چابی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک میں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ مکّہ معظّمہ کی زیارت اور عمرہ کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ خواب صحابہ کرامؓ سے بیان فرمایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال ظہور پذیر ہوگی لیکن جب حالات نے ایک اور رُخ اختیار کر لیا تو بعض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سوال اُٹھا دیا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہ (عمرہ) اِسی سال واقع ہوگا (یہ تو تمہاری اپنی تعبیر اور خیال تھا)۔[1] بروایتے یکم ذیقعد ۶ ہجری بروز دوشنبہ (پیر)،[2] رسولِ اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرے کا ارادہ کیا اور صحابہؓ سے فرمایا کہ تم بھی تیار ہو جاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم کو مدینہ منوّرہ کا انتظام وانصرام سونپا اور صحابہؓ کے ساتھ مدینہ سے باہر تشریف لائے۔ اکثر صحابہؓ نے تلوار کے سوا کوئی اور اسلحہ ساتھ نہیں لیا تھا کیونکہ تلوار کو عرب میں مسافر کا

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۵۶

[2] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء، مکہ)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۶۶

ہتھیار رکھا جاتا تھا یعنی دورانِ سفر تلوار ساتھ رکھنا عربوں کے رواج میں شامل تھا اور وہ اسے کسی حالت میں بھی اپنے جسم سے الگ نہیں کرتے تھے۔[1] کچھ صحابہ نے اپنے جسموں پر پورے ہتھیار سجا لیے تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے جائز قرار نہ دیا۔[2] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھ قربانی کے اُونٹ بھی لئے جو تعداد میں ستر (۷۰) تھے۔ قریش کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روانگی کی خبر ہوئی تو سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکّہ میں داخل نہ ہونے دیا جائے چنانچہ اُنہوں نے قرب وجوار کے قبیلوں کو بھی ساتھ ملا لیا اور جنگ کے لئے تیار ہو کر مکّہ سے باہر آ گئے۔ قریش نے جدّہ کے راستے پر واقع موضع بلدہ میں پڑاؤ ڈالا اور ایک ہراول دستہ ترتیب دیا جس میں خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابوجہل شامل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لشکرِ کفّار کی آمد کی خبر ہوئی تو فرمایا کہ خالد بن ولید قریش کے لشکر کا ہراول دستہ لیے مقامِ غمیم پر بیٹھا ہے اس لئے تم داہنے راستے سے نکل چلو۔ اربابِ سیر کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے جو راستہ اختیار کیا وہ نہایت دشوار گزار اور سخت ترین تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راستے کی صعوبتیں ملاحظہ فرمائیں تو صحابہؓ کی دلجوئی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جنّت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ سفر کے اختتام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ کے میدان میں ایک کنویں پر نزول فرمایا۔ ہوسکتا ہے کہ اُسی کنویں کا نام حدیبیہ ہو جس کی نسبت سے وہ جگہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اُس کنویں میں پانی بہت کم تھا لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تیر کنویں میں چلایا۔ کنواں پانی سے بھر گیا اور لوگ خوب سیراب ہوئے۔ بروایتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو کر کے کلی کے پانی کو کنویں میں ڈال دیا، کنویں میں پانی بھر آیا اور لوگ اچھی طرح سیراب ہوئے۔[3]

قریش کو جب معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حرمتِ کعبہ کا خیال کرتے ہوئے جنگ وجدال کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تو اپنی جہالت، حماقت اور بدفطرت کی بنا پر تمرّد و سرکشی پر اُتر آئے اور ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرنے لگے۔ سب سے پہلے اُنہوں نے بذیل بن ورقا خزاعی کو چند لوگوں کے ساتھ بھیجا۔ بدیل نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ قریش اور دیگر قبائلِ عرب متحد ہو کر حدیبیہ کے کنوؤں کے آس پاس جمع ہو چکے ہیں تاکہ آپ لوگوں کو خانہ کعبہ کی زیارت سے روک سکیں لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واپس چلے جائیں ورنہ وہ جنگ کریں گے۔

---

[1] خواجہ محمد لطیف، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۱۲۰

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۵۶

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۵۶

نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہم جنگ وجدل کے لئے نہیں آئے، ہمارا مقصد زیارتِ کعبہ اور عمرہ ادا کرنا ہے۔ قریش اگر جنگ کرنا چاہتے ہیں تو یہ اُن کے حق میں بہتر نہیں ہے۔ ہاں! اگر وہ چاہیں تو ہم ایک مدت معین کر لیتے ہیں جس میں ہمارے اور اُن کے درمیان جنگ نہیں ہوگی۔ جنگ کے واسطے وہ مجھے دیگر مشرکین کے لئے چھوڑ دیں، اگر میں مغلوب ہو گیا تو اُن کی دِلی مراد پوری ہو جائے گی اور اگر غالب آ گیا تو وہ بھی اُن کی طرح میری پیروی کر لیں یا صلح کی معینہ مدت تک جنگ وجدال سے دُور رہیں۔ اور میری اس پیشکش کے باوجود بھی اگر وہ لڑائی پر مُصر ہیں تو پھر میں اُن سے جہاد کروں گا اور بے شک اللہ اپنے دین کی نصرت فرمائے گا۔ بذیل نے واپس جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں قریش کو بتائیں لیکن اُنہوں نے ایک نہ مانی۔ اُن میں سے ایک معزز شخص عروہ بن مسعود ثقفی نے قریش کی ہٹ دھرمی دیکھی تو کہا کہ اگر تم مجھ پر خیانت وعداوت کا گمان نہیں کرتے تو مجھے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر بات چیت کرنے اور اُن کا عندیہ معلوم کرنے کا موقع دو۔ پس عروہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے (وہ اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے لیکن بعد میں مسلمان ہو گئے تھے)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے بھی تقریباً وہی کچھ کہا جو بذیل سے فرمایا تھا۔ عروہ بن مسعود نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہونے والی بات چیت قریش کو بتائی اور جنگ سے باز رہنے کا مشورہ دیا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور کہنے لگے کہ ہمیں ایسی نصیحتیں مت کرو، ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں کو مکّہ میں داخل ہونے دیں گے نہ کعبہ کی زیارت کرنے دیں گے۔ ہاں اگر وہ اس وقت واپس چلے جائیں تو اگلے سال ہم اُنہیں نہیں روکیں گے۔ عروہ کے بعد قبیلہ احابیش کا ایک آدمی حلیس، قریش سے اجازت لے کر رسولِ حلیم وکریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت سے بہت متاثر ہُوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گفتگو سُن کر اور قربانی کے جانوروں کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ وقتال کا ارادہ نہیں رکھتے بلکہ حقیقتاً زیارتِ کعبہ کی غرض سے آئے ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور وہ کہنے لگا، ''اُس قوم کو سزاوار نہیں ہے کہ اِن کو خانہ کعبہ کی زیارت اور طواف سے روکے۔ ربِ کعبہ کی قسم! قریش ہلاک ہو جائیں گے''۔ وہ فوراً واپس لوٹ گیا اور قریش سے کہا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں کو دیکھا ہے۔ وہ قربانی کے اُونٹ لے کر خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں اس لئے اُنہیں روکنا مناسب نہیں۔ احابیش قبیلے کے لوگ قربانی کے جانوروں کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے۔ بروایتے، جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کے لئے آیا تو اُن

جانوروں کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملے بغیر ہی واپس لوٹ گیا اور قریش سے کہا میں نے دیکھا ہے کہ وہ قربانی کے اُونٹ لے کر خانہ کعبہ کی زیارت کو آئے ہیں اس لئے اُنہیں مت روکو۔ قریش نے حلیس کے مشورے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور انتہائی شقاوت سے کہنے لگے کہ اے حلیس! تُو دیہاتی آدمی ہے تُو ملکی اُمور نہیں جانتا۔ حلیس نے طیش میں آکر کہا کہ قسم ہے اُس خدا کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کعبہ کے طواف سے روکو گے تو میں اور احابیش کے تمام لوگ تم سے الگ ہو جائیں گے۔ حلیس کی دھمکی کام کر گئی اور قریش جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ عذر خواہی کرتے ہوئے کہنے لگے اے حلیس! ان باتوں کو جانے دو، ہم اپنی شرائط پر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صلح کر لیں گے۔ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ قریش نے جب اپنوں میں سے کسی کی بات نہ مانی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاہا کہ اپنی طرف سے کسی کو مذاکرات کے لئے بھیجیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی خزاعہ کے ایک شخص حراش بن اُمیّہ کو بھیجا کہ وہ قریش کو باور کرائیں کہ ہم جنگ کے لئے نہیں بلکہ بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔ حراش اُن کے پاس پہنچے تو وہ اُنہیں قتل کرنے پر تُل گئے۔ حراش کے قبیلے کے لوگ اُنہیں بچانے دوڑے اور کسی نہ کسی طرح چھڑا کر واپس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روانہ کیا۔ [1] پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب سے فرمایا کہ تم مکّہ جاؤ اور قریش کو سمجھاؤ کہ ہم جنگ کے لئے نہیں بلکہ عمرہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اُنہوں نے مجھ پر قابو پا لیا تو یقیناً مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے اور وہاں بنی عدی میں سے ایسا کوئی نہیں ہے جو میری حمایت وحفاظت کر سکے اس لئے اگر آپ میری جگہ عثمان بن عفان کو بھیج دیں تو زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ وہ قریش کے قریبی عزیز ہیں اور مکّہ میں اُن کے عزیز واقارب کی تعداد بھی بہت ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفان کو مکّہ کی طرف روانہ کیا تاکہ ابوسفیان اور قریش کے دیگر ارباب اختیار کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مافی الضمیر سمجھائیں۔ [2] حضرت عثمان دس مہاجرین کے ساتھ مکّہ روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پہنچایا مگر کفّار اپنی ضد پر اڑے رہے کہ اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکّہ آنے

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۵۸ تا ۲۶۲

[2] ابن الوردی (متوفی: ۱۳۴۹ء، حلب)، تاریخ ابن الوردی، طبع مصر، ج ۱ ص ۱۲۵
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۲
علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۳۸

اور خانہ کعبہ کی زیارت کرنے دیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان نے واپسی کا ارادہ کیا تو قریش نے کہا کہ اگر تم چاہو تو طوافِ کعبہ کرلو۔ حضرت عثمان نے کہا کہ میں اس وقت تک طواف نہیں کروں گا جب تک رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ کریں۔ مشرکین نے اس بات پر برہم ہو کر حضرت عثمان کو زبردستی مکّہ میں روک کر قید کرلیا۔ اِدھر لشکرِ اسلام میں یہ خبر پھیل گئی کہ مکّہ والوں نے حضرت عثمان کو اُن کے دس ساتھیوں سمیت شہید کر دیا ہے۔ [1]

بَیعَتِ رضوان:

ہجرت کے بعد سے لے کر اب تک اگرچہ مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہو چکا تھا تاہم وہ اپنے آبائی وطن مکّہ جانے سے قاصر تھے۔ وطن کی کشش اور بیت اللہ کی زیارت کی تڑپ اُنہیں ہر لحظہ بیقرار اور پریشان رکھتی تھی۔ رویائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سُن کر اُن کی بیقراری میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اُڑ کر مکّہ جا پہنچیں۔ آغازِ سفر سے لیکر قیامِ حدیبیہ تک گزرنے والے ہر لمحہ نے اُن کی بے چینی کو مہمیز کیا تھا اور شوقِ سفر کو بڑھا دیا تھا چنانچہ حدیبیہ پہنچ کر جب اُنہیں معلوم ہُوا کہ قریش کا لشکر سدِّ راہ ہو گیا ہے تو اُن کا جوش و خروش حد سے تجاوز کر گیا۔ پس اکثر مسلمان جنگ پر مُصر ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کرنے لگے کہ حملہ کر دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُحد میں مسلمانوں کی بیوفائی کا ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے اب ضروری سمجھا گیا کہ ان لوگوں سے اس شرط پر بَیعَت کی تجدید کرائی جائے کہ میدانِ جنگ سے فرار نہیں ہوں گے۔ [2] تاریخِ طبری میں سلمہ بن الاکوع سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منادی نے ندا دی ''لوگو! بَیعَت کے لیے آؤ روح القدس آئے۔'' ندا کو سُن کر ہم تیزی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف چلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس وقت ایک خاردار درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بَیعَت کی۔'' [3] اس بَیعَت کو بعض مؤرّخین نے لکھا ہے کہ یہ ''موت'' پر لی گئی تھی۔ جیسا کہ مسٹر کے اے حمید لکھتے ہیں، ''ایک درخت کے نیچے چودہ سو (۱۴۰۰) آدمیوں نے بَیعَت کی کہ اگر ضرورت پڑی تو اسلام

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۳
ابن الوردی (متوفی: ۱۳۴۹ء، حلب)، تاریخ ابن الوردی، طبع مصر، ج ۱ ص ۱۲۵
کے اے حمید، تاریخ مسلمانان عالم، ج ۱ ص ۸۰

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۴۰

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۵۳، ۲۵۴

پر جان دینے کے لئے تیار ہیں۔'' [1] ابن الوردی اور ابوالفداء بیان کرتے ہیں، ''کہا جاتا ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے موت پر بَیعَت لی جب کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے اس بات پر بَیعَت لی کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔ [2] قدیم ترین مؤرّخ واقدی کے الفاظ ہیں، ''حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے بَیعَت لی اِس پر کہ وہ فرار نہیں کریں گے اور کسی نے یوں کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے موت پر بَیعَت لی۔'' [3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک درخت سے پشت مبارک لگا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت قدم رہنے پر بَیعَت لی کہ اگر جنگ ہوئی تو منہ نہ پھیریں گے۔'' [4] علامہ طبرسی فرماتے ہیں، ''اُن سب نے درخت کے نیچے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بَیعَت کی اس بات پر کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر فرار نہیں کریں گے۔'' [5] پس مندرجہ بالا مؤرّخین کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس پر بَیعَت لی کہ اگر جنگ ہوتی ہے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیں گے، مرتے دم تک لڑیں گے اور میدانِ جنگ سے فرار نہیں ہوں گے۔ پس، اس بَیعَت کو ''بَیعَتِ رضوان'' کہا جاتا ہے۔

جب قریش نے اس بَیعَت کی خبر سنی تو اُن میں خوف و ہراس پھیل گیا کہ رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنگ کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ اس پر وہ پریشان ہوئے اور صلح پر آمادہ ہو گئے۔ اُنہوں نے اپنے خطیب سہیل بن عمرو کو صلح کی شرائط طے کرنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا۔ [6]

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۴۰ بحوالہ: مسٹر کے۔ اے۔ حمید، مسلمانانِ عالم

[2] ابن الوردی (متوفی: ۷۴۹ھ، حلب)، تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۲۵
ابوالفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام)، تاریخ ابوالفداء

[3] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی: ۸۲۲ء، بغداد)، کتاب المغازی، ج ۲ ص ۶۰۳

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۳

[5] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ

[6] ابن الوردی (متوفی: ۱۳۴۹ء، حلب)، تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۲۵
ابوالفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام)، تاریخ ابوالفداء، ج ۱ ص ۱۴۶
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۳

قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو نے اُن کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا، ''آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یوں آزادانہ مکّہ میں داخل ہونا ہم برداشت نہیں کر سکتے، اس طرح ہماری توہین ہوتی ہے کیونکہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی طاقت کے بل بوتے پر آئے ہیں۔ لہٰذا اس مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بغیر زیارت کے لوٹ جائیں اور آئندہ سال عمرے کے لئے آئیں اور جب آئیں تو اپنی تلواریں نیام میں رکھیں۔ ہم تین دن کے لئے مکّہ خالی کر دیں گے تا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی عبادات جس طرح چاہیں انجام دیں۔'' اس سے قریشِ مکہ کا مقصد یہ تھا کہ اطرافِ عرب میں یہی مشہور ہو کہ مسلمان اپنی طاقت کے بل بوتے پر نہیں آئے بلکہ ہم نے خود اُنھیں اجازت دی ہے۔ سہیل نے مزید کہا، ''دس سال تک (ابوداؤد، مستدرک اور المواہبُ اللدنیہ میں یہ مدت چار سال منقول ہے لیکن معروف مدت دس سال ہی ہے) ہمارے اور آپ کے درمیان صُلح رہے گی، جنگ وجدال نہیں ہوگا، دونوں اطراف کے شہری امن وسلامتی سے رہیں گے اور ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے نہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں گے۔ اور اگر ہمارا کوئی شخص آپ کی طرف جائے گا تو آپ اُسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے لیکن آپ کا جو آدمی ہماری طرف آئے گا ہم اُسے واپس نہیں کریں گے۔'' اس گفتگو کے دوران سہیل کے بیٹے ابوجندل کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے مسلمانوں کے درمیان پہنچ گئے۔ ابوجندل پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے اور اس ''جرم'' کی پاداش میں اپنے باپ سہیل بن عمرو کی قید میں تھے، اب کسی طرح بھاگ کر بارگاہِ رسالت میں پہنچ گئے تھے۔ سہیل کہنے لگا میرے بیٹے کو میرے سپرد کر دیں کیونکہ یہ بات معاہدے میں طے پا چکی ہے کہ ہمارا کوئی شخص آپ کے پاس آئے گا تو آپ اُسے واپس کر دیں گے۔ بروایتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شخص معاہدہ تحریر ہونے سے پہلے آیا ہے اور یہ شرط تو معاہدہ تحریر ہونے کے بعد آنے والوں پر لاگو ہوگی۔ (واضح ہو کہ معاہدہ ابھی ہُوا نہیں تھا بلکہ فریقین کے مابین بات چیت چل رہی تھی)۔ سہیل ہٹ دھرمی پر اُتر آیا اور کہنے لگا کہ اگر ایسا ہے تو پھر ہمارے اور آپ کے درمیان مُصالحت نہیں ہو سکتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو میری خاطر مستثنیٰ کر دو اور نرمی اور آسانی پیدا کرو، مگر وہ نہ مانا۔ بقولے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بار بار کہنے کے باوجود بھی وہ آمادہ نہ ہُوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجندل کو اُس کے سپرد کر دیا اور فرمایا کہ اسے ایذا نہ دینا۔ ابوجندل نے کہا، ''مسلمانو! مجھے مشرکوں کے سپرد نہ کرو، میں ایمان لا کر تمہاری پناہ میں آیا ہوں، تمہیں معلوم

نہیں ان کافروں نے مجھ پر کیسے کیسے ظلم وستم کیے ہیں۔'' رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجندل سے فرمایا، ''اے ابوجندل! صبر کرو اور دل کو مطمئن وشاد رکھو، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسہ کرو، وہ تمہارے لئے کشادگی اور آزادی پیدا فرمائے گا، بلاشبہ صبر کشادگی کی کنجی ہے۔''

قریش کی شرائط بظاہر مسلمانوں کے مفاد اور وقار کے منافی تھیں لیکن حقیقت میں وہ ایسی نہ تھیں بلکہ اُن میں کافروں کی شکست اور مسلمانوں کی فتح کے عوامل پنہاں تھے جنہیں صرف رسولِ حکیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُوررَس نگاہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔ جبکہ کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو صرف الفاظ پر غور کر رہے تھے، اُن کی سطحی نظریں رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت و دُور اندیشی کو نہ بھانپ سکیں اور وہ اس معاہدے پر اعتراض کرنے لگے حتیٰ کہ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اُن کا رویّہ گستاخانہ ہوگیا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رِسالت پر سوال اُٹھانے لگے۔[1]

الغرض، تمام شرائط جب زبانی طور پر طے پا چکیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاہدے کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کو مقرر کیا۔[2]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، یا علی! لکھو: ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم''

سہیل کہنے لگا کہ ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم'' کیا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے اس لئے لکھیں، ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' جیسا کہ عام طور پر لکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحمل اور بُردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے علی علیہ السلام سے فرمایا کہ اے علی!، ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ ○'' لکھو۔ حضرت علی علیہ السلام نے ایسا ہی لکھا۔ پھر نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، لکھو، ''هٰذَا مَا قَاضٰى بِهٖ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ'' (اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے)۔ علی علیہ السلام نے لکھ دیا۔ سہیل پھر بھڑک اُٹھا اور کہا، ''ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رسول اللہ نہیں مانتے، اگر مانتے ہوتے تو پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خدا کے گھر کی زیارت سے روکتے ہی کیوں؟ اس لئے ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ'' کی بجائے ''مُحَمَّد بن عَبْدُ الله'' لکھیے۔

---

[1] عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۶ بحوالہ: صحیح بخاری، ج ۲ کتاب الجہاد
حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء) تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۳۲

[2] مسٹر کے۔ اے۔ حمید، تاریخ مسلمانان عالم ج ۱ ص ۸۱
ڈاکٹر محمد حمید اللہ (متوفی: ۲۰۰۲ء، امریکہ) رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیاسی زندگی، ص ۱۲۶
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۵

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت صبر اور سکون سے فرمایا، ''میں اللہ کا رسول بھی ہوں اور محمد بن عبداللہ بھی۔ پھر علی علیہ السلام سے فرمایا، ''اے علی! اس تحریر میں سے ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ'' کاٹ دو اور ''مُحَمَّد بن عَبْدُاللہ'' لکھو۔ حضرت علی المرتضیٰ نے عرض کی، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں ایسا ہرگز نہیں کرسکتا کہ وصفِ رِسالت کو محو کردوں (یعنی رسول اللہ کے الفاظ مٹادوں)۔

روایت ہے کہ علی علیہ السلام نے قلم کو رکھ دیا اور ہاتھ تلوار پر لے گئے۔[1] نبی معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جاں نثار بھائی کے جذبات اور ''بابِ علم'' کی دُور اندیشی اور حکمت و دانائی سے بخوبی واقف تھے اس لئے اُن کے ہاتھ سے تحریر لے کر ''رسول اللہ'' کے الفاظ کو خود محو کیا اور اُن کی جگہ ''ابنِ عبداللہ'' لکھ دیا۔

محققین کہتے ہیں کہ اس میں حضرت علی علیہ السلام کی حکمت یہ تھی کہ وہ ہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت کی پہلی گواہی دینے والے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وزیر اور جانشین تھے۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے ''رسول اللہ'' کے الفاظ اس لئے نہیں مٹائے کہ منافقین کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ جب علی نے ہی ''رسول اللہ'' لکھ کر مٹا دیا تو پھر رِسالت پر ہمارے شک کرنے پر اعتراض کیسا؟ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کا لفظِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) محو کرنے (مٹانے) سے انکار از بابِ ترک امتثال (حکم عدولی کیوجہ سے) نہیں تھا جو مستلزم ترکِ ادب ہے (جو ترک ادب کی وجہ سے قابلِ سزا ہو) بلکہ عین امتثال و ادب (فرمانبرداری اور تعظیم) ہے جو انتہائی عشق و محبت پر دلالت کرتا ہے۔''[2]

مذکور ہے کہ اُس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا، ''یا علی (علیہ السلام)! ایک روز تمہیں بھی ایسا ہی معاملہ درپیش ہوگا۔'' چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب قضیہ صفین میں صلح قرار پائی تو ایک صلح نامہ مرتب کیا گیا جس میں لکھا گیا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام کی مصالحت معاویہ بن ابوسفیان کے ساتھ ہے۔ معاویہ بن ابوسفیان نے کہا لفظ ''امیر المومنین'' کاٹ دو اور لکھو علی بن ابی طالب۔ اگر میں ان کو امیر المومنین مانتا تو ان کے ساتھ جنگ نہ کرتا اور ان کی پیروی و اطاعت کرتا۔ اس پر علی المرتضیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ فرمایا تھا۔[3]

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۰۵۲ھ، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۶

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۰۵۲ھ، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۶

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۰۵۲ھ، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۶

صلح نامہ کی کتابت کے دوران قریش کا نمائندہ سہیل بن عمرو بار بار جھگڑا کرتا اور تحریر میں رکاوٹ ڈالتا لیکن رسول حلیم و کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر بار درگزر فرماتے اور صبر و تحمل کے ساتھ اُس کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے صلح کی کاروائی کو آگے بڑھاتے۔ بالآخر صلح نامہ مکمل ہوگیا۔ اس صلح نامے کو معاہدۂ حدیبیہ یا صلح نامۂ حدیبیہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے نکات مندرجہ ذیل ہیں۔[1]

صلح نامہ حدیبیہ کے نِکات:

۱۔ یا خدا! تیرے نام سے۔

۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پایا۔

۳۔ دونوں کے درمیان اس بات پر صلح ہوئی ہے کہ دس سال تک جنگ بندی رہے گی اور اس عرصہ میں دونوں اطراف کے لوگ ایک دوسرے کے مقابل نہیں آئیں گے اور امن سے رہیں گے۔

۴۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جو ساتھی حج یا عمرہ یا تجارت کی غرض سے مکّہ آئے گا اُسے جان و مال کی امان دی جائے گی اور قریش کا جو شخص تجارت کے لئے مصر یا شام (بروایتے عراق یا شام) جاتے ہوئے مدینہ سے گزرے گا تو اُسے مسلمانوں کی طرف سے جان و مال کی امان حاصل ہوگی۔

۵۔ قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے گا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُسے واپس قریش کے حوالے کردیں گے جبکہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کوئی ساتھی قریش کے پاس جائے گا تو وہ اُسے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو واپس نہیں کریں گے۔

۶۔ فریقین کے سینے بند رہیں گے (یعنی دِلوں میں کوئی غداری یا نفاق داخل نہیں ہوگا)، خفیہ طور پر کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خلافِ عہد دغابازی کی جائے گی۔

۷۔ جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معاہدے اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا اور اسی طرح جو قریش کے معاہدے اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا۔

۸۔ مسلمان اس سال یہاں سے واپس چلے جائیں گے اور مکّہ میں نہیں آئیں گے البتہ اگلے سال قریش مکّہ سے باہر چلے جائیں گے اور مسلمان وہاں تین راتیں ٹھہر سکیں گے جبکہ مسلمانوں کے پاس صرف ''سوار کا ہتھیار''، یعنی تلوار ہوگی جو میان میں ہوگی اور اس کے سوا کوئی اور ہتھیار نہ ہوگا۔

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور)، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ص ۵۸۰

۹۔ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے جہاں وہ پائے گئے ہیں (یعنی حدیبیہ میں)، اُنہیں وہیں ذبح کیا جائے گا، مکّہ میں نہیں لایا جائے گا اور صراحت کی جاتی ہے کہ دونوں فریقین کے حقوق و فرائض برابر ہوں گے۔

معاہدے کی تکمیل کے بعد بھی کئی مسلمانوں کی برہمی نکتہ عروج پر تھی حتیٰ کہ جب رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اُٹھو قربانیاں کرو اور سر کے بال منڈوا کر واپس چلو تو مسلمانوں کی اکثریت خاموش رہی اور حکم کی تعمیل کے لئے نہ اُٹھی، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے بے اعتنائی اختیار فرما کے خود جا کر قربانی کی اور بال منڈوائے تو کچھ لوگوں نے بال منڈوائے اور اکثر نے بددلی سے تھوڑے تھوڑے ترشوائے اور اُن کے رنج و غم کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن میں سے ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے۔[1] حدیبیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام کا دورانیہ بیس روز تھا۔ قربانی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس مدینہ تشریف لے گئے۔[2]

معاہدہ حدیبیہ اُن لوگوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے جن کا کہنا ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ اس معاہدے کی تمام شرائط ایسی ہیں جو تلوار کے بل بوتے پر حکومت کرنے والوں کے لئے کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہوسکتیں مگر رسولِ حلیم و کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کو قبول فرما کر تمام عالم پر ثابت کر دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امن کے سفیر اور عالمین کے لئے رحمت ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصدِ حیات زمانے کو نورِ ایمان سے منور فرمانا ہے نہ کہ لوگوں کا خون بہا کر کسی ریاست کی بنیادوں کو مستحکم کرنا۔ اس معاہدے کی کتابت کے دوران قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو کا سخت رویّہ، بات بات پر جھگڑا کھڑا کر دینا اور اپنی مرضی کے مطابق معاہدے میں الفاظ کو تبدیل کروانا اس کا غماز ہے کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ صلح پسند نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ نہیں کرنا چاہتے اور امن کو لڑائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور پھر ہُوا بھی یہی، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باوجود کئی مسلمانوں کی سخت مخالفت اور ناراضگی کے وہ شرائط بھی قبول فرمالیں جو بادی النظر میں باعثِ ہزیمت سمجھی جارہی تھیں لیکن درحقیقت فروغِ امن کا ذریعہ تھیں۔ آنے والے وقت نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ بعض مسلمان صلح کی جن شرائط کو اپنی شکست اور توہین کا باعث سمجھتے ہوئے سخت نالاں تھے، وہی اسلام کی ترقی اور عروج کا زینہ بنیں۔ عرب کی فضائیں مسلمانوں کے لئے خوشگوار اور پُرسکون

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۵۹
ابی جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ طبع جدید مصر ۱۳۶۱ھ، ص ۶۳۷

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۷۲

ہوئیں اور نورِ حق کی شعائیں چہار سُو پھیلنے لگیں۔ جو مسلمان مشرکین کے پاس جاتے اور اُنہیں معاہدے کی شرط کے مطابق واپس نہ آنے دیا جاتا، وہ وہاں اپنی زبان اور اخلاق و اطوار سے نشر و اشاعتِ اسلام کا وسیلہ بنتے اور قریش کے جو لوگ مسلمانوں میں آ کر واپس جاتے وہ مسلمانوں کے حُسنِ سلوک اور اوصاف و کردار کو بیان کر کے تبلیغ کا ذریعہ بنتے۔ بروایتے اُس ایک سال کی مدت میں مسلمانوں کی تعداد میں جو اضافہ ہُوا وہ اس سے پہلے کی پوری مدت میں بھی نہیں ہُوا تھا۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے، ''یہ مدت گزرنے نہیں پائی اور قریب تھا کہ اسلام تمام اہلِ مکّہ پر چھا جائے۔'' [1]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○



[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۶۰

حضرت زینب علیہا السلام کی ولادت

(۵ جمادی الاوّل ۶ ہجری)

جناب زینب علیہا السلام، حضرت امام علی علیہ السلام اور سیّدۃ النساء العالمین حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی صاحبزادی اور امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی حقیقی بہن ہیں۔ آپ علیہا السلام کی ولادت باسعادت ۵ جمادی الاوّل ۶ ہجری کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔[۱]

احادیثِ مبارکہ کے مطابق آپ علیہا السلام کا نام گرامی ''زینب'' حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود رکھا۔ بعض موارد میں ہے کہ جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آئے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زینب علیہا السلام کا بوسہ لیا اور فرمایا، ''میری اُمّت کے حاضرین اور غائبین کو میری نواسی زینب علیہا السلام کی کرامت سے آگاہ کرو کہ یہ اپنی نانی خدیجہ علیہا السلام کی طرح ہے۔[۲]

لغت میں زینب کے معانی ''نیک منظر'' اور ''خوشبودار درخت''[۳] اور ''باپ کی زینت''[۴] مرقوم ہیں۔ آپ کا مشہور لقب ثانی زہرا ہے، اس کے علاوہ مندرجہ ذیل القاب بھی بہت معروف ہیں:

عقیلة بنی هاشم، عالمة غیرمعلمة، عارفة، موثّقة، فاضلة، کاملة، عابدة آل علی، معصومة صغریٰ، امینة الله، نائبة الزهرا، نائبة الحُسین، عقیلة النساء، شریکة الشُهداء، بلیغة، فصیحة اور شریکة الحُسین۔[۵]

---

[۱] عمر رضا کحالہ، (متوفی: ۱۴۰۳ھ، دمشق) اعلام النساء، ج ۲ ص ۹۱

ابوالحسن العلوی، اخبار الزینبیات، ۱۴۱۰ق، ص ۲۳

ذبیح اللہ محلاتی، (متوفی: ۱۳۶۴ش، رے) ریاحین الشریعہ، ج ۳ ص ۳۳

محمدی اشتہاردی، حضرت زینب (علیہا السلام) فروغ تابان کوثر، ص ۱۷

[۲] ابوجعفر محمد بن یعقوب بن اسحٰق کلینی (متوفی: ۳۲۹ھ، بغداد، عراق) الکافی، ج ۱ ص ۲۹۱

[۳] محمد بن مکرم ابن منظور، (متوفی: ۷۱۱ھ، قاہرہ) لسان العرب، ۱۴۱۴ق، ج ۱ ص ۴۵۳

[۴] سیّد مرتضیٰ زبیدی، (متوفی: ۱۲۰۵ھ، قاہرہ) تاج العروس، ۱۴۱۴ق، ج ۲ ص ۶۰

[۵] سیّد نورالدین جزائری، (متوفی: ۱۱۵۸ق، ایران) الخصائصة الزینبیة، ۱۴۲۵ق، ص ۴۴

خیبر

(محرم ۷ ہجری/مئی جون ۶۲۸ء)

جدید راستوں اور پختہ سڑکوں کے ذریعے مدینہ سے خیبر کا فاصلہ ۱۷۶ کلومیٹر یا تقریباً ۱۰۹ میل ہے۔[۱] خیبر کا نام عمالقہ میں سے ایک شخص کے نام پر مشہور ہُوا، اُس شخص کے دوسرے بھائی کا نام یثرب تھا، مدینہ کو اُسی کی نسبت سے یثرب کہا جاتا تھا۔ ایک قول کے مطابق یہودیوں کی زبان میں خیبر کے معنی قلعے کے ہیں، اُس شہر میں کئی مضبوط قلعے، کھیت اور نخلستان تھے جن کی نسبت سے اسے خیبر کہا جاتا تھا۔[۲] خواجہ محمد لطیف انصاری لکھتے ہیں، ''خیبر عبرانی لفظ ہے جس کا ماخذ لفظ ''خبرد'' ہے جو قلعوں کے معانی میں ہے۔ خیبر مدینہ طیبہ سے شمال کی طرف یہودیوں کا ایک قصبہ تھا جہاں بہت سے قلعے تھے۔''[۳] مؤرّخ کے اے حمید (بیرسٹرایٹ لاء) لکھتے ہیں، ''خیبر مدینہ سے شام کی طرف واقع ہے۔ وہاں یہودیوں کی کئی بستیاں قائم تھیں۔ یہودیوں کو خیبر کے فلک بوس قلعوں پر بہت ناز تھا، اُنہیں یقین تھا کہ اُن کا ملک بہت زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے۔[۴] خیبر کی مہم ہجرت کے ساتویں سال کے آغاز میں، ماہ محرم کے وسط میں[۵] یا بقولے جمادی الاوّل میں[۶] یا بروایتے ۶ ہجری کے آخری ماہ ذی الحجہ میں پیش آئی۔[۷]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مدینہ اور اُس کے گردونواح کے یہودیوں نے ایک معاہدہ کیا تھا جسے تاریخ میں میثاقِ مدینہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُس معاہدے کے تحت اُنہوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت (یہودیوں کے نقطہ نظر سے حکومت) کو سیاسی طور پر قبول کیا تھا اور اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ بحیثیت رعایا رہنا تسلیم کیا تھا۔ اُنہوں نے عہد کیا کہ وہ امن سے رہیں گے اور مسلمانوں کے خلاف کوئی کاروائی

---

[۱] گوگل میپ (Google Map)

[۲] سید محسن امین عاملی (متوفی: ۱۹۵۳ء، دمشق)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۵۶

[۳] خواجہ محمد لطیف انصاری، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۱۵۰

[۴] مسٹر کے اے حمید بی اے (لندن) بیرسٹرایٹ لاء لاہور، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۲ ص ۸۳

[۵] ابوالفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام)، تاریخ ابوالفداء، ج ۱ ص ۱۴۷

[۶] سید محسن امین عاملی (متوفی: ۱۹۵۳ء، دمشق) اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۵۶

[۷] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ

نہیں کریں گے، بلکہ مسلمانوں کے کسی حریف کا ساتھ بھی نہیں دیں گے اور اگر مسلمانوں کے خلاف کوئی بیرونی دشمن سر اُٹھائے گا تو وہ مسلمانوں کی حمایت کریں گے۔ لیکن اس کے برعکس یہودیوں نے در پردہ اور بسا اوقات کھلم کھلا اسلامی حکومت کے خلاف کئی گھناونی سازشیں کیں حتیٰ کہ مشرکینِ مکّہ کا ساتھ بھی دیا۔ اس بغاوت کی پاداش میں یہودیوں کے خلاف کی گئی کاروائیاں، جنہیں ''تادیبی کاروائیاں'' کہا جاسکتا ہے، بیان کی جاچکی ہیں۔ اُن کاروائیوں کے ذریعے یہودیوں کو مدینہ بدر بھی کیا گیا تھا جن میں سے اکثر خیبر چلے گئے تھے۔ خیبر کے یہودیوں نے مخالف جماعتوں کے ساتھ ساز باز کر کے کئی قبیلوں کو اپنے ساتھ ملالیا اور ایک خفیہ معاہدہ کیا کہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلامی حکومت کو تاراج کر دیا جائے اور اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو ہمیشہ کے لئے خیبر کی نصف پیداوار اپنے حلیفوں کو دیں گے۔[1] چنانچہ چھ ہجری کے اواخر میں خیبر کے یہودیوں نے اپنے حلیف قبیلے غطفان اور یثرب کے کئی چھوٹے موٹے قبائل کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملالیا۔ رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کے ناپاک عزائم کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جوابی کاروائی کی تیاری شروع کر دی۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محرّم سات ہجری میں حضرت سباع بن عُرفطہ غفاریؓ کو مدینہ کا نگران مقرر فرمایا اور سولہ سو (۱۶۰۰) مجاہدین کے ساتھ جن میں دوسو (۲۰۰) سوار اور چند رضا کار خواتین تھیں[2] یا چودہ سو (۱۴۰۰) مسلمان جن میں بیس (۲۰) خواتین تھیں،[3] خیبر کی طرف پیش قدمی فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگی اُمور اور عسکری منصوبہ بندی کے ماہر تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برق رفتاری سے رجیع پہنچ کر چھاؤنی ڈال دی۔ یہ غطفان اور خیبر کے درمیان عسکری نوعیت کا ایک اہم ترین مقام تھا۔ یہاں چھاؤنی قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ غطفان سے خیبر جانے والی شاہراہ کو کاٹ دیا جائے تا کہ غطفان خیبر کے یہود کو کمک نہ پہنچا سکیں اور اسلامی لشکر پر عقب سے حملہ آور نہ ہو سکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حکمت عملی کا نتیجہ فوراً ہی سامنے آ گیا۔ بنی غطفان کو جب خبر ہوئی کہ اسلامی لشکر خیبر کی طرف پیش قدمی کر چکا ہے تو وہ عقب سے حملہ آور ہونے کے لئے تیزی سے روانہ ہوئے مگر رجیع پر لشکرِ اسلام کو جارحانہ انداز میں صف آراء دیکھ کر ششدر رہ

---

[1] مسٹر کے اے حمید، بی اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لاء لاہور، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۲ ص ۸۳

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور)، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۰

[3] مسٹر کے اے حمید بی اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لاء لاہور، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۲ ص ۸۳

گئے۔ عقب سے حملہ کرنے کا اب کوئی راستہ نہیں تھا، لشکرِ اسلام سے ٹکرانے کا مطلب خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا چنانچہ وہ ناکام و نامراد واپس بھاگ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رجیع کو اپنا عسکری صدر مقام بنایا، سامانِ رسد اور خواتین کا کیمپ بھی یہیں لگوایا اور لشکر کی ایک ٹکڑی اُن پر متعین کر کے خیبر کی طرف کوچ فرمایا۔ سپہ سالارِ اعظم رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی تیزی سے خیبر پہنچے کہ اسلامی لشکر کو دیکھ کر یہود سراسیمہ ہو کر اپنے قلعوں میں دبک گئے۔ وہاں اُن کے آٹھ قلعے تھے۔ ایک طرف الوطیح، صعب بن معاذ، الشق اور النّاعم تھے اور دوسری طرف الکتیبہ، السُّلالم اور القموص یا القیموس تھے۔[1] مؤرخ کے اے حمید کے مطابق وہ دس قلعے تھے جن میں دس ہزار (۱۰۰۰۰) فوج ہر وقت لڑنے کے لئے تیار رہتی تھی۔[2] طبرسی لکھتے ہیں خیبر میں چودہ ہزار (۱۴۰۰۰) یہودی قلعہ بند تھے۔[3] قلعہ قموص یا قیموس، ان قلعوں میں سب سے زیادہ مضبوط تھا اور مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع تھا، قموص درحقیقت اُسی پہاڑی کا نام تھا جس کی نسبت سے اُسے قلعہ قموص کہا جاتا تھا۔[4] یہ قلعہ اُس پوری یہودی ریاست کو محفوظ کرنے والا باب تھا اس لئے اس قلعہ قموص پر ہی ''خیبر'' کا اطلاق ہوتا تھا۔[5] کچھ ایسا ہی دیگر کتب مثلاً فتح الباری اور فاتحِ خیبر میں بھی منقول ہے کہ قموص نامی قلعہ تمام قلعوں سے زیادہ مستحکم و عظیم تھا اور یہی قلعہ بسبب اپنی عظمت و استحکام کے اس خبر میں جس کا ذِکر اُوپر ہُوا ہے خیبر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔[6]

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود کو پیشکش کی کہ دائرہ ایمان میں داخل ہو کر امان حاصل کر لو، لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حملے کا حکم صادر فرما دیا۔ سب سے پہلے قلعہ الوطاط پر حملہ ہُوا اور وہ فتح ہو گیا، پھر قلعہ الناعم اور قلعہ صعب بھی سر ہو گئے۔ اب قلعہ قموص کی باری تھی لیکن اُسے حاصل کرنا دشوار ثابت ہُوا چنانچہ اُس کا محاصرہ طول پکڑ گیا۔[7]

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور)، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۱

[2] مسٹر کے اے حمید بی اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لاء لاہور، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۲ ص ۸۳

[3] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ

[4] شہاب الدین ابوعبداللہ یاقوت الحموی (متوفی: ۱۲۲۹ء، حلب) معجم البلدان، ج ۷ ص ۱۶۹

حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۱۵۷۴ء، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۱۴۸

[5] شہاب الدین قسطلانی (متوفی: ۱۵۱۷، قاہرہ)، المواھب اللدنیہ، ج ۲ ص ۲۲۳۰

[6] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۶۹ بحوالہ: فتح الباری، فاتح خیبر، ص ۹

[7] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۲

ابتدائی ناکامی:

قلعہ قموص، جو خیبر کا مضبوط ترین قلعہ تھا اور جسے سر کرنا دشوار ترین ثابت ہُوا، اُس کو فتح کرنے میں ناکامی کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ اُس قلعے کے محاصرے کے دوران دردِ شقیقہ کی وجہ سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزاج ناساز ہوگیا[1] اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قلعہ سر کرنے کی مہم میں بنفسِ نفیس شامل نہ ہو سکے۔ دوسرا سبب تھا شیرِ خدا علی علیہ السلام کی عدم موجودگی۔ علی علیہ السلام اب تک ہر جنگ میں پیش پیش تھے مگر آشوبِ چشم میں مبتلا ہونے کی وجہ سے خیبر کی مہم میں شامل نہیں ہو سکے تھے۔[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علالت کے دوران کچھ مسلمان خود ہی علم لے کر میدان میں جاتے رہے اور اپنی سی کوشش کرتے رہے مگر کسی سے قلعہ فتح نہ ہُوا، عنانِ مراد ہاتھ نہ آئی اور وہ بے نیل و مرام ہی واپس لوٹتے رہے۔[3]

فاتحِ خیبر کا انتخاب اور عطائے علم:

اہلِ سنت کے معروف سیرت نگار شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''ازل سے ارادۂ الٰہی اِسی پر تھا کہ یہ فضلِ خاص یعنی فتحِ خیبر حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے ساتھ مزید خصوصیت کے ساتھ شامل ہو، اور قلعہ قموص خیبر کے تمام قلعوں سے زیادہ سخت اور مستحکم تھا اس لیے اُس کو آپ کے ہاتھ پر فتح کرایا اور اُسے خیبر کے تمام قلعوں اور اُن کے شہروں کا مقدمہ اور اساس بنایا۔ اگرچہ اُن میں سے کچھ قلعے مثلاً نطاۃ (نطاط) اور صعب وغیرہ اس سے پہلے فتح ہو چکے تھے لیکن تمام فتحِ خیبر اور اکمال جناب علی المرتضیٰ علیہ السلام سے منسوب ہے۔ پس ایک رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، '' لَاُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلاً يُحِبُّهُ اللهُ وَرَسُوْلُهُ يَفْتَحُ اللهُ عَلَيْهِ○ ''، یعنی کل وہ شخص جھنڈا لے گا جس کو اللہ اور اُس کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پسند فرماتے ہیں اور اللہ اُس پر فتح دے گا۔ ایک روایت میں آیا ہے '' رَجُلٌ كَرَّارًا غَيْرَ فَرَّارٍ○ ''، یعنی وہ مرد بار بار پلٹ کر دشمن پر حملہ کرے گا اور فرار نہیں ہوگا۔ ''روضۃ الاحباب'' میں اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے

---

[1] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۱۵۷۴ء) تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۳

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۷
حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۱۵۷۴ء، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۳

[3] ابوالفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابو الفداء، ج ۱ ص ۱۸۷
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۶

کہ وہ شخص بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والا ہے اور پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے۔[1] بروایتے، رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَّجُلاً یُحِبُّ اللہُ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبہُ اللہ وَرَسُوْلَہٗ○''[2] (ضرور بالضرور کل میں یہ علم اُس آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محبوب رکھتا ہوگا اور اللہ اور اُس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُسے محبوب رکھتے ہوں گے)۔ اسی طرح کے الفاظ الگ الگ روایتوں میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ وارد ہوئے ہیں مثلاً تاریخ ابوالفداء میں ہے: ''اَما وَاللہ لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَّجُلاً یُحِبُّ اللہُ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّہُ اللہ وَرَسُوْلَہٗ کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ یاخذھا عنوۃ○''[3] (معلوم ہونا چاہئے کہ قسم اللہ کی میں لازمی طور یہ علم کل اُس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اُس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس سے محبت کرتے ہیں، وہ بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہے، بھاگنے والا نہیں اور وہ اس قلعے کو قوّت وطاقت کے ساتھ حاصل کرے گا۔) اعلام الوریٰ میں ہے: ''لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَّجُلاً کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ یُحِبَّ اللہ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّہُ اللہ وَرَسُوْلُہٗ لَا یرجِعَ حَتی یفْتَحِ اللہُ علیٰ یَدَیْہِ○''[4] (میں لازمی طور یہ علم کل اُس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُسے دوست رکھتے ہیں۔ وہ بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہے، ایسا جو بھاگنے والا نہیں اور اللہ اُس کے ہاتھ پر فتح ونصرت عطا کرے گا۔) ابن ہشام نے لکھا ہے: ''لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَّجُلاً یَحِبُّ اللہُ وَرَسُوْلَہٗ یَفْتَحِ اللہ عَلیٰ یَدَیْہِ لیس بِفَرار○''[5] (میں لازمی طور یہ علم کل اُس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہے اور اللہ اُس کے ہاتھ پر فتح ونصرت عطا کرے گا اور وہ بھاگنے والا نہیں۔)

پس، جب زبانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ اعلان ہُوا تو ہر ایک کے دِل میں یہ حسرت پیدا ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے علم عطا فرمائیں۔ وہ بارگاہِ رسالت میں دوزانو ہوکر اور گھٹنوں کے بل بیٹھے اور

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۶، ۲۹۷ بحوالہ: روضۃ الاحباب

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۷۰

[3] ابوالفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابو الفداء، ج ۱ ص ۱۴۷

[4] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ

[5] ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) تاریخ ابنِ ہشام، ج ۲ ص ۱۸۷

گردنیں لمبی کر کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پُر اُمید نظروں سے دیکھنے لگے۔ [1]

اسد اللہ الغالب علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی شجاعت اور مردانگی سے سبھی واقف تھے اس لیے جانتے تھے کہ عطائے علم کے واحد حقدار تو وہی ہیں لیکن دل کو اطمینان یہ تھا کہ وہ آشوبِ چشم میں مبتلا ہونے کیوجہ سے اس مہم پر آئے ہی نہیں۔ پس اُن کی عدم موجودگی میں اُس خاص علمدار کا انتخاب باقی ماندہ لوگوں میں سے ہی ہوگا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں، ''ایک جماعت دوسرے سے کہتی تھی، ''یہ تو طے سمجھو کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام تو اس مراد سے فائز نہ ہوں گے کیونکہ اُن کی آنکھیں اس شدت سے درد کرتی ہیں کہ وہ اپنے پاؤں تک نہیں دیکھ سکتے۔'' [2] معروف مؤرّخ طبرسی لکھتے ہیں، ''قریش کے لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ علی علیہ السلام کے میدان میں آنے کا خطرہ تو ہے ہی نہیں کیونکہ اُن کی آنکھیں اس شدت سے دُکھتی ہیں کہ وہ اپنے پیر رکھنے کی جگہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔'' [3]

اُدھر مدینہ میں حضرت علی علیہ السلام کا دل سخت بے قرار اور مضمحل تھا اور ایک ہی خیال دامن گیر تھا کہ آنکھ کی تکلیف کے سبب خیبر کی مہم میں رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمرکابی کے شرف سے محروم رہ گئے۔ پس اللہ کے حضور دُعا گو ہوئے، ''اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ○'' (الٰہی! جب تُو عطا کرنا چاہے تو کوئی روکنے والا نہیں اور جب تُو روکنے والا ہے تو کوئی دینے والا نہیں۔) چنانچہ جاں نثارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہ رہا گیا اور علالت میں ہی مدینہ طیبہ سے نکلے اور خیبر کی طرف چل دیئے۔ اُدھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی آپ کی روانگی کی خبر ہوگئی۔ خیبر کے اُفق پر اگلے دن کا وہ آفتاب طلوع ہو چکا تھا جس سے کئی لوگوں کی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ لوگ پیکرِ آس بنے رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیکھ رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) کہاں ہیں؟'' فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں کو اپنی اُمیدوں کے چراغ گُل ہوتے ہوئے نظر آئے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ یہیں ہیں لیکن اُن کی آنکھیں اتنا

---

[1] ابوالفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) ابوالفداء، ج ۱ ص ۱۴۰
ابی جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۳ ص ۹۳
طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ
حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۱۵۷۴ء، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۸
[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت ج ۲ ص ۲۹۶
[3] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ

درد کرتی ہیں کہ وہ اپنے پاؤں تک کو نہیں دیکھ سکتے۔ فرمایا، ''اُنھیں میرے پاس لاؤ۔''[1]

حضرت مسلمہؓ بن الاکوع گئے اور علی علیہ السلام کو ہاتھ سے تھام کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کے سر کو اپنے زانو پر رکھا، اپنا لعابِ دَہن اُن کی آنکھوں میں لگایا اور دُعا مانگی۔ اُسی وقت علی علیہ السلام کی آنکھ کا درد جاتا رہا اور شفائے کلی حاصل ہوگئی۔

بروایتے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دُعا بھی مانگی، ''اَللّٰھُمَّ اَذْھِبْ عَنْہُ الْحَرَّ وَ الْقَرَّا○'' یعنی اے خدا! اِن سے گرمی اور سردی دونوں کو دُور رکھ۔ ابنِ لیلیٰ کہتے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام سخت گرمی میں روئی کا لباس اور سخت سردی میں باریک کپڑے کا لباس زیب تن فرما لیتے تو بھی اُنہیں کوئی ضرر نہ پہنچتا تھا۔ پس جب علی علیہ السلام نے آشوبِ چشم سے نجات پائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں اپنی خاص زِرّہ پہنائی، اُن کے میان سے تلوار باندھی اور فرمایا، ''جاؤ التفات نہ کرنا جب تک کہ حق تعالیٰ تمہارے ہاتھ سے قلعہ فتح نہ کروادے۔'' اس کے بعد حضرت علی (علیہ السلام) جھنڈا لے کر روانہ ہوئے۔[2] مورخ دیار بکری نے لکھا ہے، ''علی علیہ السلام شفایاب ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی فولادی زِرّہ اُن کو زیب تن فرمائی اور ذوالفقار اُن کی کمر میں لگائی اور پھر علم عطا فرمایا۔''[3] علامہ طبرسی نے لکھا ہے، ''علی علیہ السلام کو ہاتھ سے پکڑ کر لایا گیا تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کا سر اپنے زانو پر رکھ کر آنکھوں میں اپنا لعابِ دَہن ڈالا تو فوراً آنکھیں صحیح وسالم ہوگئیں۔ اس کے بعد اُن کو اپنا جھنڈا دے دیا۔''[4] طبری نے بھی کچھ ایسا ہی لکھا ہے، ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو بلایا۔ اُن کو آشوبِ چشم تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی آنکھوں پر اپنا لعابِ دَہن لگایا اور اپنا جھنڈا اُن کو دیا۔''[5] سیرت ابنِ ہشام میں ہے، ''حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۶
علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۷۵ بحوالہ:
علامہ طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری)، اعلام الوریٰ
حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۱۵۷۴ء، مکہ)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۸

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۷

[3] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۱۵۷۴ء، مکہ)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۹

[4] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ

[5] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۲۷۵

بلایا اس عالم میں کہ وہ آشوبِ چشم میں مبتلا تھے تو اُن کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن ڈالا پھر فرمایا اب یہ علم لے جاؤ کہ اللہ تمہارے ہاتھوں فتح کی صورت نصیب کرے۔''[1] معروف مؤرّخ واقدی لکھتے ہیں،''لوگ آ کر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے۔ جب تمام لوگ اپنے اپنے جھنڈوں سمیت آ گئے تو حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے علم کو ہاتھ میں لے کر جنبش دی اور اپنے پروردگار سے دُعا مانگی پھر اُسے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے حوالے کر دیا۔''[2]

جناب امیر علیہ السلام کا اندازِ وُرُود:

وہ علم جسے پانے کی آرزُو ہر مسلمان کے دِل کی حسرتِ ناکام بن کے رہ گئی تھی، جناب امیر المومنین علیہ السلام کو عطا ہُوا تو آپ کی چال میں عجب وقار اور رفتار میں بلا کی تیزی عَود کر آئی اور آپ برق رفتاری کے ساتھ میدان کی طرف بڑھے۔ مؤرّخین لکھتے ہیں،''علم پانے کے بعد حضرت علی علیہ السلام دوڑتے ہوئے میدان کی طرف روانہ ہوئے۔''[3] حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے،''آپ اتنی جلدی روانہ ہوئے کہ ہمیں ہتھیار لگانا مشکل ہو گئے اور سعد بن وقاص نے پکار کر کہا،''اے ابوالحسن علیہ السلام! ٹھہریے کہ اور لوگ بھی پہنچ جائیں۔'' ایک جگہ جابرؓ کا بیان یوں ہے کہ لوگ کہہ رہے تھے،''یا علی علیہ السلام! رحم کیجیے، یعنی اتنی جلدی نہ کیجیے۔''[4]

حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام جنہیں اَسدُ اللہ (اللہ کا شیر) اور یَدُ اللہ (اللہ کا ہاتھ) بھی کہا جاتا ہے، جھنڈا ہاتھ میں لئے قلعہ قموص کی جانب بڑھے، آپ قلعے کے نیچے پہنچے تو اُسے ایک چٹان پر گاڑ دیا۔ ایک یہودی عالم نے جو قلعے کے اُوپر کھڑا تھا پوچھا،''اے صاحبِ علم! تُو کون ہے؟'' فرمایا،''میں علی

---

[1] ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ، ج ۲ ص ۱۸۴
ابوالفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام)، تاریخ ابو الفداء، ج ۱ ص ۱۴۷

[2] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی: ۸۲۲ء)، کتاب المغازی للواقدی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۵ء ج ۱ ص ۳۹۱

[3] طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ
ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ، ج ۲ ص ۱۸۷
حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۱۵۷۴ء، مکہ)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۹

[4] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۸۱
ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ، ج ۲ ص ۱۸۴
حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۱۵۷۴ء، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۹

ابنِ ابی طالب ہوں۔'' اس پر وہ یہودی عالم اپنی قوم سے کہنے لگا، ''قسم ہے تورات کی! تم اِس شخص سے مغلوب ہوجاؤ گے، یہ فتح حاصل کیے بغیر نہیں لوٹے گا۔'' منقول ہے کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت کا ذکر توریت میں پڑھ چکا تھا۔ [1]

اپنے عالم دینِ کی تنبیہ پر یہودیوں نے شاید توجہ نہیں دی تھی یا اُنہیں اپنی طاقت کا زُعم تھا کہ شیرِ خدا علی علیہ السلام قلعے کے نیچے پہنچے تو قلعے کے سردار مرحب کا بھائی حارث جو اُس کا دستِ راست اور نائب بھی تھا، علی علیہ السلام کے مقابل آ گیا۔ بروایتے اُس کا نیزہ تین من کا تھا اور وہ اس معرکے میں کئی مسلمانوں کو شہید کر چکا تھا۔ وہ علی علیہ السلام کے مقابل آیا تو آپ نے ایک ہی وار سے اُسے جہنم واصل کر دیا۔ اُس کے بعد ''عنتر'' اور پھر کچھ اور بہادروں نے یکے بعد دیگرے علی علیہ السلام سے مقابلہ کیا لیکن سبھی ذوالفقارِ حیدری کا لقمہ بن گئے۔ [2] اپنے بھائی کے مارے جانے کے بعد مرحب بہادروں کی ایک جماعت کے ساتھ انتقام لینے باہر نکلا۔ وہ بہت بلند قامت اور جنگجو شخص تھا۔ خیبر کے بہادروں میں اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا اور اُس کی بہادری کا ڈنکا تمام خیبر میں بجتا تھا۔ اُس روز وہ دو دو زِرّہیں پہن کر اور دو دو تلواریں حمائل کر کے میدان میں نکلا۔ اُس نے دو عمامے باندھے ہوئے تھے جن کے اُوپر خود بھی پہن رکھا تھا۔ وہ یہ رَجَز پڑھتا ہُوا میدان میں نکلا:

قَدْ عَلِمَتْ خَيْبَرُ اَنِّيْ مَرْحَبُ ○ شَاكِي السَّلَاحِ بَطَلٌ مُجَرَّبُ ○

(سارا خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، مسلح، دلاور جنگ آزمودہ)

علی ابن ابی طالب علیہ السلام یہ رَجَز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

اَنَا الَّذِيْ سَمَّتْنِي اُمِّيْ حَيْدَرَةً ○ ضَرْغَامُ آجَامٍ وَلَيْثُ قَسْوَرَةً ○

(میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے، میں ضِرغام ہوں، آجام ہوں اور حملہ آور لیث ہوں)

ضرغام، آجام اور لیث، یہ تینوں شیر کے مترادف المعنی الفاظ ہیں۔ [3]

مرحب نے حضرت علی علیہ السلام کے سر اقدس پر تلوار کا وار کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے ذوالفقارِ حیدری

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۸

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۸۱

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۸

بجلی کی طرح کوندی۔ مرحب نے ذوالفقار کو اپنی ڈھال پر روکنا چاہا لیکن وہ اُسے کاٹتی ہوئی اُس کے خود پر گری اور پھر خود کو، دو عماموں کو اور سر کو کاٹتی ہوئی اُس کے دانتوں تک پہنچ گئی۔[1] بروایتے علی علیہ السلام کی تلوار اُس غدار کا خود کاٹتی ہوئی، سر کو چیرتی ہوئی حلق تک جا پہنچی اور بقولے حلق سے بھی نیچے اُس کی رانوں تک چلی گئی تھی۔ ایک روایت ہے کہ ذوالفقارِ حیدری اُس کی زین تک جا پہنچی۔[2] پس ''مسلح، دلاور جنگ آزمودہ'' مرحب کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ تاریخ طبری میں ہے کہ ضربِ حیدری کی گونج اتنی تھی کہ اہلِ لشکر نے بھی سنی۔[3]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''اس کے بعد اہلِ اسلام، حضرت امیر علیہ السلام کی مدد کے ساتھ میدان میں اُترے اور یہودیوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ یہود کے بہادروں میں سے سات کو آپ نے جہنم رسید کر دیا، باقی ہزیمت اُٹھا کر قلعے میں داخل ہو گئے۔ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام بھی قلعے کی طرف بڑھتے چلے گئے، ایسے میں ایک یہودی راہ میں حائل ہُوا اور آپ کے دستِ اقدس پر وار کیا۔ آپ کی ڈھال زمین پر گر پڑی۔ دوسرا یہودی اُسے اُٹھا کر بھاگ کھڑا ہُوا۔ جناب امیر علیہ السلام کو جوش آیا۔ قُوتِ ربّانی کی طرف سے ایسی روحانی قُوّت وارد ہوئی کہ آپ خندق پھلانگ کر قلعے کے دروازے پر جا پہنچے۔ آپ نے اُس آہنی دروازے کا ایک پٹ اُکھاڑا اور اُسے ڈھال بنا کر جنگ میں مشغول ہو گئے۔'' عبدالحق محدث دہلوی آگے لکھتے ہیں، ''سیّدنا امام باقر سلامُ اللہ عَلَیْہ وَعلیٰ آباءِ العظامُ وَاَوْلادِہِ الکرامُ سے منقول ہے کہ جب علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ نے درِ خیبر کو اکھاڑنے کے لیے جھنجوڑا تو سارا قلعہ کانپنے لگا۔ حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب تخت سے گر پڑیں اور اُن کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ غالباً حضرت صفیہ میں یہ جنبش سرایت کرنے میں حکمت وعلامت اور خاص مناسبت ہو جس کی بنا پر وہ اسیر ہوئیں اور آخر میں سیّد عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقد میں آئیں تا کہ وہ متنبہ ہو جائیں اور اُن میں اس دولت وسعادت کے قبول کرنے کی صلاحیت واستعداد پیدا ہو جائے۔ اربابِ سیر بیان کرتے ہیں کہ جنگ سے فارغ ہونے کے بعد جناب امیر علیہ السلام

---

[1] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی: ۱۵۷۴ء، مکہ) تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۵۰
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۷۶

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۸

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۸۲
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، مطبع حسینیہ، مصر، ج ۳ ص ۹۳

نے اُس دروازے کو پسِ پُشت پھینک دیا۔ بقولے بعد میں سات قوی وتنومند آدمیوں نے مل کر اس در کو ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر پلٹنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے پھر چالیس آدمیوں نے مل کر چاہا کہ اُسے اُٹھالیں مگر عاجز رہ گئے۔ ''رَوضۃُ الاحباب''، ''معارجُ النبوۃ'' اور سیر کی دیگر کتب میں ایسا ہی منقول ہے۔ ''معارجُ النبوۃ'' میں منقول ہے کہ اُس کا وزن آٹھ سو من تھا۔ ''المواھبُ اللدُنیۃ'' میں مروی ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام نے جس بابِ خیبر کو اُکھاڑا تھا اُسے ستر آدمی انتہائی مشقت اور کوشش کے باوجود ہلا تک نہ سکے۔ ابنِ اسحٰق کی روایت میں سات آدمی مذکور ہیں اور حاکم، بیہقی، لیث بن ابی سلیم سے، وہ حضرت ابوجعفر محمد بن علی بن حسین علیہم السلام سے اور وہ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے جس درِ خیبر کو اُکھاڑ کر اُٹھالیا تھا اُسے بعد میں چالیس آدمی بھی نہ اُٹھا سکے۔ جب قموص اور خیبر کے تمام قلعے والوں نے حضرت امیر علیہ السلام کی اس قوت وقدرت کا مشاہدہ کیا تو وہ سب فریاد کرنے لگے، ''اَلامان اَلامان۔'' اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارے سے اُن کو اس شرط پر امان دے دی کہ ہر آدمی اُونٹ پر خوراک لاد کر ان شہروں سے نکل جائے اور نقدی اور تمام ساز وسامان اور اسلحہ مسلمانوں کے لئے چھوڑ دے۔ حضرت علی علیہ السلام اس مہم کو سر کرنے کے بعد بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیمے سے باہر تشریف لا کر آپ کا استقبال کیا، پھر آغوشِ اقدس میں لیا اور دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دے کر فرمایا، ''بَلَغَنِیْ ثَنَاءُكَ الْمَشْكُوْرُ وَ صَنِیْعُكَ الْمَذْكُوْرُ قَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَرَضِیْتُ اَنَا عَنْكَ○'' (تمہاری مشکورانہ تعریفیں مجھ تک پہنچیں اور تمہاری بہادری کے واقعات بیان ہوئے، بے شک اللہ ان سے راضی ہُوا اور میں بھی تم سے راضی ہُوا) اس پر جناب امیر علیہ السلام آبدیدہ ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''علی! یہ رونا خوشی کا ہے یا غم کا؟'' عرض کی، ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ آنسو خوشی کے ہیں اور میں اس پر کیوں نہ خوش ہوؤں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھ سے راضی ہیں۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''علی! میں اکیلا ہی تم سے راضی نہیں بلکہ اللہ اور جبرائیل اور میکائیل اور تمام فرشتے بھی تم سے راضی ہیں۔''[1] اس کے بعد دوسری جانب کے باقی تین قلعوں الکتیبہ، الوطیع

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۸ تا ۳۰۰ بحوالہ: روضۃ الاحباب، المواہب اللدنیہ، معارج النبوۃ وغیرہ

اور السّلالم کا محاصرہ کیا گیا۔ چودہ دن کے بعد یہود نے ہتھیار ڈال دیئے اور سارا خیبر فتح ہو گیا۔ [1]

منقول ہے قلعہ قموص سے ایک سو (۱۰۰) زِرّہیں، چار سو (۴۰۰) تلواریں، ایک ہزار (۱۰۰۰) نیزے، پانچ سو (۵۰۰) کمانیں اور بے شمار ساز و سامان اور دولت مالِ غنیمت میں حاصل ہُوا جس میں سے پانچواں حصّہ (خمس) نکال کر باقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ یہود کی غداری کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی جاں بخشی کر کے اُن پر احسان فرمایا اور خیبر سے نکل جانے کا حکم دیا، اس پر اُنہوں نے عرض کی کہ ہمیں ان کھیتوں اور باغوں میں اُجرت پر رکھ لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہربانی کرتے ہوئے اُن کی گذارش کو قبول فرمایا اور پیداوار کا نصف حصّہ اُن کی اُجرت مقرر فرما کر اُنہیں رکھ لیا۔ اس معاملے کو مؤرّخین نے ''مخابرہ'' یعنی خیبر والوں کا معاملہ لکھا ہے۔ [2]

حضرت صفیہؓ بنت حیی بن اخطب:

حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب خیبر کے سردار کنانہ بن ابی الحقیق کی زوجہ تھیں جو اس معرکے میں مارا گیا تھا۔ [3] جنگ کے اختتام پر حضرت علی علیہ السلام نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤ، وہ ان کے ساتھ جو مناسب سمجھیں گے وہ سلوک کریں گے۔ اس سے حضرت علی علیہ السلام کی رواداری اور اعلیٰ ظرفی کا علم ہوتا ہے جو آپ نے اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھا کہ کسی قوم کے سردار کی خواتین کے ساتھ عام قیدیوں کا سا برتاؤ نہیں کیا جاتا بلکہ اُن کے ساتھ اُن کے شایانِ شان سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضرت صفیہ کو اُس طرف سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے جس طرف مقتولین کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ لاشے دیکھ کر اُن کی حالت غیر ہو گئی۔ شاید حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اس پر غور نہیں کیا ہو گا کہ ایک صنفِ نازک کے لئے اپنے عزیز مقتولین کی لاشوں کو دیکھنا کتنا کرب ناک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب معلوم ہُوا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا، ''بلال! کیا تمہارے دِل سے رحم بالکل جاتا رہا تھا؟'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کو آزاد کر دیا اور پھر (اُنھیں سہارا دینے کے لئے عدت کے بعد اُن کی مرضی سے) اُن سے نکاح کیا۔ [4]

اس واقعہ سے واضح ہے کہ نبی گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اُن کے ساتھ شاہانہ سلوک کیا گیا۔

---

[1] محمد بن اسماعیل بخاری (متوفی: ۸۷۰ء، خرتنگ، ازبکستان) صحیح بخاری، کتاب الفضائل، باب غزوہ خیبر

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۰۱

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۰۴

[4] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ

یعنی یہ نہیں ہُوا کہ اُنھیں کنیز سمجھ کر تصرف کیا گیا ہو بلکہ ایک آزاد عورت کی طرح عدت کے بعد اُن کا عقد ہُوا جس پر طرفین کا ایجاب وقبول یعنی رضامندی ایک لازمی جزو ہوتا ہے۔

مرحب کا قتل محمد بن مسلمہ کے کھاتے میں

کتاب ہذا کی تالیف کے دوران، میں نے یہ بات خصوصی طور پر پیشِ نظر رکھی ہے کہ اس میں متنازعہ معاملات (متنازعہ معاملات سے میری مراد یہ ہے کہ جن پر اسلام کے مختلف مکاتب فکر میں ایسا اختلافِ رائے پایا جاتا ہو کہ جس کو بیان کرنے سے کسی کی دل آزاری ہو) کو زیرِ بحث نہ لایا جائے۔ لیکن اب ایسی مشہور ومعروف اور غیر متنازعہ روایات کا کیا کیا جائے جنہیں محض بغضِ علی علیہ السلام کی بنا پر مسخ کر کے پیش کر دیا گیا ہو؟ ایسی ہی ایک جعلی روایت جسے عصرِ حاضر کے بعض ''مصنفین ومؤرّخین'' بڑھ چڑھ کر بیان کر رہے ہیں یہ ہے کہ جنگ خیبر میں مرحب کو حضرت علی علیہ السلام نے نہیں بلکہ محمد بن مسلمہ نے قتل کیا تھا۔ بعض لوگوں نے اس روایت میں اور طرح سے ڈنڈی ماردی ہے۔ اُن کے مطابق مرحب کے قتل کا سارا سامان تو محمد بن مسلمہ نے کر دیا تھا، علی علیہ السلام نے تو آخر میں آ کر مرتے ہوئے کو مارا۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے بھی نہایت اختصار کے ساتھ حقیقت بیان کرنے کے بعد ایسے ہی کسی ڈنڈی مار مؤرّخ یا مصنف کی روایت نقل کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ''اب قلعہ قیموس کی باری تھی، لیکن اُسے سر کرنا دُشوار ہو گیا اور محاصرہ طول پکڑ گیا۔ آخر کار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو علم عطا فرمایا۔ وہ میدانِ جنگ میں نکلے تو اُن کے مقابلے کے لئے مرحب آیا جو قوّت ودلیری میں سارے عرب میں مشہور تھا، لیکن حضرت علی نے اُسے قتل کر دیا اور ایک روایت میں ہے کہ مرحب نے چونکہ محمد بن مسلمہؓ کے بھائی کو پتھر گرا کر شہید کر دیا تھا لہٰذا اُنہوں نے بدلہ لینے کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لڑنے کی اجازت لی اور اس کی پنڈلیاں کاٹ ڈالیں اور اُسے تڑپتا چھوڑ دیا۔ بعد ازاں حضرت علی (علیہ السلام) نے اُسے قتل کر دیا۔''[1]

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اس سے اُوپر والے پیرائے میں قلعہ النّاعم کی فتح کا ذِکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''اس قلعے کے محاصرے کے دوران حضرت محمود بن مسلمہؓ شہید ہوئے تھے۔ کنانہ بن ابی الحقیق یا مرحب نے اُنہیں

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبرِ اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۲

قلعے کے نیچے سوتے دیکھ کر اُوپر سے پتھر گرا کر شہید کر دیا۔'' [1] ایک ''سوئے ہوئے'' شخص کو اُوپر سے پتھر گرا کر مار دینا ایک بزدلانہ اور گھٹیا سی حرکت ہے جو کسی بہادر کو زیب نہیں دیتی۔ مرحب اگرچہ یہودی تھا اور مقابلے میں مارا گیا لیکن وہ بزدل ہرگز نہیں تھا۔ وہ بزدل ہوتا تو علی علیہ السلام جیسے ناقابلِ تسخیر مردِ میدان کے مقابلے پر نہ آتا اور آ کر اپنی زبان سے یہ نہ کہتا:

''قَدْ عَلِمَتْ خَيْبَرُ اَنِّیْ مَرْحَبٌ ○ شَاكِی السِّلَاحِ بَطَلٌ مُجَرَّبٌ ○

(سارا خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، جنگوں کا مسلح ہیرو)

پہلی دلیل یہ ہے کہ مرحب واقعی پورے خیبر میں بہادر مشہور تھا پس اُسے وار کرنا ہوتا تو قلعے سے باہر نکل کر محمود بن مسلمہ کو للکارتا اور تلوار سے شہید کرتا، نہ کہ قلعے کے اُوپر سے پتھر گرا کر مار ڈالتا۔ پس محمود بن مسلمہ کو اُس نے نہیں بلکہ کنانہ ابنِ ابی الحقیق نے شہید کیا جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر نصیر احمد ناصر خود لکھ چکے ہیں کہ اُنہیں مرحب یا کنانہ ابنِ ابی الحقیق نے اُوپر سے پتھر گرا کر شہید کیا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر واقعی مرحب نے محمد بن مسلمہ کے بھائی محمود بن مسلمہ کو شہید کیا تھا اور محمد بن مسلمہ بھائی کا انتقام لینے مرحب کے مقابل گئے تھے اور اُس سے لڑ کر اُس کی پنڈلیاں کاٹ ڈالیں تھیں تو پھر اُسے قتل کیوں نہ کیا؟ جبکہ مرحب ہی قلعہ قموص کا طاقتور ترین پہلوان تھا اور اس معرکے کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کی شکست اور فتح کا انحصار ہی اُس پر تھا، پس اگر یہ جنگ محمد بن مسلمہ ہی نے جیتنا تھی تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام جیسے کرار اور غیر فرار کا انتظار اور اہتمام محض ایک اَدھ موئے اور لاچار آدمی کو مارنے کے لئے کیا؟

تیسری دلیل یہ ہے کہ تاریخ شاہد ہے کہ علی علیہ السلام کسی بھاگتے ہوئے یا لاچار آدمی کو قتل نہیں کرتے تھے۔ یہ تو ہے ہی شانِ علی علیہ السلام کے منافی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تڑپتے ہوئے مرحب کو جس کی پنڈلیاں کٹی ہوئی ہوں علی علیہ السلام نے قتل کیا ہو؟

اور چوتھی دلیل یہ ہے کہ کیا علی علیہ السلام کی ''اس'' دلیری پر اللہ، رسول اللہ اور ملائکہ راضی ہو رہے تھے؟ اور کثیر مؤرّخین و مؤلفین علی علیہ السلام کے قصیدے لکھ رہے تھے؟ کیا کسی اَدھ موئے شخص کو مارنا افتخار اور فضیلت کی بات ہے؟

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۲

اہلِ سنت کے مشہور سیرت نگار شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی معروف کتاب مدارج النبوّت میں خیبر فتح ہوجانے کے بعد کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنانہ بن ابی حقیق کو جو خیبر کے رئیسوں میں سے تھا محمد بن مسلمہ کے سپرد کردیا تاکہ وہ اُسے اپنے بھائی محمود کے عوض قتل کردیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین علی المرتضیٰ علیہ السلام کو قموص (خیبر) کی جانب بھیجتے وقت محمد بن مسلمہ سے فرمایا تھا کہ تمہیں بشارت ہو کہ کل تم اپنے بھائی کے قاتل کو قتل کرو گے۔''[1] پس عبدالحق محدث دہلوی نے بات بالکل واضح کردی۔ محمد بن مسلمہ کا مرحب سے انتقام لینا اور پنڈلیاں کاٹنا اور علی علیہ السلام کا بعد میں مرے ہوئے کو مارنا سب من گھڑت ہے اور اس من گھڑت کہانی کے خالق وہی ہوسکتے ہیں جنہیں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ہر فضیلت کھٹکتی ہے۔

آفتابِ امامت کے لئے آفتابِ فلک کی واپسی:

غزوۂ خیبر تاریخ میں جناب امیر المومنین علیہ السلام کے حوالے سے ہی جانا جاتا ہے۔ جناب علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کا آشوبِ چشم میں مبتلا ہوکر مدینہ میں ہی رُک جانا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے پیچھے اس حال میں خیبر پہنچنا کہ آپ کو پاؤں رکھنے کی جگہ بھی آشوبِ چشم کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتی تھی، پھر بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پہنچنا اور آغوشِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لیٹ کر آنکھوں میں لعابِ دہنِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لگوا کر شفایاب ہوجانا، اور دستِ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تاریخی پرچم کا عطا ہونا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہی مبارک ہاتھوں سے جنگ کے لئے آراستہ ہونا اور مرحب جیسے دلاور کو دولخت کردینا اور بابِ خیبر کو اُکھاڑ کر سپر بنالینا اور ناقابلِ تسخیر سمجھے جانے والے قلعہ خیبر کی اینٹ سے اینٹ بجادینا اور ملائکہ سے داد و تحسین وصول کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اُسی خیبر کی سرزمین پر ایک اور واقعہ بھی رونما ہُوا جسے مختصاتِ جناب علی علیہ السلام کی نسبت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور وہ ہے علی علیہ السلام کے لئے سورج کا واپس پلٹ کر آنا۔ روایت ہے، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیبر سے واپسی پر منزل صہبا پر پہنچے تو نمازِ عصر ادا فرمائی اور نماز پڑھنے کے بعد سرِ مبارک امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کے زانو پر رکھ کر سو گئے یہاں تک کہ وحی کے آثار نمودار ہوئے۔ علی علیہ السلام نے نمازِ عصر ابھی ادا نہیں کی تھی اور نزولِ وحی کا دورانیہ اتنا طویل ہوگیا تھا کہ آفتاب غروب ہوگیا۔ جب وحی کی

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۰۰

کیفیت ختم ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا، ''کیا عصر کی نماز پڑھ لی تھی''؟ عرض کی نہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں نہیں پڑھ سکا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں دُعا فرمائی، ''یارب! اگر علی (علیہ السلام) تیری اور تیرے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت میں تھے تو آفتاب کو حکم دے کہ وہ لوٹ آئے تاکہ یہ نمازِ عصر ادا کرلیں۔'' خداوند تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُعا قبول فرمائی اور سورج جو کہ غروب ہو چکا تھا پلٹ آیا یہاں تک کہ اُس کی شعاعیں پہاڑوں اور ٹیلوں پر پڑنے لگیں اور مخلوقِ خدا نے آنکھوں سے دیکھا۔ پس حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام نے وضو کیا اور نمازِ عصر ادا فرمائی۔ [1]

فدک:

فدک حجاز کی ایک بستی ہے جو اُس دَور میں مدینہ منوّرہ سے دو یا تین دن کی مسافت پر واقع تھی۔ خیبر کی فتح کے بعد اردگرد کے یہودیوں پر اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان وشوکت کا بہت گہرا اثر ہُوا تھا یہی وجہ تھی کہ فدک کے یہودیوں نے بغیر کسی لڑائی کے اپنی املاک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر کے مصالحت کرلی۔ [2] ابنِ شہاب زہری کی روایت کے مطابق یہ املاک مندرجہ ذیل سات قطعوں پر مشتمل تھیں:

۱)اعواف، ۲)برقہ، ۳)صافیہ، ۴)مسیب، ۵)حسنی، ۶)مشریہ اُمّ ابراہیم اور ۷)دلال۔ [3] ان قطعات میں بہت سارے نخلستان تھے۔ ۷ ہجری تک یہ املاک کفّارِ خیبر اور دیگر یہود کی ملکیت میں تھیں لیکن جنگِ خیبر کے بعد یہ تمام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چند مصالحتی شرائط پر تفویض ہوگئیں۔ اُن پر کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی اس لئے یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص ملکیت تھیں جن کی پیداوار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ضروریات پر صَرف کرتے اور اُس میں سے محتاجوں کی اعانت فرماتے۔ زہری سے روایت ہے کہ خیبر کے بچے ہوئے لوگوں نے جو کہ قلعہ بند ہوگئے تھے، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جان کی امان چاہی اور شہر چھوڑنے کا وعدہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی درخواست منظور کرلی۔ فدک والوں کو معلوم ہُوا تو اُنہوں نے بھی یہی درخواست پیش کی جسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبول کرلیا اس لئے فدک سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص ملکیت قرار پایا کیونکہ اُس پر کوئی

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۰۸

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۸۹

شہاب الدین ابوعبداللہ یاقوت الحموی (متوفی: ۱۲۲۹ء، حلب) معجم البلدان، ج ۲ ص ۳۴۲

[3] ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی (متوفی: ۸۴۱ء، بغداد) فروع کافی، مطبوعہ ایران، ص ۲۴۷

فوج کشی نہیں ہوئی تھی۔ [1] اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اپنی تالیف پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لکھتے ہیں کہ اہلِ فدک نے جب خیبر کے یہود کا حال سُنا تو اُنہوں نے بھی ویسی ہی شرائط پر صلح کر لی۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مملکتِ اسلامیہ کے سربراہ بھی تھے اور اس حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مصارف بھی برداشت کرنا پڑتے تھے، اس لئے فدک کی آمدن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مخصوص کر دی گئی۔'' [2] علامہ طوسی فرماتے ہیں، ''جب حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیبر کی مہم سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جھنڈا مرتب فرمایا اور کہا کہ کون اسے اپنے استحقاق کی بناء پر ہاتھ میں لے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ اُسی (شخص) کو فدک کی طرف روانہ فرمائیں، تو بعض لوگ جھنڈا لینے کے لئے کھڑے ہو گئے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں فرمایا کہ تم ہٹ جاؤ۔ پھر سعد کھڑے ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں بھی ہٹا دیا اور علی علیہ السلام سے فرمایا کہ علی! تم کھڑے ہو جاؤ اور اس پرچم کو لو چنانچہ اُنہوں نے وہ علم لے لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو فدک کی طرف روانہ کیا تو فدک والوں نے اُن سے اس شرط پر صلح کی کہ (اُن کی املاک کے بدلے) اُنہیں جان کی امان دی جائے گی۔ اس طرح فدک کے علاقوں کی جائیداد خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہوگئی۔ اُس وقت جبرائیل (علیہ السلام) نازل ہوئے اور کہا کہ خداوندِ عالم کا حکم ہے، ''وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّه○'' یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ''ذی القربیٰ'' کو اُس کا حق دے دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے جبرائیل! یہ ''ذی القربیٰ'' کون ہیں؟ اور اُن کا حق کیا ہے؟ جبرائیل علیہ السلام نے کہا، ''ذی القربیٰ فاطمہ (علیہا السلام) ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُنہیں اُن کے حق میں یہ فدک کے احاطے اور جو کچھ ان میں ہے سب دے دیجئے (کیونکہ ان پر) اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حق ہے، تو اس پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب فاطمہ علیہا السلام کو بلایا اور ایک تحریر لکھ دی۔'' [3] ہمارا ایمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ یہاں ''ذی القربیٰ'' سے کیا مراد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام سے یہ سوال صرف اس لئے کیا کہ دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے اور اُن پر بھی حضرت فاطمہ علیہا السلام کا حق واضح ہو جائے۔

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۹۰ بحوالہ:
ابنِ ابی الحدید (متوفی: ۱۲۵۸ء، بغداد) شرح ابنِ ابی الحدید، طبع مصر، ج ۴ ص ۷۸

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۳

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۳۹۲، ۳۹۳ بحوالہ:
فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ، مطبوعہ طہران، طبع جدید، ص ۱۰۸ تا ۱۰۹

تاریخ طبری میں ہے، ''خیبر تمام مسلمانوں کی ملکیتِ عامہ ہُوا اور فدک محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خالصہ ہُوا کیونکہ اُس پر مسلمانوں نے فوج کشی نہیں کی تھی۔''[1] سیرت ابنِ ہشام میں ہے، ''خیبر مسلمانوں کے درمیان مشترک مالِ غنیمت کی حیثیت رکھتا تھا اور فدک خاص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا اس لئے کہ مسلمانوں نے سواروں اور پیادوں کی صورت میں اُس پر فوج کشی نہیں کی تھی۔''[2] سنن ابوداؤد میں حسین بن علی، یحییٰ بن آدم، ابنِ ابی زائدہ، محمد بن اسحاق، زہری، عبداللہ بن ابی بکر اور محمد بن مسلمہ کے بیٹوں سے روایت ہے کہ (جب خیبر کی جنگ ہوئی اور وہ فتح ہوگیا تو) خیبر کے کچھ قلعے فتح ہونے سے باقی رہ گئے تھے پس وہاں کے رہنے والے اپنے اپنے قلعوں میں بند ہوگئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے درخواست کی کہ وہ اُن کی جان بخش دیں تو وہ یہاں سے نکل جائیں گے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُن کی اُس پیشکش کو قبول فرمایا۔ فدک والوں نے جب یہ سنا تو وہ بھی اُس شرط پر نکل کھڑے ہوئے۔ پس یہ فدک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لئے خاص ہوگیا کیونکہ اس پر گھوڑے اور اُونٹ نہیں دوڑائے گئے تھے۔ (یعنی فدک بغیر جنگ کے حاصل ہُوا تھا اس لئے اُس کو مسلمانوں میں تقسیم نہ کیا بلکہ وہ صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لئے خاص رہا۔[3] یہ حکم قرآن کریم کی اس نص پر مبنی ہے:[4]

''وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝٦''

(اور اللہ نے اُن لوگوں سے جو مال بطورِ فئ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دلوایا تو تم لوگوں نے اُس پر نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ ہی اُونٹ پس اُس میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے لیکن اللہ اپنے رسولوں (علیہم السلام) کو جس پر چاہتا ہے تسلط دے دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر بڑی قدرت رکھتا ہے۔)

تفسیر کبیر میں اس آیت مبارکہ کی تشریح یوں کی گئی ہے، ''خداوند عالم نے ''مالِ غنیمت'' اور ''فئ'' میں فرق بیان کیا ہے کہ ''مالِ غنیمت'' وہ ہے جس کے حاصل کرنے میں تم نے زحمت و مشقت برداشت کی ہے

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل، ص ۲۷۷

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام ص ۳۹۱ بحوالہ:
عبدالملک ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ، ۱۹۵۵ء، ص ۳۳۷

[3] سلیمان بن الاشعث السجستانی ابوداؤد (متوفی: ۸۸۸ء، بصرہ) سنن ابوداؤد، ج ۲، حدیث نمبر ۱۲۴۹

[4] سورۃ الحشر، آیت ۶

اور سواروں اور پیادوں کے ساتھ فوج کشی کی ہے برخلاف ''فئ'' کے، جس کے لئے تم نے کوئی زحمت نہیں اُٹھائی تو اُس میں اختیار کلیۃً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہے کہ جس طرح چاہیں اُسے صرف کریں۔''[1] چنانچہ جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی:[2]

''وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾''

(اور (دیکھو) قریبی رشتہ دار کو اُس کا حق دے دو اور مسکین و مسافر کو بھی اور (خبردار) فضول خرچی نہ کرو۔)

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سیّدۃ نساء العالمین فاطمہ زہرا علیہا السلام کو بُلایا اور اِسی فدک کی ملکیت کی تحریر اُن کے لئے لکھ کر اُنہیں دی۔ اِس کا ذِکر اہلِ سُنت کی مشہور و مستند کتب میں بھی پایا جاتا ہے۔[3]

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

[1] فخر الدین ابو عبداللہ محمد بن عمر بن الحسینی (متوفی: ۱۲۱۰ء، ہرات) تفسیر کبیر، ج ۸ ص ۱۲۵

[2] سورۃ الاسرا ۱، آیت ۲۶

[3] جلال الدین سیوطی (متوفی: ۱۵۰۵ء، قاہرہ) الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، ج ۳ ص ۲۷۹

فتح مکّہ

(۱۰ رمضان المبارک ۸ ہجری/ یکم جنوری ۶۳۰ء)

معاہدہ حدیبیہ کے بعد قریش کے حلیف قبیلہ بنو بکر نے مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ پر اُس وقت حملہ کر کے قتل عام شروع کر دیا جب وہ مکّہ کے زیریں علاقے میں واقع اپنے ایک چشمۂ آب پر مقیم تھے۔[۱] اُس حملے میں بنو خزاعہ نے جان بچانے کے لئے حرم کعبہ میں پناہ لی لیکن حملہ آور وہاں بھی پہنچ گئے اور حرم کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے خونریزی کی اور بنو خزاعہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا۔[۲] باقی لوگوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ بچ جانے والوں میں سے کچھ لوگ عمرو بن سالم کی قیادت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فریاد کی کہ قریش نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے وعدہ خلافی کرتے ہوئے خونریزی کی جبکہ ہم رکوع و سجود میں مصروف تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کی فریاد سُن کر سخت صدمہ پہنچا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے چین ہو گئے اور فرمایا، ''بس اے عمرو! کافی ہے۔''[۳] اور بروایتے یہ فرمایا، ''بس اے عمرو بن سالم! تمہاری مدد ہو گئی۔''[۴] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً اپنا سفیر قریش کی طرف روانہ کیا اور اُنہیں لکھا کہ میری تین شرائط میں سے کسی ایک کو منظور کر لو:[۵] بنی خزاعہ کے مقتولین کا قصاص دو یا بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جاؤ یا اعلان کر دو کہ تم نے معاہدہ حدیبیہ توڑ دیا ہے۔ قریش نے طاقت و نخوت کے نشے میں تیسری شرط مان لی اور اُن کے ترجمان قمرط بن عمر نے تنسیخ معاہدہ کا اعلان بھی کر دیا۔ قریش کی عہد شکنی اور بنو خزاعہ پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کا حساب لینے کے لئے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکّہ معظّمہ کی طرف کوچ کا ارادہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصوبہ دشمن کے سر پر اچانک وارد ہونے کا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلے میں راز دی سے کام لیا اور اصحابؓ

---

[۱] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۲۹۶

[۲] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۲۲ بحوالہ:
حافظ ابنِ بر (متوفی: ۱۰۷۱ء، شاطبہ)، الدرر فی اختصار المغازی والسیر، ص ۲۲۴

[۳] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ، ص ۱۱۲

[۴] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۲۹۸

[۵] پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری (متوفی: ۱۹۸۸، پاکستان) اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۱۶۵

کو بھی راز داری برتنے کی تلقین فرمائی۔ ایک شخص حاطب کو معلوم ہُوا تو اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے ابولہب کی لونڈی سارہ کے ہاتھ قریش کو ایک خط روانہ کر دیا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عسکری منصوبہ تفصیل کے ساتھ درج تھا۔ وہ لونڈی بہت ہوشیار تھی اس لئے عام راستے سے ہٹ کر مکّہ کی طرف روانہ ہوئی۔

اللہ عزوجل نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاطب بن طبقہ کی غداری سے مطلع فرما دیا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین علی علیہ السلام اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو اور بروایتے حضرت علی علیہ السلام اور حضرت زبیرؓ کو اور بقولے تینوں کو اُس خط کی برآمدگی کے لئے مامور فرمایا اور یہ لوگ اُس طرف روانہ ہو گئے جدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بتایا تھا۔ [1]

حضرت علی علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ برق رفتاری سے نکلے اور اُس عورت کو راستے میں جالیا۔ جب اُس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اُس نے صاف انکار کر دیا حتیٰ کہ تلاشی لینے پر بھی اُس سے کوئی خط برآمد نہ ہُوا۔ جناب امیر المومنین علیہ السلام کا ایمان تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اس عورت کے تعاقب میں روانہ فرمایا ہے تو خط ضرور اسی کے پاس ہے کیونکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی فرمان معاذ اللہ غلط ثابت ہو۔ چنانچہ آپ علیہ السلام کے تیور سخت ہو گئے اور آپ نے غضبناک انداز میں اُس عورت کی طرف نگاہ کی تو اُس نے گھبرا کر اپنے بالوں کے جُوڑے میں سے خط نکالا اور پیش کر دیا۔ [2]

عیار عورت کے بیان پر حاطب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اُس سے کوئی معقول جواب نہ بن پڑا۔ حضرت عمر بن خطاب نے کہا کہ واللہ اس نے نفاق اختیار کیا اور چاہا کہ اُس کی گردن اُڑا دیں [3] لیکن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روک دیا اور فرمایا، ''اسے مسجد سے نکال دو۔'' چنانچہ پرجوش مسلمان اُسے دھکے دے کر مسجد سے نکالنے لگے تو اُس نے ملتجی نگاہوں سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف

---

[1] محمد بن سعد (متوفی: ۲۳۰ھجری، بغداد) طبقات ابن سعد، ج۱ص۱۳۴
ابو الفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابو الفداء، ج۱ص۱۴۳
الحافظ ابنِ البر (متوفی: ۱۰۷۱ء، شاطبہ) الدرر فی اختصار المغازی والسیر، ص۲۲۷

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص۴۲۷
الحافظ ابنِ البر (متوفی: ۱۰۷۱ء، شاطبہ) الدرر فی اختصار المغازی والسیر، ص۲۲۷

[3] ابو الفداء (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابو الفداء، ج۱ص۱۴۳
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوّت، ج۲ص۳۴۰

دیکھا۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اسے واپس لے آؤ'' پھر اُس سے فرمایا، ''تمہیں اس مرتبہ چھوڑ رہا ہوں لیکن آئندہ ایسی حرکت مت کرنا۔''[1]

مدینہ سے روانگی:

علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ ماہ رمضان کی دو تاریخیں گزری تھیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بروز جمعہ نماز عصر پڑھنے کے بعد (مکّہ روانگی کے لئے) مدینہ سے باہر تشریف لائے۔[2] یہ بھی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چہار شنبہ (بروز بدھ) ۱۰ ماہ رمضان سنہ ۸ ہجری (بمطابق یکم جنوری ۶۳۰ء) کے دن مدینہ طیّبہ سے مکّہ مکرمہ کی طرف کوچ فرمایا۔[3] اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دس ہزار (۱۰۰۰۰) مسلمانوں کا لشکر عظیم تھا۔[4] جس کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ سات سو (۷۰۰) مہاجرین تھے جن میں تین سو (۳۰۰) گھڑسوار تھے، چار ہزار (۴۰۰۰) انصار تھے جن میں پانچ سو (۵۰۰) گھڑسوار تھے باقی دیگر مسلمان قبائل کے لوگ تھے۔ لشکر کی تعداد بعض مؤرخین نے بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) بھی بیان کی ہے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کئی لوگ دورانِ سفر شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ مروی ہے کہ قبیلہ بنو سلیم کے دو ہزار (۲۰۰۰) افراد جن میں اکثر گھڑسوار تھے، بعد میں آکر شامل ہوئے تھے۔[5]

مکّہ کے نواح میں پڑاؤ:

قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش قدمی کی خبر ہو گئی تھی اور وہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس ہزار (۱۰۰۰۰) کے لشکر عظیم کے ساتھ مکّہ سے ایک منزل پہلے ''مر الظہران'' کے مقام پر پہنچ گئے، آپ نے فوج کو وہیں خیمہ زن ہونے کا حکم دے دیا۔

---

[1] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ، طبع تہران ۱۳۳۸ ہجری، ص ۱۱۳

[2] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ، طبع تہران ۱۳۳۸ ہجری، ص ۱۱۴

[3] محمد ابنِ سعد (متوفی: ۲۳۰ھ، بغداد) طبقات ابنِ سعد، ج ۲ ص ۱۳۵

عماد الدین ابن کثیر (متوفی: ۱۳۷۳ء، دمشق) تاریخ ابنِ کثیر (البدایۃ والنہایۃ)، ج ۳ ص ۲۸۵

[4] محمد ابنِ سعد (متوفی: ۲۳۰ ہجری، بغداد) طبقات ابنِ سعد، ج ۲ ص ۱۳۵

[5] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوّت، ج ۲ ص ۳۴۱

ابوسفیان کی گرفتاری:

قریش کو اسلامی لشکر کی اطلاع ملی تو وہ حیران رہ گئے۔ وہ اس مفاجاتی حملے کے لئے ذہنی اور فوجی لحاظ سے تیار نہیں تھے اور نہ ہی اس غیر متوقع صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اُن میں حوصلہ تھا۔ بہر حال اُنہوں نے اسلامی لشکر کی تعداد، منصوبے اور جنگی نوعیت کی معلومات حاصل کرنے کے لیے ابوسفیان، بدیل بن ورقاء اور حکیم بن حزام کو بھیجا۔ ابوسفیان پکڑا گیا، لیکن جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے معاف کر دیا۔ ابوسفیان نے اسلام کی صداقت کا اقرار کر لیا۔[1] ابنِ اثیر لکھتے ہیں، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آنے کے بعد بھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رِسالت کی گواہی دینے پر تیار نہیں تھا مگر جناب عباس رضی اللہ عنہ کے متنبہ کرنے پر کہ اگر گواہی نہ دی تو پھر تمہاری جان کی خیر نہیں، اُس نے مجبوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رِسالت کی گواہی دی۔''[2]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ابوجعفر محمد بن جریر طبری، حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ جب صبح ہوئی تو میں ابوسفیان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں لے گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کو دیکھتے ہی فرمایا، ''ابوسفیان تم کو کیا ہو گیا ہے جو تم اب بھی نہیں مانتے کہ سوائے اللہ کے کوئی اور معبود نہیں؟'' ابوسفیان نے کہا بے شک اب میں سمجھتا ہوں کہ اگر اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا خدا ہوتا تو وہ ضرور میرے کچھ کام آتا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''افسوس ہے تم پر اے ابوسفیان! کیا اب بھی یہ بات تم پر آشکار انہیں ہوئی کہ میں اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں؟'' ابوسفیان نے کہا، ''میرے ماں باپ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نثار ہوں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بڑھ کر صلہ رحمی والا، حلیم، سخی اور شریف کوئی دوسرا نہیں ہو گا کہ میری طرف سے اتنی ایذا و ستم اُٹھانے کے بعد بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھ پر اتنا لطف و کرم فرما رہے ہیں، مگر اِس باب میں (رِسالت میں) مجھے ابھی تردّد ہے۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اب میں نے اُس سے کہا کہ تم کو کیا ہو گیا ہے؟ بہتر ہے کہ کلمہ شہادتِ حق کا اعلان کر دو ورنہ تمہاری گردن ماردی جائے گی۔ پھر

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۹

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۳۰

عزالدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) تاریخ کامل، ج ۲ طبع بیروت، ۱۹۶۵ء، ص ۲۴۵

اُس نے کلمہ شہادت ادا کیا۔''[1]

طبری لکھتے ہیں کہ جب ابوسفیان، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا تو شعر پڑھا جس کا مطلب ہے، ''اور اللہ نے مجھے اُس شخص سے ملا دیا جسے میں نے ہر جگہ سے نکالا تھا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس سے فرمایا، ''تُو نے مجھے ہر جگہ ستایا اور میری مخالفت میں کوئی جتن نہ چھوڑا۔''[2]

ابوسفیان نے اُس رات وہیں لشکرِ اسلام میں قیام کیا۔ وہ قریش کا سردار تھا اور اب تک اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کی جانے والی تقریباً ہر کاروائی میں نہ صرف خود شامل رہا تھا بلکہ ایسی تمام کاروائیاں اُسی کے ایما پر ہی کی گئی تھیں۔ چنانچہ اُسے ایک شب مسلمانوں کے ''کیمپ'' میں گزارنا پڑی تو فطری طور پر وہ اسلامی لشکر اور اُس کے انتظام وانصرام اور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ اسلام کی شان وشوکت دیکھ کر اُس پر خوف طاری ہوگیا۔ نمازِ فجر کے وقت اُس نے دیکھا کہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو کیا تو مسلمان وضو کے بہتے ہوئے پانی پر ٹوٹ پڑے۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ اس متبرک پانی کا کوئی قطرہ اُس کے حصّے میں آجائے، اور جسے یہ سعادت حاصل ہوجاتی تھی وہ تبرک کے طور پر اُسے اپنے چہرے پر مَل لیتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ابوسفیان کے دِل پر دہشت چھا گئی اور اُس نے کہا، ''میں نے قیصر وکسریٰ کے دربار بھی دیکھے ہیں مگر ایسا (شاہانہ) جاہ وجلال میری نظروں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''[3] رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز ادا فرما چکے تو اُس نے مکّہ جانے کی اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے اجازت مرحمت فرمادی۔

ابوجعفر محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابوسفیان کے کلمہ شہادت پڑھ لینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اب تم جاؤ اور اس کو اپنے ساتھ وادی کے تنگ نائے کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر لے جاؤ تاکہ یہ اللہ کی فوجوں کو جب وہ اس کے سامنے سے گزریں تو دیکھ لے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی، ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ شخص امتیاز کا شوقین ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازراہِ کرم کچھ ایسا فرمادیجئے کہ یہ اپنی قوم میں جاکر خود کو نمایاں کرسکے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد)، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۳۰۳
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوّت، ج ۲ ص ۳۴۳

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۳۰۱

[3] عمادُالدین ابنِ کثیر (متوفی: ۱۳۷۳ء، دمشق) تاریخ ابنِ کثیر (البدایۃ والنہایۃ)، ج ۲ ص ۲۹۱

فرمایا، ''اچھا! اُس کے لئے امان ہے جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا۔'' [1] ابوسفیان نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا، ''میرے گھر میں؟'' فرمایا، ''ہاں تمہارے گھر میں۔'' پھر فرمایا، ''اُس کے لئے بھی امان ہوگی جو حکیم بن حزام کے گھر میں پناہ لے گا۔'' [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا، ''اور اُس کے لئے بھی امان ہے جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے۔'' رحمۃً للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہاں تک فرما دیا، ''اُس کے لئے بھی امان ہے جو خود اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے۔'' [3]

ابوسفیان روانہ ہونے لگا تو بحکم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اُسے لے کر پہاڑی کے دہانے پر کھڑے ہو گئے اور عظیم لشکرِ اسلام کا نظارہ کروایا جو دستوں کی صورت میں گزر رہا تھا۔ کئی عظیم الشان دستے گذرے جن کی قیادت علم بردار صحابہؓ کر رہے تھے۔ یہ کروفر اور جاہ و حشم دیکھ کر ابوسفیان کے دل پر ہیبت چھا گئی اور اُس نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا، ''تمہارے بھتیجے کی بادشاہت و سلطنت تو بہت قوی اور عظیم ہو گئی ہے۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اُسے ٹوکا اور کہا، ''افسوس ہے تجھ پر اے ابوسفیان! یہ رِسالت و نبوّت ہے بادشاہت و سلطنت نہیں۔ [4] منقول ہے کہ اُس دن ایک ہزار (۱۰۰۰) انصار کا دستہ حضرت سعد بن عبادہ کی کمان میں تھا۔ سعد بن عبادہؓ انصار کا علم لئے اپنے دستے کے آگے آگے چل رہے تھے، جب ابوسفیان کے برابر پہنچے تو فرطِ جوش میں بولے، ''آج کا دن خون بہانے اور قتل کرنے کا ہے، آج حرمتِ حرم کو حلال بنا دیا گیا ہے، اللہ نے آج قریش کو ذلیل و خوار کر دیا ہے۔'' پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف رُخ کر کے بولے، ''اے اوس و خزرج کے لوگو! آج تم قریش سے اُحد کا انتقام لو گے۔'' سعد بن عبادہؓ نے ابوسفیان کو خوف و دہشت کے گرداب میں ڈال دیا تھا، وہ فریاد و فغاں کرتا ہُوا

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۳۰۳

[2] عزالدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) تاریخ کامل، ج ۲ ص ۲۴

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۳۰۳

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۴۴

عمادُالدین ابنِ کثیر (متوفی: ۷۷۴ء، دمشق) تاریخ ابن کثیر (البدایۃ والنہایۃ) ج ۳ ص ۲۹۰

احمد ابنِ ابویعقوب ابنِ جعفر ابنِ وہب ابنِ واضح الیعقوبی (متوفی: ۲۸۴ ہجری، مصر)، تاریخ یعقوبی، ص ۵۹

محمد ابنِ سعد (متوفی: ۲۳۰ ہجری، بغداد)، طبقات ابنِ سعد، ج ۲

ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۳۰۳

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور عرض کرنے لگا کہ کیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی قوم (قریش) کے قتل کا حکم دیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''نہیں! میں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ ابوسفیان نے سعد بن عبادہ کی بات بیان کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سعد نے یہ بات اپنی طرف سے سہو و خطا سے کہہ دی ہے ورنہ آج تو لطف و کرم کا دن ہے، آج حق تعالیٰ اپنے گھر کی عظمت بڑھائے گا، تم سب خاطر جمع رکھو اور ایمان لے آؤ۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین جناب علی علیہ السلام سے فرمایا کہ سعد بن عبادہؓ سے علم لے لیں اور مکّہ میں نرمی و مہربانی سے داخل ہوں۔ [1]

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کو مشورہ دیا کہ تم فوراً مکّہ روانہ ہو جاؤ اور قریش کو سمجھاؤ کہ وہ اسلام کے دامنِ عافیت میں آ جائیں۔ چنانچہ ابوسفیان بھاگ کر مکّہ پہنچا اور اعلان کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم ہے کہ جو ہتھیار پھینک دے، اپنے گھر میں رہتے ہوئے دروازہ بند کر لے، میرے گھر میں پناہ لے لے یا مسجد حرام میں داخل ہو جائے وہ امان پائے گا۔ قریش کو اُس کی بات پر یقین نہیں آیا کیونکہ اس سے پہلے حکیم بن حزام اور بدیل وہاں پہنچ چکے تھے مگر اُنہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ پس قریش نے کہا، ''خدا تجھے روسیاہ کرے، یہ کیسی خبر لائے ہو؟'' اتنے میں اُنہیں گرد و غبار اُٹھتا نظر آیا تو سٹپٹا کر پوچھا، ''وہ کون ہیں؟'' ابوسفیان بولا، ''افسوس ہے تم پر! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے لشکرِ عظیم کے ساتھ وارد ہو چکے ہیں لیکن تم میں اُن کا مقابلہ کرنے کی تاب و تواں نہیں۔'' ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے غم و غصے سے اُس کی داڑھی پکڑ لی اور اُسے ذلیل و خوار کرتے ہوئے قبیلے کے لوگوں سے کہا، ''اے غالب کی اولاد! اس احمق کو مار ڈالو تا کہ ایسی بات مُنہ سے نہ نکالے۔'' ابوسفیان نے کہا، ''جیسے چاہو مجھے ذلیل و خوار کرو اور جو چاہو سلوک کرو لیکن خدا کی قسم تمہاری گردنیں اُڑا دی جائیں گی اور تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ گھروں میں گھس جاؤ اور دروازے بند کر لو۔''

---

[1] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۴۴
علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ)، تاریخ اسلام، ص ۴۴۰
ابنِ خلدون (متوفی: ۱۴۰۶ء، قاہرہ)، تاریخ ابنِ خلدون، ج ۲ ص ۸۰۶
حافظ ابو الفداء عماد الدین ابنِ کثیر (متوفی: ۱۳۷۴ء، دمشق)، تاریخ ابنِ کثیر (البدایۃ والنہایۃ)، ج ۳ ص ۳۹۲
ابنِ جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ص ۴۳

رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ''مرّ الظہران'' سے آگے بڑھنے لگے تو زبیر بن عوام کو حکم دیا کہ مہاجرین کی جماعت لے کر مکّہ کی بلندی کے راستے ''کدا'' سے حجون میں داخل ہو جاؤ، وہاں قیام کرو اور میرا خیمہ نصب کر کے میرا انتظار کرو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوعبیدہ بن الجراح کو حکم دیا کہ اپنی مسلح جماعت کے ساتھ وادی بطن کی طرف سے نرمی و مہربانی کے ساتھ پیش قدمی کرو۔ پھر خالد بن ولید کو حکم دیا کہ فوج کو لے کر اسفل مکّہ کے راستے آگے بڑھو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم جاری فرمایا کہ اہل مکّہ اور حرم کے مجاوروں سے جنگ و قتال نہ کیا جائے اور اگر نادان اور ناسمجھ لوگ تم سے جنگ کریں تو پھر تم بھی اپنا دفاع کرنا۔ [1]

سیرت ابنِ ہشام میں ہے کہ مکّہ میں داخل ہونے سے پہلے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکرِ اسلام کے تمام سالاروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، ''میری شدید خواہش ہے کہ مکّہ بغیر کسی خونریزی کے فتح ہو اس لئے عوام کا خون بہانے سے اجتناب کرنا۔'' [2]

مکّہ کی طرف پیش قدمی:

رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی لشکرِ جرار کے ساتھ اُس سرزمین کی طرف قدم بڑھایا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تھی اور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وطن اور آبائی شہر تھا، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھوں سے تعمیر کیا گیا خانۂ خدا تھا، جہاں عبادت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روکا گیا تھا اور جہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ظلم و جبر اور استحصال کے ذریعے جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں آج نمایاں شوکت و عظمت، جاہ و جلال اور ایک لشکرِ عظیم کے ساتھ واپس تشریف لا رہے تھے۔

مؤرخ کے اے حمید لکھتا ہے، ''شہر میں داخلے کے وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے آگے حضرت علی علیہ السلام اسلامی جھنڈا اُٹھائے ہوئے تھے۔ جلوس سیدھا کعبہ میں داخل ہُوا، صحنِ کعبہ میں کھڑے ہو کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت پڑھی، ''شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحیم ہے۔ اللہ ہی آسمان اور زمین کا مالک ہے، اللہ نے تم سے بہت سی باتوں کا وعدہ کیا تھا جو پوری ہو کر رہیں گی، اللہ تمہارے دشمنوں

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، بغداد)، مدارج النبوّت، ج ۲ ص ۳۴۵

[2] آیت اللہ جعفر سبحانی (متولد: ۱۹۲۹ء، تبریز) دی میسیج (The Message) بحوالہ: عبدالملک ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ، ج ۲ ص ۴۰۹

پر غالب ہے اور اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''[1]

علامہ طبرسیؒ بیان کرتے ہیں ''دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کعبہ کے دروازے پر پہنچ کر ٹھہرے، دونوں ہاتھوں سے دروازے کو تھاما اور فرمایا ''کوئی خدا نہیں اللہ کے سوا، اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور تن تنہا تمام متفقہ طاقتوں کو شکست دی۔''[2]

بروایتے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناقے کی مہار حضرت محمد بن مسلمہؓ نے تھام رکھی تھی۔ مسلمان اور کچھ مشرکینِ مکّہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے کے اطراف میں کھڑے تھے۔ مشرکین حیران و پریشان اور خوفزدہ تھے جبکہ مسلمان خوشی و شادمانی کا اظہار کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سرِ اقدس کو بارگاہِ الٰہی میں عاجزی اور شکرانے کے لئے اس حد تک جھکا لیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ریشِ مبارکہ سواری کے پالان کو چھونے لگی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پالان کے اُوپر ہی سجدۂ شکر ادا فرمایا اور پھر حق تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۃ الفتح کی ابتدائی آیات بھی بآواز بلند تلاوت فرمائیں۔ بروایتے اُس وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سرِ اقدس پر سیاہ عمامہ تھا۔[3] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ناقے پر سوار حرم میں تشریف لائے، حجرِ اسود کے سامنے رُکے اور اپنی خاص چھڑی سے اُس کی طرف اشارہ فرمایا (استلام کیا) اور تکبیر کہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد جمع صحابہ کرامؓ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موافقت اور اتباع کے ارادے سے بآوازِ بلند تکبیر کہی۔ مشرکین مکّہ اِدھر اُدھر پہاڑوں پر چڑھ کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ تکبیر کی آوازیں اُن کے کانوں تک پہنچی تو وہ آتشِ عداوت و حسد میں جل بھُن کر رہ گئے۔[4]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طوافِ کعبہ شروع کیا اور پہلے چکر کے دوران کعبے کے دروازے کے اُوپر نصب تین بڑے اور مشہور بتوں کی طرف مڑے۔ اُن بتوں کے نام ہبل، اِساف اور نائلہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چھڑی سے اُنہیں ٹھوکا دیا تو وہ زمین پر گر کر پاش پاش ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس

---

[1] مسٹر کے اے حمید، تاریخ مسلمانان عالم، حصّہ اوّل ص ۸۸

عزالدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) تاریخ کامل، ج ۲ ص ۲۵۲

[2] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ، ص ۶۸

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۴۰

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، بغداد)، مدارج النبوّت، ج ۲ ص ۳۴۷

آیت اللہ جعفر سبحانی (متولد: ۱۹۲۹ء، تبریز) دی میسیج (The Message)

وقت یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی: [1] وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا○ (حق آیا اور باطل مٹ گیا بیشک باطل کو مٹنا ہی تھا۔)'' جب مشرکین کا سب سے بڑا بُت ہبل زمین بوس ہوکر ریزہ ریزہ ہُوا تو زبیر بن عوام نے طنز کرتے ہوئے ابوسفیان سے کہا ''یہ ہبل وہ بت ہے جس پر روزِ اُحد تم ناز کرتے تھے اور نعرہ لگاتے تھے کہ ''اعل هبل'' (بلند ہو ہبل) لو آج یہ توڑ دیا گیا ہے۔'' ابوسفیان بولا، '' مجھے چھوڑو اور میری سرزنش نہ کرو، اگر ہبل کچھ کرنے کے قابل ہوتا تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔'' [2] شاید اُسے احساس ہو چکا تھا کہ بُت کوئی اختیار اور طاقت نہیں رکھتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طوافِ کعبہ مکمل کر کے مسجد کے ایک کونے میں تشریف فرما ہوئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ عثمان بن طلحہ سے کعبہ کی چابیاں لاؤ۔ اُن دنوں خانہ کعبہ کی چابیاں عثمان بن طلحہ کے پاس ہوتی تھیں جو اُسے وراثت میں ملی تھیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام اُسے پہنچایا تو اُس کی ماں سلامہ بنت سعد نے چابیاں دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ کعبہ کی تولیت ہمارا موروثی اعزاز ہے جسے ہم کھونے نہیں دیں گے۔ عثمان نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑا اور اپنے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کی کہ اگر ہم خود چابیاں حوالے نہیں کریں تو وہ زبردستی لے لیں گے۔ اور بروایتے عثمان نے اپنی ماں سے کہا کہ چابیاں دے دو ورنہ میں اپنی کمر سے تلوار نکالتا ہوں۔ پھر ماں کے ہاتھ سے چابیاں لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیں۔ [3]

خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا گیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اندر داخل ہوئے۔ کعبہ کی اندرونی دیواریں مختلف قسم کی تصاویر اور نقوش سے بھری پڑی تھیں جن میں انبیاء کرام علیہم السلام کی تماثیل بھی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر اُنہیں آبِ زم زم سے دھو دیا گیا۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ سے باہر تشریف لائے اور اُس کے دروازے پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا، ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اُس کا کوئی شریک نہیں، اُس نے اپنا

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل (الاسراء)، آیت ۸۱

[2] آیت اللہ جعفر سبحانی (متولد: ۱۹۲۹ء، تبریز) دی میسیج (The Message)
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، بغداد)، مدارج النبوّت، ج ۲ ص ۳۴۸

[3] آیت اللہ جعفر سبحانی (متولد: ۱۹۲۹ء، تبریز) دی میسیج (The Message) بحوالہ:
محمد بن عمر بن واقدی (متوفی: ۸۲۳ء، بغداد) التاریخ وَ المغَازِی والمَبْعث، ج ۲ ص ۸۳۳
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، بغداد) مدارج النبوّت، ج ۲ ص ۳۴۹

وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد فرمائی، دشمنوں کو ہزیمت دی اور اپنے لشکر کو غالب کیا۔''[1] بے شک اللہ عزوجل نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے ولادت پر واپس لوٹائے گا۔ پس، قرآنِ کریم میں یوں ارشاد فرمایا:[2] اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ ○ (بیشک جس نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر قرآن کا فریضہ عائد کیا ہے وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی منزل تک ضرور واپس پہنچائے گا۔)

عام معافی:

عموماً اس طرح کی عظیم الشان فتوحات بہت بڑی تباہی و بربادی کے بعد حاصل ہوتی ہیں اور ایسی فتوحات کے بعد بھی بڑے پیمانے پر خونریزی اور لوٹ مار کی جاتی ہے لیکن یہاں فتح کی جانے والی سرزمین مکّہ معظّمہ کی تھی اور فاتح رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جو عالمین کے لئے رحمت بن کر تشریف لائے تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عظیم الشان فتح کے بعد عام معافی کا عظیم الشان اعلان فرمایا۔ بعض مؤرخین نے یہ اعلان خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیے جانے کے بعد بیان کیا ہے لیکن اکثر اس کا ذِکر اُس سے پہلے کرتے ہیں۔

کے اے حمید لکھتے ہیں، ''سرکار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز ادا کی، بعد میں چاہِ زم زم پر پہنچے اور وہاں کے پانی سے پیاس بجھائی۔ اس کے بعد ایک اعلان جاری کیا جو دُنیا کی تاریخ میں نمایاں خصوصیت رکھتا ہے۔ فرمایا، ''آج کے دن تم کو کوئی خطرہ نہیں اے جماعت قریش! آج خدا نے تمہارے جاہلانہ غرور کو خاک میں ملا دیا اور تمہاری لنترانیاں (شیخیاں، ڈینگیں) خاک میں مل گئیں۔ سُن رکھو! خدا نے تم کو خاک سے پیدا کیا ہے اور پھر خاک میں ملا دے گا۔ خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو خدا سے ڈرے اور جس کے عمل شریفانہ ہوں۔ اے رؤسائے شہر! میں نے تم کو آزاد کیا اور میں تم سے کسی قسم کا مواخذہ نہیں کروں گا۔''[3]

علامہ طبرسی لکھتے ہیں، ''قریش کے بڑے آدمی کعبہ میں آئے اور اُن کا زیادہ گمان یہ تھا کہ وہ تہ تیغ ہونے سے بچ نہیں سکتے۔ اب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ کی طرف تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (کعبہ

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، بغداد) مدارج النبوّت، ج ۲ ص ۳۵۱

[2] سورۃ القصص، آیت ۸۵

[3] مسٹر کے اے حمید، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۱ ص ۸۸

کے) دروازے کے دونوں پہلو ہاتھوں میں پکڑے، پھر کہا کوئی خدا نہیں سوائے اللہ کے، اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی اور وہ تنہا تمام مخالف جماعتوں پر غالب آیا۔ پھر فرمایا، ''بتاؤ! اب تمہارا کیا گمان ہے؟ کیا کہتے ہو؟'' سہیل بن عمرو نے کہا، ''ہم اچھا ہی کہتے ہیں اور اچھا ہی گمان رکھتے ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک شریف بھائی ہیں اور چچا کے بیٹے ہیں۔'' فرمایا، ''اچھا! میں تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے کہا تھا کہ تم پر اب اس وقت مجھے کوئی الزام نہیں دینا ہے، اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحیم ہے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ ہر خون اور مال کا مطالبہ اور فخر جو جاہلیت کے دَور کا ہے، وہ سب میرے پاؤں کے نیچے (پامال) ہے۔ سوائے کعبہ کی تولیت (سربراہی) اور حاجیوں کی سیرابی کے، یہ عہدے اُنہیں کو واپس کیے جاتے ہیں جن کے پاس پہلے سے تھے۔ آگاہ ہونا چاہئے کہ مکّہ اللہ کی طرف سے محترم ہے، اس میں کوئی خونریز اقدام مجھ سے پہلے کبھی حلال نہیں تھا اور میرے لئے تھوڑی دیر کے لئے آج حلال ہُوا ہے اور اب قیامت تک کے لئے اس کی حرمت قائم و دائم ہے۔ اس کے درخت کو کاٹا نہیں جا سکتا اور اس میں کسی شکار کو چھیڑا نہیں جا سکتا اور اس میں گِری پڑی کسی چیز کو اُٹھانا جائز نہیں سوائے اُس کے جو مالک کو ڈھونڈ کر اُس تک پہنچانا چاہتا ہو۔'' پھر فرمایا، ''تم میرے پڑوسی تھے، تم نے مجھے جھٹلایا، مجھے میرے گھر سے نکالا، ہر طرح سے شکست دینے کی کوشش کی اور پھر اس پر بھی اکتفا نہیں کیا، یہاں تک کہ تم میرے شہر (مدینہ) میں جا کر مجھ پر حملہ آور ہوئے اور جنگ کے لئے چڑھائی کی۔ ان تمام باتوں کے باوجود، جاؤ میں تم سب کو چھوڑتا ہوں۔'' اس اذن کو سُن کر سب لوگ نکلے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قبروں سے دوبارہ زندہ ہو کر باہر نکلے ہیں اور اب وہ سب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔''[1]

بُت شکنی اور تطہیرِ کعبہ:

فتح مکّہ کے وقت خانہ کعبہ کے اندر یا اُس کے اردگرد تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت تھے۔ کچھ اہلِ سیر نے لکھا ہے خانۂ کعبہ کے آس پاس وہ بت پائے گئے تھے اور کچھ نے لکھا ہے خانہ کعبہ کے اندر تھے چنانچہ یہ واضح نہیں کہ وہ بت کعبہ کے اندر تھے یا اُس کے آس پاس؟ ممکن ہے کچھ اندر ہوں اور کچھ باہر لیکن یہ تو طے ہے کہ وہ تھے حرم کے اندر ہی اور ان کی اتنی بڑی تعداد کا مطلب یہ تھا کہ تمام قبائل نے اپنے اپنے بت

---

[1] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ، ص ۱۱۸

وہاں لاکر رکھے ہوئے تھے اور مختلف بت مختلف معاملاتِ زندگی سے منسوب تھے۔ فتح مکّہ کے بعد پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن مورتیوں اور بتوں کو توڑ کر اور تماثیل واصنام اور دیواری تصاویر وغیرہ کو نیست و نابود کر کے خانہ کعبہ کو پاک وصاف کرایا۔ روایت ہے کہ بُتوں کو سیسے کے ساتھ مضبوطی سے پیوست کیا گیا تھا۔ نبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے عصائے مبارک کی نوک سے ایک ایک بُت کو ٹھوکا دیتے جاتے اور ساتھ ساتھ یہ فرماتے جاتے، ''وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا○ [1] (حق آیا اور باطل مٹ گیا بیشک باطل کو مٹنا ہی تھا۔)'' عصائے مبارک کے چھوتے ہی بُت زمین پر گر کر پاش پاش ہو جاتا۔

اہلِ سنت کے مشہور عالم دین شیخ عبدالحق محدث دہلوی بحوالہ کتبِ سیر، تحریر فرماتے ہیں کہ چند بڑے بڑے بُت اُونچی جگہوں پر نصب تھے جن تک ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا اُنہی میں ہبل نامی بت بھی تھا۔ جناب علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی، ''یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اپنے قدم ناز کو میرے کندھوں پہ رکھیئے اور ان بتوں کو گرا دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے علی (علیہ السلام)! تم میں بارِ نبوّت اُٹھانے کی طاقت نہیں اس لئے تم میرے کندھوں پر آؤ اور ان بتوں کو گراؤ۔ تعمیل ارشاد کی خاطر جناب علی علیہ السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوشِ مبارک پر سوار ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے پوچھا، ''یا علی (علیہ السلام)! کیا محسوس کر رہے ہو؟'' عرض کی، ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یوں لگتا ہے کہ تمام حجابات اُٹھ گئے ہیں، میرا سر عرش سے جا ملا ہے اور میں جدھر ہاتھ بڑھاتا ہوں وہ چیز میرے پاس آجاتی ہے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے علی (علیہ السلام)! تمہارا یہ وقت کیا خوب ہے کہ تم کارِ حق ادا کر رہے ہو اور میرا یہ حال کتنا مبارک ہے کہ میں بارِ حق اُٹھائے ہوئے ہوں۔ (گویا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو حق قرار دیا۔ مؤلف) علی المرتضیٰ علیہ السلام نے بتوں کو زمین پر گرا دیا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو پھر دوشِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زمین پر کود پڑے اور جب نیچے گرے تو مسکرانے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے مسکرانے کا سبب پوچھا تو عرض کی، ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اتنی بلندی سے گرا ہوں مگر مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی۔'' فرمایا، ''یا علی (علیہ السلام)! تمہیں اُٹھانے والے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اُتارنے والے جبرائیل (علیہ السلام) تھے، تو پھر چوٹ کیسے آتی؟'' [2]

قدیم محدثین میں احمد بن حنبل اپنے مشہورِ آفاق مسند میں، مسند علی (علیہ السلام) کے ذیل میں دو جگہ درج کرتے ہیں اور حافظ ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی جو کہ صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک ہیں،

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل (الاسراء)، آیت ۸۱

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۴۸، ۳۴۹

اپنی ایک کتاب خصائص علویہ میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی زبانی درج کرتے ہیں، ''رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود میرے لئے بیٹھے اور فرمایا تم میرے کاندھے پر چڑھو۔'' آپ علیہ السلام کا بیان ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے لے کر کھڑے ہو گئے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں آسمان سے جو چاہوں لے لوں یہاں تک کہ میں خانہ کعبہ کے اُوپر بلند ہو گیا اور اُس پر ایک زرد پیتل کی مورت تھی جسے میں دائیں بائیں اور آگے پیچھے حرکت دینے لگا یہاں تک کہ میں نے اُسے بالکل ہلا دیا تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بس اب اس کو گرا دو۔ میں نے اُس کو اُوپر سے نیچے پھینکا تو وہ اس طرح ٹوٹی جس طرح شیشہ ٹوٹتا ہے۔ [1]

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان:

بروایتے نماز ظہر کا وقت ہُوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ خانہ کعبہ کی چھت پر گئے اور بآوازِ بلند اذان کہی۔ اللہ وحدہٗ لاشریک کی وحدانیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رِسالت کا اعلان مشرکینِ مکّہ کے کانوں تک پہنچا تو وہ بدخصلت اور بدبخت طرح طرح کی چہ می گوئیاں کرنے لگے۔ کسی نے کہا فلاں اور فلاں خوش قسمت تھے جو دُنیا سے چلے گئے اور آج یہ اذان سننے کے لئے باقی نہ رہے۔ ابوسفیان بولا، ''میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جاسوسوں سے ڈرتا ہوں کہ مبادا ہماری گفتگو سُن کر اُن تک پہنچا دیں۔'' [2]

مکّہ میں مختصر قیام:

فتح مکّہ کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف روایات کے مطابق، پندرہ (۱۵) دن، سترہ (۱۷) دن یا اٹھارہ (۱۸) دن مکّہ مکرمہ میں قیام فرمایا۔ زیادہ تر راوی اس پر متفق ہیں کہ اس تمام عرصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ قصر ادا فرمائی۔ [3]

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۵۳ بحوالہ:
احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) المسند، مطبوعہ مصر ۳۶۶ ہجری، ص ۵۸
احمد بن شعیب نسائی (متوفی: ۳۰۳ ہجری، مکہ) خصائص نسائی، مطبوعہ لکھنؤ، ص ۵۴

[2] آیت اللہ جعفر سبحانی (متولد: ۱۹۲۹ء، تبریز) دی میسیج (The Message)

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۶۳، بحوالہ: ترمذی
شہاب الدین قسطلانی (متوفی: ۱۵۱۷، قاہرہ)، المواھب اللدنیہ
علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۵۷، بحوالہ:
محمد ابنِ سعد (متوفی: ۲۳۰ ہجری، بغداد)، طبقات ابنِ سعد، ج ۲ ص ۱۳۹

غزوۂ حنین

(شوال ۸ ہجری/ جنوری فروری ۶۳۰ء)

مکّہ مکرمہ سے طائف کے راستے میں ''حنین'' نام کا ایک چشمہ تھا۔ شوال سنہ ۸ ہجری میں یہ غزوہ اُس چشمے کے قریب واقع ہُوا اس لئے اسے غزوۂ حنین کہا جاتا ہے۔ اس لڑائی میں مخالف قبیلہ ''ہوازن'' تھا اس نسبت سے اسے غزوۂ ہوازن بھی کہتے ہیں۔

فتح مکّہ تک عرب کے تقریباً تمام قبائل مطیع ہو چکے تھے سوائے قبیلہ ہوازن اور ثقیف کے جو اسلام کے خلاف سخت کینہ اور بغض وعناد رکھتے تھے۔ یہ دونوں قبیلے بہت مالدار اور جنگجو تھے۔ ان کے پاس جدید اسلحے کی بہتات اور تربیت یافتہ سپاہیوں کی بھاری نفری موجود تھی۔ اپنی عسکری قوت کی بدولت اُنہیں یہ زَعم تھا کہ ہم بڑی آسانی سے اسلامی حکومت کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔

فتح مکّہ کے بعد ان دونوں قبیلوں کے سردار آپس میں ملے اور متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنایا۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمان مکّہ والوں پر غلبہ حاصل کرنے میں اس لئے کامیاب ہوئے تھے کہ قریش فنِ حرب کے ماہر نہیں تھے اور ہم چونکہ اس میں طاق ہیں اور بہترین عسکری قوّت اور مہارت رکھتے ہیں اس لئے وہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکتے بلکہ ہم اُنہیں شکست فاش دے کر نیست ونابود کر دیں گے۔ اُنہوں نے سوچا، ''اس سے پہلے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکّہ فتح کرنے کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوں، ہم ہی اُن پر حملہ کر دیں۔'' چنانچہ قبیلہ ہوازن کا سردار مالک بن عوف نصری اور قبیلہ ثقیف کا سردار کنانہ بن عبد یالیل ثقفی چار ہزار (۴۰۰۰) کا لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ اُس لشکر میں ہوازن اور ثقیف کے علاوہ قرب وجوار کے قبائل بھی شامل تھے۔ مالک بن عوف اپنی فوج کے ساتھ اسلامی لشکر سے پہلے ہی وادی حنین میں داخل ہو گیا، اُس نے اپنے تیر انداز گھات میں بٹھا دیے تا کہ جونہی لشکرِ اسلام وہاں پہنچے تو تیروں سے چھلنی کر دیا جائے۔

اِدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کے ناپاک عزائم کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کی سرکوبی کو روانہ ہو گئے۔ بروایتے وہ ہفتہ، ۶ شوال ۸ ہجری کا دن تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) مدنی مجاہدین اور دو ہزار (۲۰۰۰) ''طلقاء وحلقاء'' (مکّہ کے وہ لوگ جنہیں فتح مکّہ کے موقع پر عام معافی دی گئی تھی) کے ساتھ روانہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۰ شوال بروز منگل رات کے وقت وادی حنین میں داخل ہوئے۔ اسلامی لشکر کی کثرت اور شان وشوکت کو دیکھ کر مسلمانوں میں سے ایک شخص نے غرور سے کہا، ''آج ہم قلتِ تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوں گے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس شخص کی یہ بات پسند نہ آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناراضگی کا

اظہار فرمایا۔ اہلِ سیر لکھتے ہیں کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو ہزیمت اور شکستگی کی جو صورت (ابتدا میں) پیش آئی اُس کا سبب یہی (کلمہء غرور) تھا تاکہ مسلمان جان لیں کہ فتح و نصرت کثرتِ تعداد اور تیاری پر منحصر نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔[1] چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہُوا:[2]

''لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ○''

(بیشک اللہ نے کثیر مقامات پر تمہاری مدد کی ہے اور (اے مسلمانو!) حنین کے موقع پر بھی جب تمہاری کثرت تعداد نے تمہیں مغرور کر دیا تھا مگر اس (کثرت) نے تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا اور زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی پھر تم پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔)

حنین کی وادی تنگ اور دشوار گزار گھاٹیوں پر مشتمل تھی، جگہ جگہ گڑھے اور کھائیاں تھیں، لشکر کا ایک ساتھ گزرنا ممکن نہیں تھا اس لئے لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی شکل میں اُن گھاٹیوں میں داخل ہُوئے۔ یہ کافروں کے منصوبے کے عین مطابق تھا اس لئے اُنہوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ہلہ بول دیا۔ تیروں کی منہ زور بارش سے مسلمان بوکھلا اُٹھے اور متفرق و متزلزل ہوکر پیچھے بھاگنے لگے۔ کفّار کے منظّم اور منجھے ہوئے سپاہیوں نے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کا پیچھا کیا تو جذبۂ ایمانی سے سرشار ہونے کا دعویٰ کرنے والے اکثر مسلمان اپنے ایمان کا بار حنین کی گھاٹیوں میں پھینک کر اور رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنہا چھوڑ کر، اُحد کی تاریخ دُہراتے ہوئے فرار ہوگئے اور لشکرِ اسلام میں ایسا تفرقہ پڑا کہ معدودے چند مومن ہی اپنی جگہ ڈٹے رہ گئے۔ اُن ثابت قدم دلاوروں میں سیّدنا علی بن ابی طالب علیہ السلام، عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، زبیر بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، پسران حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ اور چند دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔[3]

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ نے اس صورت حال کو یوں بیان کیا ہے، ''ہم لوگ چلتے رہے یہاں تک کہ جب حنین کی وادی میں پہنچے تو وہاں بہت طویل نشیبی راستہ تھا۔ دشمن پہلے سے ہی اس وادی میں اِدھر اُدھر چھپے ہوئے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو دشمن کے فوجی دستے ہاتھوں میں تلواریں، لوہے کے گرز

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۶۷

[2] سورۃ التوبۃ، آیت ۲۵

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۶۹

اور نیزے لئے ہوئے ہم پر ٹوٹ پڑے۔ وہ سب ایک ساتھ حملہ آور ہوئے تھے اس لئے ہمارے سپاہی یوں پسپا ہونے لگے کہ ایک دوسرے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے، اس عالم میں کہ آپ کے مَرکب کو صرف نو (۹) ہاشمی جاں باز گھیرے ہوئے تھے۔ [۱] مؤرخین نے اس کی منظر کشی یوں کی ہے کہ علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے تلوار کھینچے ہوئے کھڑے تھے، عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مَرکب کی نیام پکڑے ہوئے تھے، فضل بن عباس رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائیں طرف اور مغیرہ بن حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بائیں طرف تھے۔ [۲] حافظ ذہبی لکھتے ہیں، ''تمام مسلمانوں نے اُس دن پیٹھ دکھائی، صرف چند آدمی تھے جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے تھے۔'' [۳]

جب تمام لوگ تتر بتر ہو گئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف چند جانبازوں کے ساتھ تنہا رہ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھوڑے کی دونوں رکابوں پر زور دے کر کھڑے ہوئے، خداوند عالم سے فتح ونصرت کی دُعا فرمائی اور پھر بھاگتے ہوئے اصحاب کو حدیبیہ والی بَیعَت (بَیعَتِ رضوان) یاد دلا کر اور للکار کر اُن کی کمزوری پر سختی کے ساتھ متنبہ کیا۔ [۴] اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اُن بھاگنے والوں کو پکارو اور اُنہیں اس طرح آواز دو، ''اے گروہ انصار! اور اے اصحابِ سمرہ!'' (سمرہ اُس درخت کا نام ہے جس کے نیچے حدیبیہ کے موقع پر ''بَیعَتِ رضوان'' لی گئی تھی) [۵] گویا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن بھاگنے والوں کو بَیعَتِ رضوان کا حوالہ دے کر بلوایا کہ تم نے تو نہ بھاگنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

اُس موقع پر ایک مسلمان خاتون اُمّ سلیم بنت ملحان بھی وہاں موجود تھی۔ وہ ہاتھ میں خنجر لیے اپنے شوہر ابوطلحہ کے اُونٹ کو سنبھالے کھڑی تھی اور مسلمانوں کے فرار کا منظر بھی دیکھ رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس سے پوچھا، ''اے اُمّ سلیم! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اُمّ سلیم نے اپنی وہاں موجودگی کا سبب بیان کیا اور عرض کی، ''حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اِن مشرکوں سے جنگ کیجئے اور مجھے اجازت دیں کہ میں اُن مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کروں جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تنہا چھوڑ کر بھاگے چلے جا رہے ہیں کیونکہ

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۶۰

[۲] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۶۱ بحوالہ: الشیخ جواد، الامام علی علیہ السلام، ص ۱۳۳

[۳] حافظ شمس الدین ذہبی (متوفی: ۱۳۴۸ء، دمشق) العبر فی خبر من غبر، ص ۱۱۹

[۴] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۶۳

[۵] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۷۳

وہ یقیناً واجبُ القتل ہیں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمّ سلیمؓ کی واجبُ القتل والی بات کو رد نہیں کیا بلکہ فرمایا، ''او یکفی اللہ یا اُمّ سَلِیم ○'' یعنی جانے دو اے اُمّ سلیم! اُنہیں خدا ہی سمجھے۔[1]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ بہت بلند آواز تھے۔ اُنہوں نے بھاگتے ہوؤں کو پکارا تو اُن کی آواز پر تقریباً سو کے قریب لوگ پلٹ آئے اور دوبارہ جنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کی حوصلہ افزائی کے لئے میدان میں تشریف لائے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مٹھی بھر سنگریزے یا ایک مشت خاک طلب فرمائی اور اُس پر ''شاھت الوجوہ ○'' (ان کے منہ پھر جائیں) پڑھ کر اُسے دشمنوں کی جانب پھینک دیا۔ وہ خاک یا سنگریزے کفار کے تمام لشکریوں کے چہروں پر پڑے۔ جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اُن کی آواز سے یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے کسی طشت میں پھینکے گئے ہوں۔ ہوازن کے لشکریوں کا کہنا تھا کہ وہ سنگریزے ہم سب کی آنکھوں میں پڑے اور ہم مضطرب و خوفزدہ ہو گئے۔ اُن سے ایسی خوفناک آوازیں آ رہی تھیں جیسے طشت پر ہتھوڑا مارا جا رہا ہو۔ اس دوران آسمان پر سیاہ بادل نمودار ہُوا جو ہمارے اُوپر چھا گیا، پھر سیاہ چیونٹیوں سے تمام میدان لبریز ہو گیا اور زمین و آسماں کے درمیان ہر طرف سفید لباس گھڑسوار نظر آنے لگے۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُن کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھ سکیں۔ بقولے وہ ملائکہ تھے جو یوم بدر کی طرح اہلِ ایمان کی نصرت کے لئے آئے تھے مگر محققین کہتے ہیں کہ اُنہوں نے بدر کی طرح حنین میں جنگ نہیں کی تھی بلکہ محض مسلمانوں کی تقویت کے لئے نازل ہوئے تھے۔ پس، فتح آخرکار مسلمانوں کا مقدر بنی۔

اس معرکے میں مشرکین کے ستر (۷۰) سے زیادہ لوگ قتل ہوئے جبکہ مسلمانوں کے صرف چار (۴) آدمی شہید ہوئے۔[2] اور اس میں بکثرت مالِ غنیمت، لونڈیاں اور غلام وغیرہ ہاتھ آئے۔ بروایتے، قیدیوں کی تعداد چار ہزار (۴۰۰۰) تھی، بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) اُونٹ اور بے شمار نقد و جنس تھا۔ بعض مؤرخین نے اس سے بھی زیادہ مالِ غنیمت بیان کیا ہے۔ اُن کے مطابق اُونٹوں کی تعداد چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) اور چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) سے زیادہ بھیڑ بکریاں اور تقریباً ایک من چاندی تھا۔[3]

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۶۵
ابن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری، ص ۶۶۳

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۶۶ بحوالہ: دفیتہ الاسلام، ص ۱۷۴

[3] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ، ج ۱ ص ۱۳۳

غزوۂ تبوک

(رجب ۹ ہجری/نومبر ۶۳۰ء)

مدینہ منوّرہ اور شام کے درمیان، مدینہ سے چودہ منزل کے فاصلے پر ایک خطہ ارضی ہے جسے ''تبوک'' کہا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ تبوک ایک چشمے کا نام ہے جو اُس جگہ پر واقع تھا۔ اس مہم میں لشکرِ اسلام کا سفر اُسی چشمے پر تمام ہُوا تھا اس وجہ سے اس کو غزوۂ تبوک کہا جاتا ہے۔ اس غزوے کو غزوۂ فاضحہ بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس میں منافقین کی فضیحت و رسوائی بہت زیادہ ہوئی تھی۔ غزوۂ جیش العسرت بھی اسی غزوے کو کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں لشکریوں کو مشقت اور بھوک پیاس اور عسرت و تنگی سے بہت تکلیف دہ واسطہ پڑا تھا۔ [۱] تاریخ کی صراحت ہے کہ تبوک، پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری غزوہ تھا۔ [۲]

۸ ہجری میں رومیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک قاصد کو شہید کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اُسی سال جمادی الاوّل میں رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان موتہ کے مقام پر ایک بڑا ٹکراؤ ہُوا تھا۔ اُس مہم میں رومیوں نے اسلامی لشکر کے تین اہم سرداروں کو شہید کر دیا تھا اور مسلمانوں کی باقی ماندہ جماعت پسپا ہو کر مدینہ چلی گئی تھی۔ مورّخین لکھتے ہیں کہ اپنی اُس ادھوری کامیابی کی تکمیل کے لئے رومی بہت بے چین تھے اور مدینہ پر حملہ آور ہو کر مسلمانوں کی نومولود سلطنت کا خاتمہ کر دینا چاہتے تھے چنانچہ قیصر روم نے اپنی فوجوں کو اس مذموم مقصد کے لئے مرتب کرنا شروع کر دیا۔ اِدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملانے کے لئے فوراً تیار ہو گئے۔ عسکری نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو عظیم سلطنت روم کی ناقابل تسخیر فوجوں کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے شک نبی اللہ تھے اور اللہ کی نصرت پر یقینِ کامل رکھتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عظیم ماہرِ حربیات اور ایک بہترین سپہ سالار بھی تھے چنانچہ رومی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی غیر معمولی لشکر کی فراہمی کے انتظامات کیے۔ ہمارا نقطۂ نظر اس سلسلے میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد میں کبھی بھی فوجی قوّت پر انحصار نہیں کیا تھا بلکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی نصرت پر یقینِ کامل رکھتے تھے تو یہ اہتمام و انصرام رومیوں کی شکست کو یقینی بنانے کے لئے نہیں تھا بلکہ اُن کمزور عقیدہ مسلمانوں کے اطمینان کے لئے تھا جو اُحد،

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۴۰۵

[۲] محمد حسین ہیکل (متوفی: ۱۹۵۶ء، قاہرہ) حیات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، طبع ۱۹۳۳ء، ص ۱۴۶

موتہ اور حنین میں دشمن کی طاقت دیکھ کر حوصلہ ہار بیٹھے تھے اور راہِ فرار اختیار کر لی تھی۔ ہمارے خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ تبوک کی مہم میں کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں تھی اور نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم بھی پہلے سے تھا چنانچہ جب جنگ نہیں ہونا تھی تو پھر اتنے بڑے پیمانے پر فوج جمع کرنے کی وجہ وہی ہو سکتی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ پس تمام قبائل عرب کو، جن میں مسلمان اور مسلمانوں کے حلیف بھی شامل تھے، جہاد میں شمولیت کے لئے خطوط روانہ کیے گئے اور فراہمی وسائل کے لئے مالی معاونت کرنے کو بھی کہا گیا۔ اس مالی امداد میں مومنین کے ساتھ ساتھ منافقین اور مؤلفۃ القلوب نے بھی حصّہ لیا۔ مولفۃ القلوب اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو مسلمان ہوں اور اگر اُن کو کچھ مال و متاع دیا جائے تو اُن کی نظر میں اسلام کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے یا وہ کفّار کہ جن کو کچھ سیم و زر دیا جائے تو اسلام کی طرف راغب ہوں یا جنگ میں مسلمانوں کی مدد کریں اور ان کی طرف سے دفاع کریں۔ [1]

اُن دنوں گرمی اپنے شباب پر تھی۔ سفر انتہائی کٹھن تھا اور عرب میں قحط سالی کا ڈیرہ تھا جس کی وجہ سے رسد کی فراہمی کا مسئلہ درپیش تھا اور سواری کا انتظام بھی معقول نہیں تھا۔ مجاہدین کے لشکر کی تعداد تیس ہزار (۳۰۰۰۰) تھی جبکہ صرف دس ہزار (۱۰۰۰۰) گھوڑے میّسر آ سکے تھے۔ عالم یہ تھا کہ تین مجاہدین کے حصے میں ایک گھوڑا آیا تھا جس پر وہ باری باری سوار ہو سکتے تھے لیکن مجاہدین کی ایک بڑی تعداد اس سے بھی محروم رہ گئی تھی۔ پس اس عالم تنگدستی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی لشکر کے ساتھ مدینہ سے باہر تشریف لائے لیکن علی علیہ السلام کو ساتھ نہیں لیا۔ اُنھیں مدینہ ہی میں چھوڑ دیا۔

علی علیہ السلام کو مدینہ میں چھوڑنے کی وجہ:

علی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہمراہ نہ لے جانا اور مدینہ طیّبہ میں ہی چھوڑ جانا غور طلب ہے۔ علامہ علی نقی نقوی، اس پر دلچسپ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''خالق کو تو معلوم ہی تھا کہ اس مہم میں جنگ ہونا ہی نہیں ہے اس لئے میدانوں کا سر کرنا جس کا کام تھا اُسے اس مہم میں ساتھ نہیں لے جایا گیا اور مدینہ میں چھوڑ دیا۔'' [2] شجاعت کے پیکر، مجسم علم و حکمت اور وفاؤں کے علمبردار ہمیشہ حساس اور رقیق القلب ہوتے ہیں، چنانچہ جب منافقین اور بدخواہ لوگ، علی علیہ السلام کے پاس آ کر فقرے چست کرنے لگے کہ رسول اللہ

---

[1] آیت اللہ سید علی حسینی سیستانی (متولد: ۱۹۳۰ء، مشہد، ایران) آسان مسائل، حصّہ دوم

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۲۷۴

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کو ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟ ناراض ہیں کیا؟ تو آپ علیہ السلام اُداس اور پریشاں ہو گئے۔ پھر منافقین یہ افواہ اُڑانے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی (علیہ السلام) سے سخت ناراض ہیں اس لئے ہمراہ نہیں لے گئے۔ یہ چرچا اتنا بڑھا کہ علی علیہ السلام کا دِل زخمی ہوگیا اور اُنہیں حقیقتِ حال کا انکشاف رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پاک سے کرانے کے لئے مدینہ سے نکل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہونا پڑا۔ آپ علیہ السلام نے زخمِ دل نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے عیاں کیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''أَلَا تَرْضَى أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى ؟ إِلَّا أَنَّهُ لَيْسَ نَبِيٌّ بَعْدِي○'' یعنی کیا آپ اس سے خوش نہیں ہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون (علیہ السلام) کو موسیٰ (علیہ السلام) سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے؟ پھر فرمایا، ''مدینہ کے لئے ضروری ہے کہ یہاں میں رہوں یا آپ۔''[1] یعنی ہم میں سے کسی ایک کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت یوں بیان کی گئی ہے، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے گئے تو علی (علیہ السلام) کو مدینہ میں اپنا نائب بنایا۔ علی (علیہ السلام) نے عرض کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے بچّوں اور عورتوں میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''کیا تم اِس پر خوش نہیں ہو کہ میرے لیے تم ایسے ہو جیسے موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ہارون (علیہ السلام) تھے، لیکن فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔''[2] (یاد رہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ہِ طور پر جاتے ہوئے ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا کر پیچھے چھوڑ گئے تھے۔) پس، ایک وجہ تو یہ تھی کہ جنگ نہیں ہونا تھی اس لئے علی علیہ السلام کی وہاں ضرورت ہی نہیں تھی۔ دوسری وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ اطہر سے بیان ہوگئی کہ مدینہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہاں میں رہوں یا پھر تم۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کیوں فرمایا؟ جب کہ پہلے کئی بار ایسا ہو چکا تھا کہ غزوات کے لئے عازمِ سفر ہوتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی نہ کسی صحابی کو مدینہ میں عامل مقرر فرما جاتے تھے۔ اب ایسی کیا خاص وجہ تھی جو علی علیہ السلام سے یہ فرما رہے تھے، ''ضروری ہے کہ یہاں میں رہوں یا پھر تم؟'' ہمارے نزدیک اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس سے پہلے ایک مکمل اور طاقتور اسلامی ریاست کا قیام نہیں ہُوا تھا اور مدینہ میں اسلام مسلمانوں کی ایک مختصر سی جماعت پر مشتمل تھا جسے اندرونی سے زیادہ بیرونی محاذوں پر خطرات درپیش تھے

---

[1] ابو الحسن علی بن حسین المسعودی (متوفی: ۳۴۶ھ) التنبیہ والاشراف، ص ۲۳۶

[2] محمد بن اسماعیل بخاری (متوفی: ۸۷۰ء، خرتنگ، ازبکستان) صحیح بخاری، باب: غزوہ تبوک کا بیان، حدیث نمبر ۴۴۱۶

کیونکہ ایک طرف تو مشرکینِ مکّہ یعنی قریش تھے اور دوسری جانب یہودیوں اور منافقوں کے طاقتور قبیلے۔ اور اب جبکہ تقریباً تمام بیرونی قوتیں، قریش اور یہودی قبیلے وغیرہ مسخر و مطیع ہو چکے تھے اور ایک طاقتور اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی جس کا دارالحکومت مدینہ تھا تو دارالحکومت میں نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اُن کے جانشین کا ہونا ضروری تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو اپنا قائم مقام مقرر فرمایا۔

دوسری وجہ وہ جس کا حوالہ خود نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو دیا تھا، یعنی موسیٰ علیہ السلام کا طُور پر جاتے ہوئے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا جاں نشین اور قائم مقام بنانا اور قوم کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں دینا۔ پس، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ تبوک پر جاتے ہوئے اپنے بھائی علی علیہ السلام کو اپنا قائم مقام بنایا اور موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا حوالہ دے کر اُمت پر واضح فرمایا کہ علی علیہ السلام اُسی طرح میرے جانشین ہیں جس طرح ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک کے مقام پر شعبان کے آخر میں پہنچے اور ماہ رمضان کے کچھ دنوں تک وہیں قیام فرمایا۔ ہرقل قیصر اُس وقت حمص یا دمشق میں موجود تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے اپنی نقل و حرکت سے بے خبر نہیں رکھا بلکہ اُس کے ساتھ خط و کتابت فرماتے رہے۔ سلطنتِ روم سے بے خوفی کا یہ عملی مظاہرہ مسلمانوں میں اخلاقی مضبوطی اور اطراف کے لوگوں پر اسلامی طاقت کے استحکام کا اثر قائم کرنے کا ذریعہ بنا جس سے اسلام کا رعب چاروں طرف پھیل گیا۔ چنانچہ اِدھر اُدھر کے اربابِ اقتدار نبی خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیرِ نگیں ہونے اور جزیہ دینے پر تیار ہوئے، گویا بجائے سلطنتِ رُوم کے باج گذار ہونے کے وہ اسلام کے مُطیع ہو گئے۔ ان لوگوں میں اِیلہ، جرباء اور اذرح کے نام تاریخ میں موجود ہیں۔ [1]

رومیوں کو اپنے ذرائع سے مسلمانوں کی پیش قدمی، عسکری سرگرمیوں اور گردونواح کے قبیلوں کی اطاعت کا حال معلوم ہو چکا تھا چنانچہ وہ اس قدر حیران و مرعوب ہوئے کہ اُنہیں مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں بیس (۲۰) دن تک قیام فرما کر اُن کا انتظار کیا اور آخر کار بغیر کسی لڑائی کے فتح یاب ہو کر واپسی کے لئے عازمِ سفر ہوئے۔

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۷۲، ۴۷۳
ابو الحسن علی بن حسین المسعودی (متوفی: ۳۴۶ھ) التنبیہ والاشراف، ص ۲۳۶

خانہ کعبہ میں مشرکوں کے داخلے پر پابندی، ایک تاریخی اعلان

(ذیقعد ۹ ہجری/فروری مارچ ۶۳۱ء)

سنہ ۹ ہجری میں سورۃ التوبہ جسے سورۃ برائت بھی کہتے ہیں نازل ہُوا جس میں اللہ ربُ العزت نے مسجد الحرام میں مشرکوں کے داخلے پر پابندی لگادی۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہُوا:[1]

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ یُغْنِیْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝۲۸'' (اے ایمان والو! مشرکین سراسر ناپاک ہیں سو وہ اس سال (سنہ ۹ ہجری) کے بعد مسجد الحرام کے قریب بھی نہ آنے پائیں، اور اگر تمہیں ان کی آمد و رفت کے بند ہونے سے تنگدستی کا اندیشہ ہے تو عنقریب خدا اپنے فضل و کرم سے تمہیں تونگر بنا دے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا جاننے والا، بڑا حکمت والا ہے۔)

تاریخ و حدیث کی متفق علیہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس سورۃ کی آیات کو پہلے حضرت ابوبکر کے سپرد کیا اور پھر پیغام ربانی کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے واپس لے کر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے حوالے کیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس میں نام کی صراحت تھی کہ ان آیات کو آپ پہنچایئے یا علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام۔[2]

تاریخ یعقوبی میں ہے، ''اور اس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) کو سورۃ برأت کے ساتھ بھیجا جسے آپ نے حضرت ابوبکر سے واپس لیا تھا۔'' حضرت ابوبکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا، ''یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا میرے بارے میں کچھ نازل ہوا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نہیں، لیکن جبرائیل (علیہ السلام) نے مجھے بتایا ہے کہ اسے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اہل کا کوئی شخص پہنچائے۔'' پس، حضرت علی علیہ السلام نے اُسے اہلِ مکّہ کو سُنایا اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اُسے زمزم کے حوض پر سُنایا۔۔۔۔ الخ۔[3] مورخ ابوالفدا لکھتے ہیں، ''درمیان ۹ ہجری کے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر

---

[1] سورۃ التوبۃ، آیت ۲۸

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۷۸
فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ، ص ۱۳۱

[3] ابن واضح الیعقوبی (متوفی: ۲۸۴ ہجری، مصر) تاریخ یعقوبی، (نفیس اکیڈمی، کراچی) ج ۲ ص ۱۱۹

کو واسطے ادائے حج کعبہ شریف کے، ہمراہ تین سو مرد کے روانہ فرمایا اور اپنی طرف سے بیس اُونٹ واسطے قربانی کے ساتھ دیئے تھے۔ ابھی حضرت ابا بکر حلیفہ ہی تک پہنچے تھے کہ اُن کی طرف حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کو یہ فرما کر روانہ کیا کہ تم خانہ کعبہ میں چند آیات سورۃ برأت کی پڑھ کر لوگوں کو سنانا اور یہ منادی کرنا کہ اب کے سال کوئی مشرک اور بدن سے ننگا حج کرنے کو نہ آئے۔ یہ بات سُن کر حضرت ابو بکر راہ ہی سے مُراجَعَت کر کے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا میرے بعد کوئی نیا حکم آسمان سے نازل ہوا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد کیا کہ نہیں کوئی نیا حکم صادر نہیں ہُوا بلکہ بات یہ ہے کہ عہدہ احکام کے پہنچانے کا میرا ہے، اور اگر میں نہ ہوں تو کوئی شخص جو قریب میرے ہو وہ ادا کرے۔'' [1]

ایک مصری مؤرخ محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں، ''حضرت علی علیہ السلام مجمع میں کھڑے ہوئے جب کہ وہ لوگ مناسک حج ادا کر رہے تھے تو آپ نے سورۃ توبہ کی ان تمام آیتوں کو پڑھ کر سنایا۔ جب تلاوت ختم کر چکے تو ذرا دیر رُکے پھر بلند آواز سے مجمع کو مخاطب کیا (اور لوگوں کے متوجہ ہونے پر فرمایا)، ''اے لوگو! یقین مانو کہ بہشت میں کوئی کافر نہیں جائے گا اور اس سال کے بعد سے کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور اب کوئی برہنہ (شخص) خانہ کعبہ کا طواف نہیں کرے گا (اس سے پہلے مشرکین خانہ کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر بھی کیا کرتے تھے۔ مؤلف) اور جس کا پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی معاہدہ ہو تو وہ بس اتنی مدت تک کے لئے تھا۔'' حضرت علی علیہ السلام نے چیخ چیخ کر یہ حکم سنایا پھر اُن تمام لوگوں کو آج کے بعد سے چار مہینے کی مہلت دی کہ ہر گروہ اپنے مقام اور اپنے ملک تک، جہاں سے وہ آئے تھے وہاں واپس پہنچ جائے اور بس آج کے دن، پھر (اس کے بعد) کسی مشرک نے حج نہیں کیا اور کسی نے برہنہ حالت میں کعبہ کا طوف نہیں کیا اور آج کے دن سے وہ بنیاد قائم ہوئی جس پر اسلامی حکومت کی عمارت قائم ہوئی۔'' پھر لکھتے ہیں، ''حضرت علی علیہ السلام نے سورۃ برائت کی ان آیات کو صرف (اس مجمع میں) پڑھ دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ گھروں پر جا جا کر لوگوں کے سامنے بھی ان آیتوں کو پڑھ پڑھ کر سناتے رہے اور اس پر تمام روایات متفق ہیں۔ [2]

---

[1] ابو الفدا (متوفی: ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابو الفدا (ناشر حق برادرز لاہور)، ص ۸۹

[2] محمد حسین ہیکل (متوفی: ۱۹۵۶ء، قاہرہ) حیات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، طبع ۱۹۳۳ء، ص ۴۵۷ تا ۴۵۸

مُباہلہ

شیخ طبرسی وغیرہ نے روایت کی ہے کہ نصارائے نجران کے شرفاء کی ایک جماعت حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اُس جماعت کے سربرآوردہ تین اشخاص تھے۔ ایک عاقب، جو اُن کا سردار اور صاحب علم ورائے تھا دوسرا عبدالمسیح، جس سے نجران کے ہاں تمام مشکل اُمور میں مدد لی جاتی تھی اور تیسرا ابوحارثہ، جو اُن کا پیشوا اور عالم تھا۔[1] وہ نفیس ریشمی ملبوسات زیب تن کئے ہوئے نمازِ عصر کے وقت مدینہ پہنچے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن پر کوئی توجہ نہ دی، سلام کا جواب دیا اور نہ ہی کوئی گفتگو فرمائی۔ یہ بے اعتنائی دیکھ کر وہ صحابہ کرامؓ کے پاس گئے اور کہا کہ تمہارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں خط لکھ کر بلوایا، ہم نے اُن کی خواہش منظور کی اور چلے آئے مگر اُنہوں نے ہمارے سلام کا جواب دینا گوارا کیا نہ ہم سے ہمکلام ہونا۔ اصحابؓ اُن کو لے کر امیر المومنین حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کے پاس آئے اور اُن کی شکایت گوش گذار کی۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی وجہ تمہاری یہ نمود و نمائش ہے۔ تم یہ ریشمی ملبوسات اور سونے کی انگوٹھیاں وغیرہ اُتار کر عام لباس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جاؤ۔[2] اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور معمولی لباس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا، ''خدا کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، جب یہ لوگ پہلی بار میرے پاس آئے تھے تو ان کے ساتھ شیطان بھی تھا اس وجہ سے میں نے ان کے سلام کا جواب نہیں دیا۔'' الغرض، اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات چیت شروع کی اور تمام دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوالات اور مناظرات کرتے رہے۔ آخر میں اُن کے ایک عالم نے کہا، ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسیح (علیہ السلام) کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' فرمایا، ''وہ خدا کے بندے اور اُس کے رسول تھے۔'' اُنہوں نے کہا، ''کیا کبھی کوئی بچّہ بغیر باپ کے پیدا ہُوا ہے؟'' اُس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:[3]

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیاتُ القلوب، جلد دوم ص ۷۵۳ تا ۷۵۵ بحوالہ: طبرسی

[2] ابن قیم جوزیہ (متوفی: ۱۳۵۰ء، دمشق) زاد المعاد، ج ۴ ص ۳۶

[3] سورۃ آلِ عمران، آیت ۵۹

''اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۵۹﴾''

(بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال آدم (علیہ السلام) کی سی ہے کہ اللہ نے اُنہیں مٹی سے پیدا کیا پھر حکم دیا کہ ہو جا سو وہ ہو گیا۔)

اُنہوں نے اس دلیل کو ماننے سے انکار کر دیا اور بے جا بحث و مباحثہ کرنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ برابر انکار کرتے چلے گئے۔ پھر جب اُن کا انکار حد سے تجاوز کر گیا تو خالقِ دو عالم نے یہ حکم نازل فرمایا:[1]

''فَمَنۡ حَآجَّکَ فِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَکُمۡ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمۡ وَاَنۡفُسَنَا وَاَنۡفُسَکُمۡ ۟ ثُمَّ نَبۡتَہِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۶۱﴾''

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس معاملے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صحیح) علم آجانے کے باوجود جو لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے حُجّت بازی کریں تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُن سے کہیں کہ آؤ ہم اپنے اپنے بیٹوں، اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو بلائیں اور پھر مُباہلہ کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔)

اس آیت کو آیتِ مُباہلہ کہا جاتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے بیٹوں، عورتوں اور نفوس کو بلائیں اور پھر اللہ کے سامنے گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔ چنانچہ اگلا دن مُباہلہ کے لئے مقرر ہُوا اور نصاریٰ کا وفد اپنی جائے قیام کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے ابو حارثہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دیکھنا اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی اولاد اور اہل بیت (علیہم السلام) کو لے کر آئیں تو عذابِ الٰہی سے ڈرنا اور اُن سے مُباہلہ مت کرنا اور اگر وہ اپنے اصحاب اور پیروکاروں کے ساتھ آئیں تو پھر پروا مت کرنا۔

دوسرے روز جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیّدۃ نساء العالمین حضرت فاطمہ علیہا السلام کے دولت کدے پر تشریف لائے اور امام حسن علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا، امام حسین علیہ السلام کو گود میں لیا، امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کو اپنے آگے آگے اور جناب فاطمہ زہرا علیہا السلام کو پیچھے پیچھے لیے ہوئے مدینہ سے باہر تشریف لائے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقامِ مُباہلہ پر نصاریٰ کے سامنے پہنچے تو ابو حارثہ نے کسی سے پوچھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کون لوگ ہیں؟ کہا گیا کہ جو شخص آگے آگے آ رہا ہے ان کا چچا زاد بھائی، ان کی بیٹی کا

---

[1] سورۃ آلِ عمران، آیت ۶۱

شوہر اور دُنیا میں ان کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور دونوں لڑکے اُسی کے فرزند ہیں اور وہ بی بی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزیز ترین بیٹی فاطمہ (علیہا السلام) ہیں۔ پس، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور مُباہلہ کے لئے دوزانو ہوکر بیٹھ گئے۔ اُدھر عاقب اور عبدالمسیح وغیرہ نے اپنے لڑکوں کو ساتھ لیا اور مُباہلہ کے لیے آنا چاہا تو ابوحارثہ نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بالکل اس طرح بیٹھے ہیں جیسے انبیاء بیٹھتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے ساتھ مُباہلہ کریں گے تو روئے زمین پر ایک نصرانی بھی باقی نہ رہے گا۔ پس وہ لوگ مُباہلہ کی جرأت نہ کر سکے اور خوفزدہ ہوکر واپس چلے گئے۔ [1]

مشکوٰۃ میں سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے، ''آیتِ مُباہلہ کے نازل ہونے پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے عزیز ترین اور قریب ترین اہل بیت (علیہم السلام) کو لے کر مُباہلہ کے لئے اس طرح نکلے کہ حضرت حسن اور حضرت حسین (علیہما السلام) کو جو اُس وقت بہت چھوٹے چھوٹے تھے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گود میں اُٹھا رکھا تھا، حضرت فاطمہ (علیہا السلام) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے تھیں اور حضرت علی (علیہ السلام) حضرت فاطمہ (علیہا السلام) کے پیچھے تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُن سے فرمایا کہ جب میں مُباہلہ میں دُعا کروں تو تم سب مل کر آمین کہنا۔ مسیحیوں کے پیشوا کی نظر اُن پر پڑی تو اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بے اختیار بول اُٹھا کہ تم پر افسوس ہے، میں تو ایسے نورانی چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ اللہ سے یوں درخواست کریں کہ پہاڑ کو اُس کی جگہ سے اکھیڑ دے تو بالیقین اللہ (ان کی درخواست قبول کر کے) پہاڑ کو اُس کی جگہ سے اکھیڑ دے گا۔ پھر اُس نے پُرزور انداز میں اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ اِن لوگوں کے ساتھ مُباہلہ ہرگز نہ کرنا ورنہ جڑ سے اُکھاڑ دیئے جاؤ گے۔ آخر کار اُن مسیحیوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مُباہلہ نہیں کیا اور جزیہ قبول کر کے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیاسی اِطاعت پر مجبور ہوئے۔'' [2]

پس، ابوحارثہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ یا ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہم سے مُباہلہ مت کیجئے اور ہمارے ساتھ صلح کر لیجئے اُن اشیاء پر جن کے ادا کرنے کی طاقت ہم میں ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کی درخواست قبول کر لی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اُس خدا کی قسم جس کے قبضۂ

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیاتُ القلوب، جلد دوم ص ۵۳۷ تا ۵۵۷
علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۸۳ تا ۴۸۴

[2] ولی الدین خطیب تبریزی (متوفی: ۷۴۰ ہجری، بغداد) مشکوۃ المصابیح، جلد پنجم، حدیث نمبر ۷۶۸

قدرت میں میری جان ہے، ہلاکت اُن کے قریب پہنچ چکی تھی، اگر وہ مُباہلہ کرتے تو بے شک سب کے سب بندر اور سؤر ہو جاتے، تمام وادی آگ سے بھر جاتی اور وہ سب اس میں جل کر خاکستر ہو جاتے۔ حق تعالیٰ تمام اہلِ نجران کو نیست و نابود کر دیتا یہاں تک کہ اُن کے درختوں پر کوئی پرندہ بھی باقی نہ رہتا اور سال ختم ہونے سے پہلے تمام نصاریٰ ختم ہو جاتے۔'' بروایتے، عاقب وغیرہ کچھ عرصہ بعد پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ [1]

حدیثِ کساء اور آیتِ تطہیر

رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مُباہلہ کے لئے جن چار ہستیوں کو اپنے ساتھ لے کر گئے تھے اُنہیں اَہل بیتِ رسول علیہم السلام کہا جاتا ہے اور بشمول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پانچ ہستیوں کو ''پنجتن پاک'' کہا جاتا ہے۔ ان کی شان میں مُتعدّد آیاتِ قرآنی کا نزول ہُوا اور بہت سی احادیث مبارکہ بیان کی گئیں۔ ایک ایسی ہی حدیث مبارکہ جس میں بڑی صراحت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ہستیوں کو اپنی اَہل بیت (علیہم السلام) قرار دیا، حدیثِ کساء کے عنوان سے مشہور ہے۔ یہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے جس کی مستند روایات مُتعدّد کتب میں موجود ہیں۔ اس حدیث کو حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام اور دیگر کئی لوگوں نے روایت کیا ہے جن میں حضرت جابر بن عبداللہ اور اُمہاتُ المومنین حضرت اُمّ سلمہ اور حضرت عائشہ نمایاں ہیں۔ یہ مشہور و معروف حدیث قرآن حکیم کی ایک آیت کی وجہ نزول بھی بیان کرتی ہے جسے آیتِ تطہیر کہتے ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری (رضی اللہ عنہ)، روایت کرتے ہیں کہ میں نے جناب فاطمۃ الزہرا (علیہا السلام) سے سنا کہ وہ فرما رہی تھیں کہ ایک دن میرے بابا جان جناب رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے گھر تشریف لائے اور فرمانے لگے، ''سلام ہو تم پر اے فاطمہ (علیہا السلام)!'' میں نے جواب دیا، ''آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بھی سلام ہو۔'' پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ''میں اپنے جسم میں کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے عرض کی، ''بابا جان خدا نہ کرے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں کمزوری آئے۔'' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ''اے فاطمہ (علیہا السلام)! یمنی چادر لا کر مجھے اوڑھا دو۔'' تب میں یمنی چادر لے آئی اور میں نے وہ بابا جان کو اوڑھا دی، اور میں دیکھ رہی تھی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرۂ مبارک یوں چمک رہا تھا جس طرح چودھویں رات کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہو، پھر ایک ساعت ہی گزری تھی کہ میرے بیٹے حسن (علیہ السلام) وہاں آ گئے، اور بولے، ''سلام ہو آپ پر اے والدہ محترمہ!'' میں نے کہا، ''اور تم پر بھی سلام ہو اے میری آنکھ کے

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیاتُ القلوب، جلد دوم ص ۷۵۵

تارے اور میرے دِل کے ٹکڑے!'' وہ کہنے لگے،''امی جان! میں آپ کے ہاں پاکیزہ خوشبو محسوس کر رہا ہوں جیسے میرے نانا جان رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خوشبو ہو۔'' میں نے کہا،''ہاں! وہ تمھارے نانا جان چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔'' اس پر حسن (علیہ السلام) چادر کی طرف بڑھے اور کہا،''سلام ہو آپ پر اے نانا جان! اے خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا مجھے اجازت ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس چادر میں آجاؤں؟'' آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا،''تم پر بھی سلام ہو اے میرے بیٹے! اور اے میرے حوض (کوثر) کے مالک! میں تمھیں اجازت دیتا ہوں۔'' پس حسن (علیہ السلام)، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس چادر میں چلے گئے۔ پھر ایک ساعت ہی گزری ہوگی کہ میرے بیٹے حسین (علیہ السلام) بھی وہاں آگئے اور کہنے لگے،''سلام ہو آپ پر اے والدہ محترمہ!'' میں نے کہا،''اور تم پر بھی سلام ہو اے میرے بیٹے! میری آنکھ کے تارے! اور میرے لختِ جگر!'' پھر وہ مجھ سے کہنے لگے،''امی جان! میں آپ (علیہا السلام) کے ہاں پاکیزہ خوشبو محسوس کر رہا ہوں جیسے میرے نانا جان رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خوشبو ہو۔'' میں نے کہا،''ہاں تمھارے نانا جان اور بھائی جان اُس چادر میں ہیں۔'' پس، حسین (علیہ السلام) چادر کے نزدیک گئے اور بولے،''سلام ہو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اے نانا جان! سلام ہو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اے خدا کے مُنتَخَب کردہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا مجھے اجازت ہے کہ آپ دونوں کے ساتھ چادر میں داخل ہو جاؤں؟'' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا،''اور تم پر بھی سلام ہو اے میرے بیٹے اور اے میری اُمّت کی شِفاعت کرنے والے! میں تمھیں اجازت دیتا ہوں۔'' تب حسین (علیہ السلام) اُن دونوں کے پاس چادر میں چلے گئے۔ اس کے بعد ابوالحسن علی بن ابی طالب (علیہ السلام) بھی وہاں آگئے اور بولے،''سلام ہو آپ پر اے رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دُختر!'' میں نے کہا،''آپ پر بھی سلام ہو اے ابوالحسن (علیہ السلام)! اے مومنوں کے امیر۔'' وہ کہنے لگے،''اے فاطمہ (علیہا السلام)! میں آپ کے ہاں پاکیزہ خوشبو محسوس کر رہا ہوں جیسے میرے برادر اور میرے چچازاد بھائی رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خوشبو ہو۔'' میں نے جواب دیا،''ہاں، وہ آپ کے دونوں بیٹوں سمیت چادر کے اندر ہیں۔'' پھر علی (علیہ السلام) چادر کے قریب ہوئے اور کہا،''سلام ہو آپ پر اے خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا مجھے اجازت ہے کہ میں بھی آپ تینوں کے پاس چادر میں آجاؤں؟'' آنجناب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُن سے فرمایا،''اور تم پر بھی سلام ہو اے میرے بھائی! میرے قائم مقام! میرے جانشین! اور میرے علم بردار! میں تمھیں اجازت دیتا ہوں۔'' پس، علی (علیہ السلام) بھی چادر میں پہنچ گئے۔ پھر میں چادر کے نزدیک گئی اور میں نے کہا،''سلام ہو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اے بابا جان! اے خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اجازت دیتے ہیں کہ میں بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس چادر میں آجاؤں؟'' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا،''اور تم پر بھی سلام ہو میری بیٹی! اور میری پارۂ جگر! میں

نے تمھیں اجازت دی۔'' تب میں بھی چادر میں داخل ہوگئی۔ جب ہم سب چادر میں اکٹھے ہو گئے تو میرے والد گرامی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چادر کے کونے پکڑے اور دائیں ہاتھ سے آسمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، ''اے خدا! یقیناً یہ ہیں میرے اہل بیت (علیہم السلام)، میرے خاص لوگ اور میرے حامی، اِن کا گوشت میرا گوشت ہے اور اِن کا خون میرا خون ہے، جو اِنھیں ستائے وہ مجھے ستاتا ہے اور جو اِنھیں رنجیدہ کرے وہ مجھے رنجیدہ کرتا ہے۔ جو اِن سے لڑے میں بھی اُس سے لڑوں گا، جو اِن سے صلح رکھے میں بھی اُس سے صلح رکھوں گا، میں اِن کے دشمن کا دشمن اور اِن کے دوست کا دوست ہوں کیونکہ یہ مجھ سے ہیں اور میں اِن سے ہوں۔ پس اے خدا! تُو اپنی عنائتیں اور اپنی برکتیں اور اپنی رحمتیں اور اپنی بخششیں اور اپنی خوشنودی میرے اور اِن کے لئے قرار دے، اِن سے ناپاکی کو دُور رکھ، اِن کو پاک رکھ، بہت ہی پاک۔'' اس پر خدائے بزرگ و برتر نے فرمایا، ''اے میرے فرشتو! اور اے آسمان میں رہنے والو! بے شک میں نے یہ مضبوط آسمان پیدا نہیں کیا اور نہ پھیلی ہوئی زمین، نہ چمکتا ہُوا چاند، نہ روشن تر سورج، نہ گھومتے ہوئے سیارے، نہ لہریں مارتا ہُوا سمندر اور نہ تیرتی ہوئی کشتی، مگر یہ سب چیزیں اِن پانچ نفوس کی محبت میں پیدا کی ہیں جو اِس چادر کے نیچے ہیں۔'' اس پر جبرائیل (علیہ السلام) نے پوچھا، ''اے پروردگار! اس چادر میں کون لوگ ہیں؟'' خدائے عزّ وَجَل نے فرمایا، ''یہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اہل بیت (علیہم السلام) اور رِسالت کا خزینہ ہیں۔ یہ فاطمہ (علیہا السلام) اور فاطمہ (علیہا السلام) کے بابا اور فاطمہ (علیہا السلام) کے شوہر اور فاطمہ (علیہا السلام) کے دو بیٹے ہیں۔'' تب جبرائیل (علیہ السلام) نے کہا، ''اے پروردگار! کیا مجھے اجازت ہے کہ زمین پر اُتر جاؤں تا کہ ان میں شامل ہو کر چھٹا فرد بن جاؤں؟'' خدا تعالیٰ نے فرمایا، ''ہاں، میں نے تجھے اجازت دی۔'' جبرائیل امیں (علیہ السلام) زمین پر اُتر آئے، اور عرض کی، ''سلام ہو آپ پر اے خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! خدائے بلند و برتر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سلام کہتا ہے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دُرود اور بزرگواری سے خاص کرتا ہے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرماتا ہے کہ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کہ بے شک میں نے نہیں پیدا کیا مضبوط آسمان اور نہ پھیلی ہوئی زمین، نہ چمکتا ہُوا چاند، نہ روشن تر سورج، نہ گھومتے ہوئے سیارے، نہ لہریں مارتا ہُوا سمندر اور نہ تیرتی ہوئی کشتی مگر سب چیزیں تم پانچوں کی محبت میں پیدا کی ہیں اور خدا نے مجھے اجازت دی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ چادر میں داخل ہو جاؤں۔ اے خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی مجھے اجازت دیتے ہیں؟'' تب میرے بابا جان جناب رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ''تم پر بھی سلام ہو اے خدا کی وحی کے امین! ہاں، میں تجھے اجازت دیتا ہوں۔'' پھر جبرائیل (علیہ السلام) بھی ہمارے ساتھ چادر میں داخل ہو گئے، اور کہا، ''اے اہل بیت (علیہم السلام)! میرا خدا آپ کو وحی بھیجتا اور کہتا ہے کہ خدا نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ آپ لوگوں سے ناپاکی کو

دُور رکھے اور آپ کو پاک و پاکیزہ رکھے۔'' علی (علیہ السلام) نے میرے بابا جان سے کہا، ''اے خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! مجھے بتائیے کہ ہم لوگوں کا اس چادر کے اندر آجانا خدا کے ہاں کیا فضیلت رکھتا ہے؟ حضرت رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ''اُس خدا کی قسم جس نے مجھے سچا نبی بنایا اور لوگوں کی نجات کی خاطر مجھے رِسالت کے لیے چُنا، اہلِ زمین کی محفلوں میں سے جس محفل میں ہماری یہ حدیث بیان کی جائے گی اور اُس میں ہمارے شیعہ اور دوست دار جمع ہوں گے تو اُن پر خدا کی رَحمت نازل ہوگی، فرشتے اُن کو حلقے میں لے لیں گے، اور جب تک وہ لوگ محفل سے رُخصت نہ ہوں گے وہ اُن کے لیے بخشش کی دُعا کریں گے۔ اس پر علی (علیہ السلام) بولے، ''خدا کی قسم ہم کامیاب ہو گئے اور ربِ کعبہ کی قسم ہمارے شیعہ بھی کامیاب ہوں گے۔'' تب حضرت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دوبارہ فرمایا، ''اے علی (علیہ السلام)! اُس خدا کی قسم جس نے مجھے سچا نبی بنایا، اور لوگوں کی نجات کی خاطر مجھے رِسالت کے لیے چُنا، اہلِ زمین کی محفلوں میں سے جس محفل میں ہماری یہ حدیث بیان کی جائے گی اور اُس میں ہمارے شیعہ اور دوستدار جمع ہوں گے تو اُن میں جو کوئی دُکھی ہوگا خدا اُس کا دُکھ دُور کر دے گا، جو کوئی غمزدہ ہوگا خدا اُس کو غم سے نجات دے گا اور جو کوئی حاجت مند ہوگا خدا اُس کی حاجت پوری کرے گا۔'' علی (علیہ السلام) کہنے لگے، ''بخدا ہم نے کامیابی اور برکت پائی اور ربِّ کعبہ کی قسم اسی طرح ہمارے شیعہ بھی دُنیا و آخرت میں کامیاب و سعادت مند ہوں گے۔'' اس موقع پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی جسے آیتِ تطہیر کہا جاتا ہے:

''اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ﴿۳۳﴾''

(اے اہلِ بیت (علیہم السلام)! اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی نجاست کو دُور رکھے اور تمھیں اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے۔) [1]

اس روایت کو کئی علما نے مندرجہ بالا آیت مبارکہ کی تفسیر کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ [2] صحیح مسلم میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ سے بھی یہ روایت معمولی فرق کے ساتھ منقول ہے جس میں اُنھوں نے چادر کی بناوٹ اور

---

[1] سورۃ الاحزاب، آیت: ۳۳

[2] ابو منصور الدیلمی، (متوفی: ۵۵۸ ھجری، ھمدان) مسند الفردوس

حافظ ابوبکر احمد بن علی خطیب بغدادی، (متوفی: ۴۶۳ھ، بغداد، عراق) تاریخ بغداد، ج ۱۰

محمود ابنِ عمر الزمخشری (متوفی: ۵۳۸ھ، ترکمانستان) کشاف، ج ۱ ص ۱۹۳

علی ابنِ حسین ابنِ عبداللہ ابنِ عساکر دمشقی (متوفی: ۵۷۱ھ، دمشق) تاریخ دمشق

نمونے کا بھی ذِکر کیا ہے۔ [1]

رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُمّت کو اَہل بیتِ اطہار (علیہم السلام) کی عظمت و پاکیزگی اور مقام و مرتبے سے بار بار آگاہ فرماتے رہے، اپنے اقوال کے ذریعے اور افعال سے بھی، چنانچہ یہ روایت اَہل بیتِ رسول (علیہم السلام) کی طہارت پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ بقولے آیتِ تطہیر کا نزول ۷ ہجری میں ہُوا۔ [2]

حدیثِ ثقلین

حدیثِ ثقلین، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وہ مشہور اور متواتر حدیث ہے جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میں تمہارے درمیان اللہ کی کتاب (یعنی قرآن) اور اپنی عترت (یعنی اَہل بیت علیہم السلام) چھوڑے جا رہا ہوں۔ قرآن اور میری اَہل بیت (علیہم السلام) قیامت تک ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گے۔'' یہ حدیث تمام مسلمانوں کے ہاں متفق علیہ ہے اور شیعہ و سُنی ہر دو مکاتبِ فکر کی کتبِ حدیث میں نقل ہوئی ہے اور مختلف روایات میں مختلف عبارتوں کے ساتھ وارِد ہوئی ہے، اگرچہ اس کا مضمون ایک ہی ہے۔ اہل تشیّع کی بنیادی چار کتابوں میں شامِل اُصولِ کافی میں یہ حدیث اس طرح وارد ہوئی ہے:

''إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ إِنْ أَخَذْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا، كِتَابَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَأَهْلَ بَيْتِي عِتْرَتِي أَيُّهَا النَّاسُ اِسْمَعُوا وَقَدْ بَلَّغْتُ إِنَّكُمْ سَتَرِدُونَ عَلَيَّ الْحَوْضَ فَأَسْأَلُكُمْ عَمَّا فَعَلْتُمْ فِي الثَّقَلَيْنِ وَالثَّقَلَانِ كِتَابُ اللهِ جَلَّ ذِكْرُهُ وَأَهْلُ بَيْتِي○''

(میں تمہارے درمیان دو امانتیں چھوڑے جا رہا ہوں، تم ان کا دامن تھامے رکھو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے، کتابِ خدا اور میری عترت، جو میرے اَہل بیت (علیہم السلام) اور میرے خاندان والے ہیں۔ لوگو! سنو! میں نے تمہیں یہ پیغام پہنچا دیا کہ تمہیں حوض (کوثر) کے کنارے میرے سامنے لایا جائے گا تو میں تم سے پوچھوں گا کہ تم نے ان دو امانتوں (یعنی کتابِ خدا اور میرے اَہل بیت (علیہم السلام) کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا؟) [3]

---

[1] مسلم بن حجاج (متوفی: ۸۷۵ء نیشاپور) صحیح مسلم، باب فضائل اہلِ بیت النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، حدیث: ۲۴۲۴

[2] یوسفی غروی (ولادت: ۱۳۲۷ھ، نجف اشرف) موسوعۃ التاریخ الاسلامی، ۱۴۱۷، ج ۳ ص ۱۳۰

[3] ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی (متوفی: ۹۴۱ء، بغداد) کافی، ج ۱ ص ۲۹۴

احمد بن شعیب نسائی نے اپنی کتاب سنن نسائی میں، جو اہلِ سُنت کی صِحاحِ سِتّہ میں سے ایک ہے، اس حدیث کو یوں نقل کیا ہے:

''كَأَنِّي قَدْ دُعِيتُ فَأَجَبْتُ، إِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ: أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الآخَرِ، كِتَابُ اللهِ تَعَالَى، وَعِتْرَتِي، فَانْظُرُوا كَيْفَ تَخْلُفُونِي فِيهِمَا، فَإِنَّهُمَا لَنْ يَتَفَرَّقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ○''

(گویا مجھے خالق یکتا نے بلایا ہے اور میں نے بھی یہ دعوت قبول کر لی ہے (اور میرا وقتِ وِصال آن پہنچا ہے)، میں تمہارے درمیان دو گراں قدر امانتیں چھوڑے جا رہا ہوں جن میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے، کتابِ خدا اور میری عترت جو میرے اہل بیت (علیہم السلام) ہی ہیں، پس دیکھو کہ ان کے ساتھ کیا رویہ روا رکھتے ہو کیونکہ وہ کبھی جُدا جُدا نہیں ہوتیں حتیٰ کہ حوض (کوثر) کے کنارے مجھ سے آملیں۔) [1]

اہلِ سنت کی کتب میں یہ حدیث مبارکہ امیر المومنین حضرت علی (علیہ السلام) کے علاوہ مُتعدّد صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) سے روایت کی گئی ہے جن میں سے بعض کے نام مندرجہ ہیں:

۱) امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) سے دو واسطوں سے، البحر الزخار یا مسند البزاز اور متقی ہندی کی کنز العمال میں۔ [2]

۲) حضرت زید بن ثابت سے، مُسند احمد اور طبرانی کی المعجم الکبیر میں۔ [3]

۳) حضرت حذیفہ بن اسید سے، طبرانی کی المعجم الکبیر میں۔ [4]

۴) حضرت ابوذر غفاری سے، دارقطنی کی المؤتلف والمختلف میں۔ [5]

---

[1] احمد بن شعیب نسائی (متوفی: ۳۰۳ ہجری، مکہ) السنن الکبریٰ، حدیث: ۸۱۴۸

[2] حافظ ابوبکر البزار (متوفی: ۹۰۵ء، رملہ) البحر الزخار، ص ۸۸ ح ۸۶۴
علاء الدین علی متقی ہندی (متوفی: ۱۵۶۷ء، مکہ) کنز العمال، ج ۱۴ ص ۷۷، حدیث ۳۷۹۸۱

[3] احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) المسند، ج ۵ ص ۱۱۸۳-۱۸۹
طبرانی (متوفی: ۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الاکبیر، ج ۵، ص ۱۶۶

[4] طبرانی (متوفی: ۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الاکبیر، ج ۳ ص ۱۸۰

[5] علی بن عمر دارقطنی (متوفی: ۹۵۵ء، بغداد) المؤتلف والمختلف، ج ۲ ص ۱۰۴۶

۵) حضرت جابر بن عبداللہ سے، سنن جامع صحیح ترمذی، اور طبرانی کی المعجم الکبیر اور المعجم الاوسط میں۔[۱]

۶) حضرت ابوسعید خدری سے، مُسند احمد میں چار مقامات پر اور عقیلی کی ضعفاء الکبیر میں۔[۲]

۷) حضرت ابوہریرہ سے، کشف الاستار عن زوائد البزار میں۔[۳]

۸) عبداللہ بن حنطب سے، ابنِ اثیر کی اُسد الغابۃ میں۔[۴]

۹) حضرت زید بن ارقم سے، نسائی کی السنن الکبریٰ، طبرانی کی المعجم الکبیر، ترمذی کی سنن، حاکم نیشابوری کی مستدرك على الصحيحين، احمد بن حنبل کی مُسند اور دیگر کتب میں چھ واسطوں سے نقل ہوئی ہے۔[۵]

۱۰) حضرت جبیر بن مطعم سے، ظلال الجنۃ میں۔[۶]

بعض صحابہ اور انصار منجملہ خزیمہ بن ثابت، سہل بن سعد، عدی بن حاتم، عقبہ بن عامر، ابو ایوب انصاری، ابوشریح خزاعی، ابوقدامہ انصاری، ابولیلی، ابوالہیثم بن التیہان اور بعض قریشیوں نے بھی

---

[۱] ابوعیسیٰ محمد ترمذی (متوفی: ۲۷۹ ہجری، ترمذ) صحیح ترمذی، ج ۵ ص ۳۲۸
طبرانی (متوفی: ۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الاکبیر، ج ۳ ص ۶۶
طبرانی (متوفی: ۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الاوسط، ج ۵ ص ۸۹

[۲] احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) المسند، ج ۳ ص ۱۳-۱۷-۲۶-۵۹
ابوجعفر محمد بن عمرو بن موسیٰ عقیلی (متوفی: ۳۲۲ ہجری، مکہ) ضعفاء الکبیر، ج ۴ ص ۳۶۲

[۳] نورالدین علی بن ابی بکر بن سلیمان ہیثمی (متوفی: ۸۰۷ ہجری، قاہرہ) کشف الاستار، ج ۳ ص ۲۲۳، ح ۲۶۱۷

[۴] عزالدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) اسد الغابہ، ج ۳ ص ۲۱۹

[۵] احمد بن شعیب نسائی (متوفی: ۳۰۳ ہجری، مکہ) السنن الکبری، حدیث ۸۱۴۸
طبرانی (متوفی: ۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الاکبیر، ج ۵ ص ۱۸۶
ابوعیسیٰ محمد ترمذی (متوفی: ۲۷۹ ہجری، ترمذ) سنن الترمذی، حدیث: ۳۸۷۶
محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (متوفی: ۱۰۱۴ء، نیشاپور) المستدرک، ج ۳ ص ۱۱۰
احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) المسند، ج ۴ ص ۳۷۱

[۶] ابنِ ابی عاصم اللالبانی (متوفی: ۲۸۷ء) کتاب السنۃ ظلال الجنۃ، ح ۱۴۶۵

امیر المومنین حضرت علی (علیہ السلام) کے حکم پر اس حدیث کو نقل کیا۔ [1] کتاب غایۃ المرام و حجۃ الخصام میں جناب بحرانی نے یہ حدیث اُنتالیس (۳۹) واسطوں سے کتبِ اہل سُنت سے نقل کی ہے۔ مذکورہ کتاب کے مطابق یہ حدیث اہلِ سُنت کی مشہور اور معتبر کتب، مسند احمد، صحیح مسلم، مناقب ابن المغازلی، سنن ترمذی، ثعلبی کی کتاب العمدہ، مُسند ابی یعلی، طبرانی کی معجم الاوسط، ابن البطریق کی العمدہ، قندوزی کی کتاب ینابیع المودہ، ابن المعازلی کی کتاب الطرائف حموینی، جوینی کی فوائد السمطین فی فضائل المرتضیٰ و البتول و السبطین اور ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ میں نقل ہوئی ہے۔ جب کہ غایۃ المرام و حجۃ الخصام کے مطابق شیعہ مآخذ میں منقولہ بیاسی (۸۲) احادیث، حدیثِ ثقلین کے مضمون و مفہوم کی حامل ہیں جو کلینی کی الکافی، شیخ صدوق کی کمال الدین، ان ہی کی الامالی اور عیون اخبار الرضا، شیخ مفید کی الامالی، شیخ طوسی کی الامالی، نعمانی کی الغیبۃ نعمانی، محمد بن حسن صفار کی بصائر الدرجات اور کئی دیگر علما کی کتب میں نقل ہوئی ہیں۔ [2]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○



---

[1] شمس الدین سخاوی (متوفی: ۱۴۹۷ء مدینہ) استجلاب ارتقاء الغرف بحب أقرباء الرسول، ص ۲۳
علامہ شیخ سلیمان قندوزی (متوفی: ۱۸۷۷ء، استنبول) ینابیع المودۃ، ج ۱ ص ۱۰۶-۱۰۷
ابن حجر عسقلانی (متوفی: ۱۴۴۹ء، قاہرہ) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ج ۷ ص ۲۴۵-۲۷۴

[2] سید ہاشم بحرانی (متوفی: ۱۱۰۷ یا ۱۱۰۹ق، بحرین) غایۃ المرام و حجۃ الخصام، ج ۲ ص ۳۰۴-۳۲۰، ۳۶۷

فتح یمن

(رمضان المبارک سنہ ۱۰ ہجری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماہِ رمضان المبارک سنہ ۱۰ ہجری میں حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کو یمن کی طرف تین سو سواروں کے ساتھ بھیجا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین علی علیہ السلام کو یمن روانہ کرتے وقت اُن کے لئے ایک علم تیار فرمایا اور اپنے دستِ مبارک سے اُن کے سر پر دستار باندھی۔ اہلِ سیر کہتے ہیں کہ اُس دستار کے تین پیچ تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگے کی جانب تقریباً ایک گز کا شملہ چھوڑا اور ایک کنارہ کندھوں کی جانب ایک بالشت کا چھوڑا اور فرمایا، ''اے علی (علیہ السلام)! میں تمہیں بھیج تو رہا ہوں لیکن تمہاری جُدائی پر غمزدہ ہوں''۔ پھر فرمایا، ''جب تم اُن کے میدان میں پہنچو تو قتال میں پہل نہ کرنا جب تک کہ وہ خود جنگ کی ابتدا نہ کریں۔ اُن کو 'لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ○'' کی طرف بلانا۔ اگر وہ ایمان لے آئیں تو اُنہیں اقامت صلوٰۃ کا حکم دینا۔ اگر وہ اس میں تمہاری اطاعت کرلیں تو زکوٰۃ کا حکم دینا کہ وہ اپنے صدقات کو اپنے فقراء پر خرچ کریں اور اگر وہ مان لیں تو کسی معاملے میں اُن سے تعَرُّض نہ کرنا۔''

منقول ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے یمن جاتے وقت عرض کی، ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے ایسی قوم کی طرف بھیج رہے ہیں جو اہلِ کتاب ہیں۔ میں نوجوان اور نوعمر ہوں اور علمِ قضا اور احکامِ شریعت میں اتنی معلومات اور مہارت نہیں رکھتا (جتنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکھتے ہیں)۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے سینے پر رکھا اور فرمایا، ''اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْ لِسَانَہٗ وَاھْدِ قَلْبَہٗ○'' چنانچہ علی علیہ السلام علمِ قضا میں اُس مرتبے تک پہنچے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ اطہر سے آپ علیہ السلام کی منقبت میں ارشاد ہُوا، ''اَقْضَاکُمْ عَلِیٌّ○'' تم میں علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ سب سے زیادہ اچھا یعنی بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں۔[1]

بے شک آپ علیہ السلام کی ہدایت اور حقّانیّت کے باب میں یہ بہت عظیم مَنقَبت ہے۔ نیز مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ اگر حق تعالیٰ تمہارے ہاتھ سے کسی کو ہدایت دے تو

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۰۴۲ء، دہلی) مدارج النبوّت، ج ۲ ص ۴۵۱

یہ عمل ہر اُس چیز سے بہتر ہے جس پر آفتاب طلوع وغروب کرے۔ یعنی یہ عمل تمام دُنیا اور جو کچھ اس میں ہے، سب سے بہتر ہے۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے اُن شہروں میں دعوتِ اسلام کا پھریرا لہرایا، جہاد و محاربہ میں ثابت قدم رہ کر جماعت کثیرہ کی ہدایت فرمائی اور اُن کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا، خصوصاً اہلِ یمن کے قبیلہ ہمدان کو۔ قبیلہ ہمدان کے سبھی لوگ یکبارگی مسلمان ہوگئے۔ جناب امیر المومنین علیہ السلام نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خط لکھ کر اُن کے مسلمان ہونے کی اطلاع دی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت خوش ہوئے، سجدۂ شکر بجالائے اور فرمایا، ''اَلسَّلَامُ عَلٰی هَمْدَان○'' ہمدان والوں پر سلامتی ہو۔ [1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مندرجہ بالا بیان میں لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام تین سو سواروں کے ساتھ یمن کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن علامہ علی نقی نقوی لکھتے ہیں، ''وہی اسلامی سورما جو بدر واُحد اور خندق وخیبر کی خونریز فتوحات میں عسکری فتح کا نشان بن گیا تھا اب مُباہلہ کے بعد بغیر تلوار کے جنگ میں بھی فتح وظفر کا نشان ثابت ہُوا۔ یمن میں علی علیہ السلام فتح کے لئے کھینچی ہوئی تلوار لے کر نہیں گئے اور نہ ہی کوئی فوج ولشکر ساتھ لئے ہوئے تشریف لے گئے جس کے نتیجے میں پورا ملک یمن چند روز میں فتح ہوگیا۔ تاریخ کی صَراحَت ہے کہ آپ نے بس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط پڑھ کر سنایا جو ظاہر ہے کہ کسی تمہیدی تقریر کے ساتھ ہوگا، اور ایک دن میں پورے قبیلہ ہمدان نے اسلام قبول کرلیا۔'' [2] مؤرخین کا کہنا ہے کہ قبیلہ ہمدان نے اس موقع پر دعوتِ امیر المومنین علیہ السلام پر لبیک کہی تھی اور اس کے بعد بھی ہمیشہ آپ علیہ السلام کا وفادار اور جاں نثار رہا، اور جو جنگیں آپ علیہ السلام نے بعد میں اپنے مخالفین کے ساتھ لڑیں اُن میں آپ علیہ السلام کا مضبوط بازو ثابت ہُوا۔

بریدہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ یمن کے غزوہ میں شرکت کی جس میں مجھے آپ سے کچھ شکوہ ہُوا۔ جب میں واپس آیا تو میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے حضرت علی علیہ السلام کا ذکر نامناسب انداز سے کیا۔ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ مبارک مُتَغَیَّر ہوگیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے بریدہ! کیا میں مومنین کی جانوں سے قریب تر نہیں ہوں؟'' میں نے کہا، ''کیوں نہیں، یا

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوّت، ج ۲ ص ۴۵۲

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۸۵ بحوالہ:
اسماعیل ابوالفداء (متوفی ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابوالفداء، ج ۱ ص ۱۸۵

رسول اللہ! اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''جس کا میں مولا ہوں اُس کا علی مولا ہے۔''[1]

ابنِ بریدہ اپنے والد سے، الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اُن لوگوں کا کیا ہوگا جو علی (علیہ السلام) کی شان میں گستاخی کرتے ہیں! (جان لو) جو علی (علیہ السلام) کی شان میں گستاخی کرتا ہے وہ میری گستاخی کرتا ہے اور جو علی (علیہ السلام) سے جُدا ہُوا وہ مجھ سے جُدا ہو گیا۔ بیشک علی (علیہ السلام) مجھ سے ہے اور میں علی (علیہ السلام) سے ہوں، اُس کی تخلیق میری مٹی سے ہوئی ہے اور میری تخلیق ابراہیم (علیہ السلام) کی مٹی سے، اور میں ابراہیم (علیہ السلام) سے افضل ہوں۔ ہم میں سے بعض بعض کی اولاد ہیں، اللہ تعالیٰ یہ ساری باتیں سننے اور جاننے والا ہے... وہ (علی علیہ السلام) میرے بعد تم سب کا ولی ہے۔'' (بریدہ بیان کرتے ہیں کہ) میں نے کہا، ''یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کچھ وقت عنایت فرمائیں اور اپنا ہاتھ بڑھائیں، میں تجدیدِ اسلام کی بَیعَت کرنا چاہتا ہوں۔ (اور) میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جُدا نہ ہُوا یہاں تک کہ میں نے اسلام پر (دوبارہ) بَیعَت کر لی۔''[2]

(یعنی علی علیہ السلام کی شان میں گستاخی کرنے کے بعد وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوئے اور تجدیدِ اسلام کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک پر دوبارہ بَیعَت کرنا پڑی۔ مؤلف)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

❁

---

[1] احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) المسند، ۵:۳۴۷

احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) فضائل الصحابہ، ۲:۵۸۴ رقم: ۹۸۹

احمد بن شعیب نسائی (متوفی: ۳۰۳ ہجری، مکہ) السنن الکبریٰ، ۵:۱۳۰، رقم: ۸۴۶۵

احمد بن شعیب نسائی (متوفی: ۳۰۳ ہجری، مکہ) خصائص امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام: ۸۶، رقم: ۷۸

[2] طبرانی، (متوفی: ۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الاوسط، ۴۹، ۵۰:۷، رقم: ۶۰۸۱

ہیثمی (متوفی: ۸۰۷ ہجری، قاہرہ) مجمع الزوائد، ۹:۱۲۸

غدیرِ خُم
(۱۸ ذی الحجہ ۱۰ ہجری)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حَجَّۃُ الوِداع کے بعد مدینہ منوّرہ کی طرف مُراجَعت فرمائی تو مقام غدیرِ خم پر پہنچ کر بحکم الٰہی قیام فرمایا۔ مشہور مؤرخ شبلی نعمانی نے اُس مقام کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی ہے، ''مقام خم جو جحفہ سے تین میل پر ہے، یہاں ایک تالاب تھا، عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں اور (اسی وجہ سے) اس مقام کا نام عام روایتوں میں غدیرِ خم آیا ہے۔ [۱]

علی علیہ السلام کی جانشینی کا اعلان اہل تشیع کی نظر میں

مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہاں (غدیرِ خم پر) عموماً قافلے منزل نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ یہاں آب وگیاہ موجود نہیں تھا۔ [۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں محض ستانے کے لئے قیام نہیں کیا تھا بلکہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے رُکنے کا حکم آیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑاؤ ڈال دیا۔ محققین کے مطابق وہ حکم ربانی یہ تھا:

''یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۶۷﴾''

(اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پروردگار کی طرف سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اُتارا گیا ہے اُس حکم کو (لوگوں تک) پہنچا دیجیے اور اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسا نہ کیا تو (پھر یہ سمجھا جائے گا کہ) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُس کا کوئی پیغام پہنچایا ہی نہیں۔ اور اللہ لوگوں (کے شر) سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کرے گا، بے شک خدا کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔ سورۃ المائدہ، آیت: ۶۷)

شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں، ''اس آیت کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے اور روایت بھی بتاتی ہے کہ یہ حکم پہلے آچکا تھا مگر اس کی تبلیغ کے لئے اس سے پہلے وقت مقرر نہ ہُوا تھا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے اعلان میں تاخیر فرمائی اس انتظار میں کہ موقع ایسا سازگار ہو کہ اُس میں اختلاف زیادہ پیدا نہ ہو، اور اب یہ جگہ آگئی جہاں اللہ کو علم تھا اور دُنیا پر بعد میں یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ اگر حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جگہ سے آگے بڑھ جائیں اور قافلہ روانہ ہو جائے تو پھر راستے بدل جائیں گے اور اتنا بڑا مجمع پھر کبھی پیغمبرِ خدا کو فراہم نہیں ہو سکتا، تو

---

[۱] مولانا شبلی نعمانی (متوفی: ۱۹۱۴ء، لکھنؤ) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طبع ہشتم ۱۳۸۸ ہجری ۱۹۶۹ء حصّہ دوم ص ۱۶۷

[۲] شیخ مفیدؒ (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد) ارشاد، ص ۷۹

اب خالق کی جانب سے یہ حکم تاکیدی آیا تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان اس حکم ربانی کو سُن لیں اور حُجّت تمام خَلق پر زیادہ سے زیادہ تمام ہوجائے۔ اس حُکمِ مُحکم کے وُرود پر بلاتوَقُّف حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرکب سے اُتر پڑے اور لازماً مسلمانوں کو بھی اُترنا پڑا۔ اُس وقت گرمی نہایت سخت تھی۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ چھوٹے چھوٹے درخت جو وہاں ہیں وہ اکھاڑ دیئے جائیں تاکہ زمین صاف ہوجائے۔ پھر پالانہائے شُتر کو ایک دوسرے پر رکھ کر ایک طرح کا منبر وہاں بنوایا اور اب اعلان ہُوا، ''الصلوٰۃ جامعۃ'' یعنی نماز جماعت میں سب آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک ہوں۔ مجبوراً سب مسلمان سمٹ کر اکٹھے ہوگئے جبکہ ریگِ صحرا کی تپش کا یہ عالم تھا کہ عبائیں یا چادریں پیروں سے لپیٹ لی گئیں تھیں۔''[1] اعلان سے قبل رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے کر اُس مصنوعی منبر کی چوٹی پر تشریف لے گئے اور اُنہیں اپنی دائیں جانب کھڑا کیا اور ایک بسیط خطبہ ارشاد فرمایا۔ شیخ مفیدؒ اور علامہ طبرسیؒ اس خطبے میں سے چند خاص فقرے یوں نقل کرتے ہیں، ''حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حمد وثنا ادا فرمائی اور موعظہ ونصیحت کے ساتھ اُمت کو اپنی وفات کی خبر سنائی اور فرمایا مجھے دعوتِ حق آگئی ہے اور قریب ہے وہ وقت کہ میں اس پر لبیک کہوں۔ اب تمہاری نظروں سے اوجھل ہونے کا میرا وقت آگیا ہے اور میں تم میں چھوڑے جاتا ہوں وہ کہ جس سے تم اگر تَمَسُّک رکھو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔ (اور وہ ہیں) اللہ کی کتاب اور میری عترت، جو میرے اَہل بیت (علیہم السلام) ہیں اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوگے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بآوازِ بلند فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں پر تم سے زیادہ بااختیار ہونے کا حق نہیں رکھتا؟ سب نے کہا، ''کیوں نہیں۔'' بس اس سے ربط دے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس عالم میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اُونچا کیا اتنا کہ دونوں کی سفیدی زیرِ بغل ظاہر ہوئی اور فرمایا، ''اچھا تو جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی (علیہ السلام) مولا ہے۔ خداوندا! دوست رکھ اُسے جو اِس کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اُسے جو اِسے دشمن رکھے اور مدد کر اُس کی جو اِس کی مدد کرے اور بے مددگار چھوڑ اُسے جو اِسے بے مددگار چھوڑے۔'' پھر منبر سے اُترے اور یہ عین دوپہر کا وقت تھا تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو رکعت نماز پڑھی۔ زوالِ آفتاب ہُوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤذن نے نمازِ ظہر کی اذان

---

[1] شیخ مفیدؒ (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد) ارشاد، ص ۸۱
علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۹۴

دی جس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھائی اور اپنے خیمے میں بیٹھے اور حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ ایک خیمے میں جو سامنے لگایا گیا تھا بیٹھیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ ایک ایک کر کے علی علیہ السلام کے پاس جائیں اور امیر المومنین کہہ کر سلام کریں اور امامت کی مبارکباد دیں۔ چنانچہ اُس دن سب نے ایسا ہی کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواج اور تمام مسلمان خواتین کو حکم دیا کہ وہ سب بھی علی علیہ السلام کے پاس آئیں اور اُنہیں امیر المومنین کہہ کر سلام کریں۔ چنانچہ اُن سب نے بھی اس پر عمل کیا اور جنہوں نے اس میں کافی طول کلام سے کام لیا حضرت علی علیہ السلام کو اِس منصب پر مبارکباد دینے میں وہ حضرت عمر بن خطاب تھے اور اُنہوں نے اس پر بہت خوشی کا اظہار کیا اور منجملہ اس کے جو کہا تھا وہ یہ تھا کہ مبارک ہو مبارک اے علی علیہ السلام! کہ آپ میرے اور ہر صاحبِ ایمان مرد اور صاحبِ ایمان عورت کے ''مولیٰ'' ہو گئے۔ اور حسان بن ثابت، پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجازت دیتے ہیں کہ میں اس موقع پر کچھ ایسا کہوں جسے اللہ پسند کرتا ہو؟ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے حسان! بسم اللہ، اُٹھو۔ چنانچہ وہ ایک اُونچے حصّہ پر زمین کے کھڑے ہوئے اور تمام مسلمانوں نے گردنیں بلند کیں اُن کے کلام کے سُننے کے لئے تو اُنہوں نے اشعار پڑھنا شروع کیے، ''اُنہیں غدیر کے دن اُن کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پکار رہے تھے مقامِ خم پر اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کانوں تک آواز پہنچانے والا کوئی ہو سکتا ہے؟ اور فرمایا، بتاؤ تمہارا مولیٰ اور ولی کون ہے؟ تو سب بول اُٹھے اور کسی نے اُس وقت دشمنی ظاہر نہیں کی کہ خدا ہمارا مولیٰ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ولی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم میں سے کسی کو آج نافرمانی کرنے والا نہیں پائیں گے تو حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے کہا کہ کھڑے ہو اے علی علیہ السلام! کہ میں اپنے بعد تمہارے امام اور راہنما ہونے کو پسند کرتا ہوں، تو جس کا میں مولیٰ ہوں اُس کا یہ علی (علیہ السلام) ولی ہے تو تم سب رہو ان کے لئے مددگار اور موافقت رکھنے والے۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دُعا کی کہ خداوندا! اس کے دوست کو تُو دوست رکھ اور جو علی علیہ السلام کو دشمن رکھے اُس کا تُو دشمن ہو۔'' اس پر حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسان سے فرمایا، ''اے حسان! ہمیشہ رُوح القُدس کے ذریعے تمہاری تائید ہوتی رہے گی جب تک کہ تم اپنی زبان سے ہماری مدد کرتے رہو گے۔'' اور حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس جگہ سے ہٹے نہیں یہاں تک کہ یہ آیت اُتری:

''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط''

(آج میں نے تمہارے لئے دِین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے دِین کی

حیثیت سے اسلام کو پسند کرلیا ہے۔ سورۃ المائدہ، آیت: ۳)

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اللہ کا شکر ہے دِین کے مکمل ہونے اور نعمت کے پورے ہونے اور پروردگار کے میری رِسالت اور علی (علیہ السلام) کی میرے بعد وِلایت سے راضی ہونے پر۔ [1]

علی علیہ السلام کی جانشینی کا اعلان اہلِ سُنت کی نظر میں

اہلِ سُنت کے مشہور محدث و مؤرخ شیخ عبدالحق مُحدِث دہلوی لکھتے ہیں کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوِداع سے) واپسی کے وقت اثنائے راہ میں جب منزل غدیر خم پہنچے جو کہ جحفہ کے نواح میں مکّہ معظّمہ اور مدینہ طیبّہ کے درمیان واقع ہے تو روئے انور صحابہؓ کی طرف کر کے فرمایا، ''کیا تم نہیں جانتے کہ میں مسلمانوں میں اُن کی جانوں سے زیادہ قریب و محبوب ہوں؟ جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ نبی مسلمانوں میں اُن کی جانوں سے زیادہ قریب و محبوب ہیں۔'' بروایتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ الفاظ تین مرتبہ دُہرائے۔ تمام صحابہ نے عرض کی، ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ درست ہے اور بلاشبہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام مسلمانوں کی جانوں سے قریب اور محبوب تر ہیں۔'' پھر فرمایا، ''آگاہ ہو جاؤ! میں تم میں دو عظیم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جو ایک دوسرے سے بزرگ تر ہیں۔ ایک قرآن کریم اور دوسری میری اہل بیت (علیہم السلام)۔ دیکھو! میرے بعد اِن دونوں میں احتیاط کرنا کہ کس طرح تم اِن سے سلوک کرتے ہو اور کیسے اِن کے حقوق ادا کرتے ہو۔ یہ دونوں میرے بعد ایک دوسرے سے کبھی جُدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر کے کنارے مجھ سے ملیں۔'' اس کے بعد فرمایا، ''حق تبارک وتعالیٰ میرا مولیٰ ہے اور میں تمام مسلمانوں کا مولیٰ ہوں۔'' پھر حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

''اَللّٰھُمَّ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَّوْلَاہُ ط اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ ط وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ ○

(اے خدا! جس کا میں مولیٰ ہوں یہ علی (علیہ السلام) اُس کے مولیٰ ہیں، اے خدا! تُو بھی اُسے دوست رکھ جو اِن کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اُسے جو اِن سے دشمنی کرے۔)''

ایک روایت میں اتنا زیادہ آیا ہے:

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۴۹۴

شیخ مفیدؒ (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد) ارشاد، ص ۸۱

فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ، صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰

''وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهٗ ط وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهٗ ط وَاَدِرِ الْحَقَّ حَیْثُ دَارَ ○''

(اور مدد کر اُس کی جو علی (علیہ السلام) کی مدد کرے اور ذلیل کر اُسے جو اِسے کو چھوڑ دے اور حق کو اُدھر اُدھر لے جا جدھر جدھر یہ (علی علیہ السلام) جاتا ہے۔)

مروی ہے کہ اس واقعے کے بعد حضرت عمر نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے ملاقات کی اور کہا، ''اے ابنِ ابی طالب! مبارک ہو اور خوشی ہو کہ صبح و شام اس حال میں تم کرتے ہو کہ ہر مَرد و زَن مومن کے تم مولیٰ ہو۔'' اس حدیث کو اہلسنت کے امام ولی الدین محمد بن محمد بن عبداللہ الخطیب العربی نے اپنی مشہور کتاب ''مشکوٰۃ المصابیح'' جو عموماً ''مشکوٰۃ شریف'' کہلاتی ہے میں روایت کیا ہے۔[1] اور ابنِ اثیر جزری نے ''اسد الغابۃ'' میں روایت کیا ہے۔[2]

علامہ واحدی ابوالحسن علی بن احمد نیشاپوری نے اپنی مشہور و معروف کتاب ''اسباب التنزیل'' میں جو کہ صحیح معنی میں تاریخ تنزیل آیات قرآنی ہے، ابوسعید خُدری کی روایت یوں درج کی ہے کہ یہ آیت، ''اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبلیغ کر دیجئے اُس کی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروردگار کی طرف سے اُترا ہے''، غدیر خم والے دن حضرت علی بن ابی طالب (علیہ السلام) کے بارے میں نازل ہوئی۔[3]

حافظ جلال الدین سیوطی نے اپنی مشہور تفسیر ''دُر منثور فی التفسیر بالماثور'' میں اور اہلِ حدیث کے بہت بڑے عالم اور مفسر محمد بن علی بن محمد شوکانی نے اپنی تفسیر ''فتح القدیر'' میں اور ہندوستان کے مشہور عالمِ اہلِ حدیث نواب صدیق حسن خان قنوجی نے اپنی تفسیر ''فتح البیان فی مقاصد القرآن'' میں جو متفقہ الفاظ درج کیے ہیں وہ یہ ہیں، ''ابنِ ابی حاتم، ابنِ مردویہ اور ابنِ عساکر نے ابوسعید خُدری کی زبانی بیان کیا ہے کہ غدیرِ خم کے دن علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) کے بارے میں پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی:

''یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ○''

(اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! جو حکم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پروردگار کی طرف سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اُتارا گیا ہے

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام، ص ۵۰۶ بحوالہ مشکوٰۃ مترجم مطبوعہ دہلی جلد ۲ ص ۵۹۰

[2] علی بن محمد ابن اثیر الجزری (متوفی: ۸۳۸ھ) اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، ج ۴ ص ۲۸

[3] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ)، تاریخ اسلام، ص ۴۹۹ بحوالہ: اسباب التنزیل، ص ۱۵۰

اُسے (لوگوں تک) پہنچا دیجیے اور اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسا نہ کیا تو (پھر یہ سمجھا جائے گا کہ) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُس کا کوئی پیغام پہنچایا ہی نہیں۔ اور اللہ لوگوں (کے شر) سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کرے گا، بے شک خدا کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔ سورۃ المائدۃ، آیت ٦٧)''

ابنِ مردویہ نے ابنِ مسعود کی زبانی نقل کیا ہے کہ ہم لوگ جب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اس آیت کو پڑھتے تھے (تو) اس فقرے کے ساتھ (پڑھتے تھے) کہ ''جو اللہ کی طرف سے اُتارا گیا ہے'' (وہ) علی علیہ السلام (ہے جو) مومنین کا مولا ہے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہ کیا تو اس کی رِسالت کچھ پہنچائی ہی نہیں اور اللہ لوگوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کرے گا۔ [1]

ابنِ ابی حاتم رازی نے تفسیر القرآن العظیم میں عطیہ عوفی سے ابوسعید خدری کی روایت نقل کی کہ سورۃ المائدہ کی یہ آیت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی۔ [2]

عبداللہ بن عباس، براء بن عازب اور محمد بن علی نے روایت کی ہے کہ یہ آیتِ مبارکہ حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت میں نازل ہوئی ہے۔ جب یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا، ''جس کا میں مولا ہوں، اُس کا علی مولا ہے، اے اللہ! تو اُسے دوست رکھ جو اِسے دوست رکھے، اور اُس سے عداوت رکھ جو اِس سے عداوت رکھے۔ اس کے (فوراً) بعد حضرت عمر نے حضرت علی علیہ السلام سے ملاقات کی اور کہا، ''اے ابنِ ابی طالب! آپ کو مبارک ہو، اب آپ میرے اور ہر مومن اور مومنہ کے مولا قرار پائے ہیں۔'' [3]

---

[1] جلال الدین سیوطی (متوفی: ۹۱۱ھجری)، الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، ج ۲ ص ۲۹۸
محمد بن علی بن محمد شوکانی (متوفی: ۱۲۵۰ھجری)، فتح القدیر، جلد ۲ ص ۶۰
نواب صدیق حسن خان قنوجی (متوفی: ۱۸۹۰ء، بھوپال) فتح البیان فی مقاصد القرآن، ص ۱۹

[2] ابن ابی حاتم رازی (متوفی: ۹۳۸ء، طوس) تفسیر القرآن العظیم ۴: ۱۱۷۲، رقم: ۶۶۰۹

[3] فخر الدین رازی (۱۲۱۰ء، ھرات) التفسیر الکبیر، ۱۲: ۴۹، ۵۰
واحدی نیشاپوری (متوفی: ۴۶۸ھجری، نیشاپور) اسباب النزول: ۱۱۵
جلال الدین سیوطی (متوفی: ۱۵۰۵ء، قاھرہ) الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، ۲: ۲۹۸
شھاب الدین محمود آلوسی بغدادی (متوفی: ۱۲۷۰ ھجری، بغداد) روح المعانی، ۶: ۱۹۳
محمد بن علی بن محمد بن عبد اللہ الشوکانی الیمنی (متوفی: ۱۸۳۴ء، صنعا) تفسیر فتح القدیر

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ جس نے اٹھارہ ذی الحج کو روزہ رکھا اُس کے لئے ساٹھ (۶۰) مہینوں کے روزوں کا ثواب لکھا جائے گا اور یہ غدیر خم کا دن تھا جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، ''کیا میں مومنین کا والی نہیں ہوں؟'' اُنہوں نے کہا، ''کیوں نہیں، یارسول اللہ!'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''جس کا میں مولا ہوں، اُس کا علی مولا ہے۔'' اس پر حضرت عمر بن خطاب نے کہا، ''مبارک ہو! اے ابنِ ابی طالب (علیہ السلام)! آپ میرے اور ہر مسلمان کے مولا ٹھہرے۔'' (اُس موقع پر) اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳''

(آج میں نے تمہارے لئے دِین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے دِین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کر لیا ہے۔ سورۃ المائدہ، آیت: ۳) [1]

براء بن عازب سے یوں بھی روایت ہے کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر پر تھے، (راستے میں) ہم نے غدیر خم میں قیام کیا۔ وہاں ندا دی گئی کہ نماز کھڑی ہو گئی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے دو درختوں کے نیچے صفائی کی گئی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ ظہر ادا کی اور حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں مومنوں کی جانوں سے بھی قریب تر ہوں؟'' انہوں نے کہا، ''کیوں نہیں!'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں ہر مومن کی جان سے بھی قریب تر ہوں؟'' انہوں نے کہا، ''کیوں نہیں!'' راوی کہتا ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، ''جس کا میں

---

[1] خطیب بغدادی (متوفی: ۴۶۳ھجری، بغداد) تاریخ بغداد، ۸: ۲۹۰
طبرانی (متوفی: ۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الأوسط، ۳: ۳۲۴
واحدی نیشاپوری (متوفی: ۴۶۸ھجری، نیشاپور) اسباب النزول: ۱۰۸
فخر الدین رازی (۱۲۱۰ء، ھرات) التفسیر الکبیر، ۱۱: ۱۳۹
ابن عساکر (متوفی: ۵۷۱ھ، دمشق) تاریخ دمشق الکبیر، ۴۵: ۱۷۷، ۱۷۶
ابن عساکر (متوفی: ۵۷۱ھ، دمشق) تاریخ دمشق الکبیر، ۴۵: ۱۷۹
ابن کثیر (متوفی: ۱۳۷۳ء، دمشق) البدایہ والنہایہ، ۵: ۴۶۴
جلال الدین سیوطی (متوفی: ۱۵۰۵ء، قاھرہ) الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، ۲: ۲۵۹

مولا ہوں اُس کا علی مولا ہے۔ اے اللہ! تُو اُسے دوست رکھ جو اِسے (علی علیہ السلام کو) دوست رکھے اور اُس سے عداوت رکھ جو اِس سے عداوت رکھے۔'' راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد حضرت عمر نے حضرت علی علیہ السلام سے ملاقات کی اور اُن سے کہا، ''اے ابنِ ابی طالب! مبارک ہو، آپ صبح وشام (یعنی ہمیشہ کے لئے) ہر مومن ومومنہ کے مولا بن گئے۔'' ذہبی نے ''سیر اعلام النبلاء'' میں کہا ہے کہ حضرت عمر نے کہا، ''(اے علی! آپ کو مبارک ہو)''۔ مناوی نے 'فیض القدیر' میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابوبکر وعمر نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ''مَنْ کُنْتُ مَولاہُ فَعَلِیٌّ مَولاہُ○'' سنا تو (حضرت علی علیہ السلام سے) کہا، ''اے ابوطالب کے بیٹے! آپ صبح وشام (یعنی ہمیشہ کے لئے) ہر مومن اور مومنہ کے مولا قرار پائے۔'' امام احمد بن حنبل نے اپنی کتاب ''فضائل الصحابہ'' میں حضرت عمر والی حدیث میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''(اے اللہ! جو علی (علیہ السلام) سے عداوت رکھے اُس سے تُو عداوت رکھ جو (علی علیہ السلام) کی مدد کرے اُس کی تُو مدد فرما، جو اِس سے محبت کرے تُو اس سے محبت کر۔'' شعبہ کا کہنا ہے کہ اِس کی جگہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''جو (علی علیہ السلام) سے بغض رکھے تُو (بھی) اُس سے بغض رکھ)۔''[1]

اہلِ سنت کے امام جناب ولی الدین محمد بن محمد بن عبداللہ الخطیب العربی اپنی مشہور کتاب ''مشکوٰۃ

---

[1] احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) المسند، ۴: ۲۸۱

ابن ابی شیبہ (متوفی: ۸۴۹ء، کوفہ) المصنف، ۱۲: ۷۸، رقم: ۱۲۱۶۷

محب الدین طبری (متوفی: ۶۹۴ء، مکہ) ذخائر العقبی فی مناقب ذوی القربی: ۱۲۵

محب الدین طبری (متوفی: ۶۹۴ء، مکہ) الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ، ۳: ۱۲۶

محب الدین طبری (متوفی: ۶۹۴ء، مکہ) فیض القدیر، ۶: ۲۱۶

حسام الدین ہندی (متوفی: ۱۵۶۷ء مکہ) کنز العمال، ۱۳: ۱۳۳، رقم: ۳۶۴۲۰

ابن عساکر (متوفی: ۱۱۷۵ء، دمشق) تاریخ دمشق الکبیر، ۴۵: ۱۶۷

ابن کثیر (متوفی: ۱۳۷۳ء، دمشق) البدایہ والنہایہ، ۴: ۱۶۹؛ ۵: ۴۶۴

احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) فضائل الصحابہ، ۲: ۶۱۰، رقم: ۱۰۴۲

عز الدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) اسد الغابہ ۴: ۱۰۳

شمس الدین ذہبی (۱۳۴۸ء، دمشق) سیر اعلام النبلاء ۲: ۶۲۳

المصابیح''، یعنی مشکوٰۃ شریف میں روایت کرتے ہیں،''زید بن ارقم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکّہ اور مدینہ کے درمیان خطبہ دینے کے لئے سواری سے اُترے اور حمد وثنائے اللہ بجالائے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،''اے لوگو! میں بس ایک انسان ہوں، بہت نزدیک ہے وہ دن کہ میرے پروردگار کا پیغام آجائے اور میں لبیک کہوں۔ بلاشبہ میں تم میں دوگرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، پہلی ان میں سے اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور روشنی ہے تو اللہ کی کتاب کو لو اور اس سے تمسّک کرو'' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتاب اللہ پر عمل کی ترغیب دی اور اس پر بہت زور دیا۔ پھر فرمایا،''میں تمہیں اپنے اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں خدا کو یاد دلاتا ہوں، (پھر کہا) میرے اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں خدا کو یاد دلاتا ہوں۔''[1]

مولانا شبلی نعمانی نے صحیح بخاری وترمذی کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے،''اے لوگو! میں بھی بشر ہوں، ممکن ہے کہ خدا کا فرشتہ جلد آجائے اور مجھے (موت کو) قبول کرنا پڑے۔ میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک خدا کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے، پس خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور دوسری چیز میرے اہل بیت (علیہم السلام) ہیں۔ میں اپنے اہل بیت (علیہم السلام) کے بارے میں تمہیں خدا کی یاد دلاتا ہوں (آخری جملے کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین دفعہ دہرایا۔ (یہ صحیح مسلم، مناقب حضرت علی علیہ السلام کی روایت ہے) اور نسائی، مسند امام احمد، ترمذی، طبرانی، طبری، حاکم وغیرہ میں کچھ اور فقرے بھی ہیں جن میں حضرت علی (علیہ السلام) کی منقبت ظاہر کی گئی ہے۔[2]

شاہ معین الدین احمد ندوی جو کہ مولانا شبلی نعمانی کے شاگرد رشید ہیں، صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل باب علی (علیہ السلام) کو ماخذ قرار دے کر لکھتے ہیں،''(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے) مدینہ کی طرف کوچ فرمایا اور راستے میں مقام غدیر خم میں ایک مختصر خطبہ دیا،''حمد وثناء کے بعد (فرمایا)، اے لوگو! میں بھی بشر ہوں، ممکن ہے خدا کا فرشتہ آئے اور مجھے اُس کی دعوت قبول کرنا پڑے۔ میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں۔ ایک خدا کی کتاب ہے جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے، خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو؛ اور دوسری چیز میرے اہل بیت (علیہم السلام) ہیں، میں اپنے اہل بیت (علیہم السلام) کے بارے میں تم کو خدا کی یاد دلاتا ہوں۔''[3] مُلّا علی متقی کی کنز العمال میں ایک ہی مضمون کے تین جملے مختلف راویوں کی زبانی بیان ہوئے ہیں جن کے مشہور الفاظ یہ ہیں،''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَّوْلَاہُ○'' اور یہی حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے بھی

---

[1] ولی الدین محمد بن محمد بن عبداللہ الخطیب العربی (متوفی: ۷۴۳ھجری)، مشکوۃ المصابیح

[2] مولانا شبلی نعمانی (متوفی: ۱۹۱۴ء، لکھنؤ)، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حصّہ دوم صفحہ ۱۶۸

[3] شاہ معین الدین احمد ندوی (متوفی: ۱۹۷۴، بھارت) تاریخ اسلام حصّہ اوّل، ص ۱۱۱

لکھے ہیں۔ [1]

''مُسند'' میں امام احمد بن حنبل نے اور ابنِ اثیر جزری نے ''اسد الغابۃ'' میں مُتعدّد مواقع پر درج کیا ہے کہ علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام نے کوفہ کے مقام رحبہ میں، جہاں ظاہر ہے کہ تمام اصحابِ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود بھی نہ تھے بلکہ صرف وہی تھے جو اتفاق سے عراق پہنچے گئے تھے اور اُس وقت اُس مقام پر موجود تھے، اس واقعے کی چشم دید گواہیاں طلب کیں کہ جس جس نے اپنے کان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غدیر خم میں یہ الفاظ فرماتے ہوئے سنا ہے وہ گواہی دیں۔ تو بارہ افراد ایسے صحابہ میں سے جو جنگ بدر میں شریک ہو چکے تھے کھڑے ہو گئے اور اُنہوں نے اعلان کیا کہ ہم نے اپنے کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ الفاظ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ [2]

مشکوٰۃ میں ہے، ''فرمایا تین مرتبہ کہ کیا تم لوگ جانتے ہو کہ میں تمام مومنوں پر خود اُن سے زیادہ اختیارات رکھتا ہوں؟ سب نے کہا کہ ہم جانتے ہیں، تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اُس کا علی (علیہ السلام) مولا ہے۔ [3]

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''تم لوگ علی سے متعلق کیا چاہتے ہو؟ تم لوگ علی سے متعلق کیا چاہتے ہو؟ تم لوگ علی سے متعلق کیا چاہتے ہو؟'' پھر فرمایا: ''بیشک علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں اور وہ میرے بعد ہر مؤمن کا ولی ہے۔'' [4]

سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا، ''جس کا میں ولی ہوں اُس کا علی ولی ہے۔'' اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (حضرت علی علیہ السلام سے) یہ فرماتے ہوئے سنا، ''تم میری جگہ پر اسی طرح ہو جیسے ہارون (علیہ السلام) موسیٰ (علیہ السلام) کی جگہ پر تھے، مگر میرے بعد کوئی نبی

---

[1] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام ص ۵۰۵ بحوالہ کنز العمال، ج ۱۲ ص ۲۰۲

[2] احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) المسند، ج ۱ ص ۱۹۵، ۹۶

عز الدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) اسد الغابہ، ج ۴ ص ۲۸

[3] ولی الدین خطیب تبریزی (متوفی: ۷۴۰ ہجری، بغداد) مشکوٰۃ، مطبوعہ دمشق، ج ۳ ص ۳۰

[4] ترمذی (متوفی: ۲۷۹ ہجری، ترمذ) الجامع الصحیح، ۶: ۷۸، ابواب المناقب، رقم: ۳۷۱۲

احمد بن شعیب نسائی (متوفی: ۳۰۳ ہجری، مکہ) خصائص نسائی، ۷۷، ۹۲، رقم: ۶۵، ۸۶

احمد بن شعیب نسائی (متوفی: ۳۰۳ ہجری، مکہ) السنن الکبریٰ، ۵: ۱۳۲، رقم: ۸۴۸۴

نہیں۔'' اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (غزوۂ خیبر کے موقع پر) بھی فرماتے ہوئے سنا، ''میں آج اُس شخص کو جھنڈا عطا کروں گا جو اللہ اور اُس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔'' [1]

سفیان بن عیینہ، مناقبِ علی علیہ السلام کے ضمن میں سعد بن ابی وقاص سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی چار خوبیاں ایسی ہیں کہ اگر میں اُن میں سے کسی ایک کا بھی حامل ہوتا تو اُسے فُلاں فُلاں چیز حتیٰ کہ سرخ اُونٹوں سے بھی زیادہ محبوب رکھتا۔ وہ چار خوبیاں یہ تھیں: اُنہیں غزوۂ خیبر کے موقع پر جھنڈے کا عطا ہونا، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُن سے یہ فرمانا کہ تیرا اور میرا تعلق ایسے ہے جیسے ہارون (علیہ السلام) اور موسیٰ (علیہ السلام) کا ہے، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُن کے لئے یہ فرمانا کہ جس کا میں مولا ہوں اُس کا علی مولا ہے۔ (راوی ءحدیث) سفیان بن عیینہ کو چوتھی خوبی بھول گئی۔ [2]

عبدالرحمن بن سابط بھی مناقبِ علی علیہ السلام کے ضمن میں یہ روایت کچھ فرق کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں کہ سعد نے کہا، ''میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت علی علیہ السلام کے تین ایسے فضائل بیان فرماتے ہوئے سنا کہ اگر اُن میں سے ایک بھی مجھے عطا ہو تو وہ مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہو۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''جس کا میں مولا ہوں اُس کا علی علیہ السلام مولا ہے، اور علی (علیہ السلام) میری جگہ ایسا ہے جیسے موسیٰ (علیہ السلام) کی جگہ ہارون (علیہ السلام)، اور میں اُسے علم عطا کروں گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حبیب ہے اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کے حبیب ہیں۔'' [3]

---

[1] ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابنِ ماجہ (متوفی: ۸۶۶ء، قزوین) سنن ابنِ ماجہ، ۱: ۹۰، المقدمہ، رقم: ۱۲۱
احمد بن شعیب نسائی (متوفی: ۳۰۳ھجری، مکہ) خصائص نسائی، ص: ۳۲، ۳۳، رقم: ۹۱
ابنِ ابی عاصم اللالبنانی (متوفی: ۲۸۷ء) کتاب السنۃ ظلال الجنۃ، ۶۰۸، رقم: ۱۳۸۶
جمال الدین مزی (متوفی: ۱۳۴۱ء دمشق) تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الأطراف، ۳: ۳۰۲، رقم: ۳۹۰۱

[2] ابنِ ابی عاصم اللالبنانی (متوفی: ۲۸۷ء) کتاب السنۃ ظلال الجنۃ، ۶۰۷ رقم: ۱۳۸۵
احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) فضائل الصحابہ، ۲: ۶۴۳، رقم: ۱۰۹۳
ضیاء الدین المقدسی (متوفی: ۱۲۴۵ء، دمشق) الاحادیث المختارۃ، ۳: ۱۵۱، رقم: ۹۴۸
ابن عساکر (متوفی: ۵۷۱ھ، دمشق)، تاریخ دمشق الکبیر، ۴۵: ۹۱

[3] ابنِ ابی عاصم اللالبنانی (متوفی: ۲۸۷ء) کتاب السنۃ ظلال الجنۃ، ۶۰۸، رقم: ۱۳۸۶
ابن ابی شیبہ (متوفی: ۸۴۹ء، کوفہ) المصنف، ۱۲: ۶۱، رقم: ۱۲۱۲۷
ضیاء الدین المقدسی (متوفی: ۱۲۴۵ء، دمشق) الاحادیث المختارۃ، ۳: ۲۰۷، رقم: ۱۰۰۸
ابن عساکر (متوفی: ۵۷۱ھ، دمشق) تاریخ دمشق الکبیر، ۴۵: ۸۹

غدیر خم کے بعد بھی اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں تاکید

امیر المومنین علی علیہ السلام اور دیگر اہل بیت اطہار علیہم السلام کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف غدیر خم کے خطبے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس کے بعد بھی تا وقتِ رحلت مسلمانوں کو نصیحت اور وصیّت فرماتے رہے۔ شیخ مفیدؒ اور شیخ طوسیؒ نے روایت کی ہے کہ جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حَجَّۃُ الوِداع سے مُراجَعَت فرمائی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہُوا کہ زمانۂ رحلت قریب ہے تو ہمیشہ خطبہ ہائے بلیغ فرماتے، لوگوں کو اپنے احکام سے روگردانی کرنے اور اپنے بعد فتنہ وفساد برپا کرنے سے منع کرتے، ڈراتے اور وصیّت فرماتے، ''اے لوگو! میرے طریقے اور میری سنت سے دستبردار نہ ہوجانا، دینِ خدا میں بدعَت نہ کرنا، میری عترت واَہل بیت (علیہم السلام) کی اِطاعت ونصرت کرنا، ان سے موافق رہنا اور ان کی مخالفت نہ کرنا اور مرتد نہ ہوجانا'' اور مکرر ارشاد فرماتے، ''اے لوگو! میں تم سے پہلے جارہا ہوں، تم حوضِ کوثر پر میرے پاس آؤ گے اور میں تم سے سوال کروں گا کہ تم نے اُن دو بزرگ چیزوں یعنی کتابِ خدا اور میری عترت واَہل بیت (علیہم السلام) کے ساتھ کیا سلوک کیا جن کو میں (تمہارے درمیان) چھوڑ آیا تھا۔ پس تم سوچو اور غور وفکر کرو کہ کس طرح ان دونوں سے برتاؤ کرو گے؟ بتحقیق خداوند لطیف وخبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں چیزیں جُدا نہ ہوں گی جب تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس نہ آجائیں۔ اِن دونوں کو میں تمہارے درمیان چھوڑے جاتا ہوں، میرے اَہل بیت (علیہم السلام) پر سبقت نہ کرنا اور اِن سے پراگندہ (منتشر) نہ ہونا، اِن کے حق میں تقصیر (خطا) نہ کرنا ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے اور کوئی چیز اِن کو تعلیم نہ کرنا کہ یہ تم سے زیادہ دانا ہیں، ایسا نہ ہو کہ میرے بعد میرے دِین سے منحرف ہوجاؤ، کافر بن جاؤ اور ایک دوسرے پر تلوار کھینچو۔ اے لوگو! جان لو کہ علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) میرا چچازاد بھائی اور میرا وصی ہے۔ وہ تاویلِ قرآن پر قتال کرے گا جس طرح میں نے تنزیلِ قرآن پر کیا۔''[1]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۰۹، ۱۱۰

سنہ ۱۱ ہجری

سریہ حضرت اُسامہ بن زید حارثہ

(۲۶ صفر ۱۱ ہجری)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اپنی شہرہ آفاق کتاب ''مدارج النبوت'' میں لکھتے ہیں کہ آخری سریہ جیشِ اُسامہ بن زید تھا۔ اُس میں لشکر کو پیر کے دن ۲۶ صفر ۱۱ ہجری میں رُوم کی طرف کوچ کا حکم ہُوا جہاں اُن کے والد کی شہادت گاہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اُسامہ کو، جن کی عمر صرف اٹھارہ، اُنیس یا بیس سال تھی، لشکر کا امیر بنایا اور فوراً روانہ ہونے کا حکم صادِر فرمایا۔ اُس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیل تھے لیکن علالت کے باوجود اپنے دستِ مبارک سے علم تیار کیا اور اُسامہ بن زید سے فرمایا کہ بسم اللہ کر کے اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور خدا کے کافروں سے قتال کرو۔ حضرت اُسامہ نے جھنڈا لیا اور روانہ ہو گئے۔ اُنہوں نے مدینہ کے قریب جرف کے مقام پر پڑاؤ کیا تا کہ لشکرِ اسلام جمع ہو جائے۔ دربارِ رسالت سے یہ حکم عالی صادر ہُوا کہ سوائے حضرت علی علیہ السلام کے، باقی تمام اعیانِ مہاجرین و انصار مثلاً حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہ حضرت اُسامہ کے ہمراہ جائیں۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقریباً تمام بزرگ صحابہ کرام کو روانہ کیا مگر حضرت علی علیہ السلام کو روک لیا۔ حضرت اُسامہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق لشکر گاہ پہنچے اور کُوچ کا حکم دیا۔ ابھی خود سوار ہو رہے تھے کہ اُن کی والدہ اُمّ ایمن نے پیغام بھیجا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزع کے عالم میں ہیں۔ اُسامہ لوٹ آئے، صحابہ بھی واپس آ گئے جبکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بن خطاب پہلے ہی مدینہ میں تھے۔[1]

اس واقعے میں کئی اہم پہلو دعوتِ فکر دیتے ہیں، مثلاً:

۱۔ شدید علالت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس لشکر کو رُوم کی طرف کیوں روانہ فرما رہے تھے اور لشکر کے جلد از جلد کُوچ کرنے پر کیوں مُصر تھے؟

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کو بھی لشکر کے ساتھ روانہ ہونے کا حکم دیا مگر حضرت علی علیہ السلام جیسے جری مجاہدِ اسلام کو روک لیا۔ اگر وہ جنگ اتنی اہم تھی جس کے لئے لشکرِ اسلام کو جلد از جلد

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۴۷۶

روانہ ہونے کا حکم دیا جارہا تھا تو ایسی جنگ میں شیرِ خدا کی شمولیت تو ضروری ہونا چاہیے تھی پھر اُن کو مدینہ میں ہی روک لینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا حکمت نہاں تھی؟

۳۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان جیسے تجربہ کار صحابہ کرام کے ہوتے ہوئے ایک نوعمر شخص کو لشکر کا امیر بنانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا مصلحت تھی؟

علامہ باقر مجلسیؒ، ''جلاء العیون'' میں لکھتے ہیں، ''اس کی وجہ یہ تھی کوئی علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) سے مخالفت و مُنازَعَت نہ کرے اور جناب امیر علیہ السلام کی خلافت مُستَقَر اور مُحکم ہو جائے۔ پس لوگوں کے (مدینہ سے) باہر جانے پر مُصِر تھے اور اُسامہ کو حکم دیا کہ ''جرف'' میں جائے اور وہاں پہنچ کر تَوَقُّف کرے تا کہ لشکری وہاں آ کر جمع ہو جائیں اور ایک جماعت کو مقرر فرمایا کہ لوگوں کو نکال دیں (یعنی مدینہ سے نکال کر لشکر کے ساتھ روانہ کریں)۔ پس اسی حالت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مرض الموت طاری ہُوا۔''[۱]

شیخ مفیدؒ لکھتے ہیں، ''یہ اس لئے تھا کہ مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت کوئی ایسا شخص نہ رہے جو اُمت کی سربراہی میں اختلاف کرے اور جو خود لوگوں کے آگے ہونے کی اپنے لئے توقع رکھتا ہو اور اس طرح اُس شخص کے لئے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنا جانشین بنایا ہے مقصد کی تکمیل ہو جائے اور اُس کے حق کے بارے میں کوئی نزاع کرنے والا نزاع نہ کرے۔''[۲]

علامہ طبرسیؒ لکھتے ہیں، ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ صرف اس لئے کیا کہ مدینہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت کوئی ایسا شخص نہ رہے جو امامت میں اختلاف کرے یا خود امیر بننے کا خواہشمند ہو اور اس طرح جو اس کا حق دار ہے اُس کے لئے یہ امر پایہ تکمیل تک پہنچے۔[۳]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[۱] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱

[۲] شیخ مفیدؒ (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد) ارشاد، صفحہ ۸۴

[۳] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری ایامِ حیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غدیر خم میں ہی مسلمانوں کو آگاہ فرما چکے تھے کہ بہت نزدیک ہے وہ دن کہ میرے پروردگار کا پیغام آجائے اور میں لبیک کہوں چنانچہ غدیر سے واپسی پر ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیل ہو گئے تھے اور بیماری رفتہ رفتہ بڑھتی چلی گئی۔ ماہِ صفر کے آخری دنوں میں اس کا غلبہ زیادہ ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جان لیا کہ اب جسمانی طاقت زیادہ دیر ساتھ نہ دے گی تو علی علیہ السلام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بقیع کی طرف متوجہ ہوئے۔ اکثر اصحابؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے پیچھے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حق تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مردگانِ بقیع پر استغفار کروں چنانچہ جب بقیع میں پہنچے تو ارشاد فرمایا، ''السّلام علیکم اے اہل قبور! تم کو وہ حالت گوارا ہو جس میں تم نے صبح کی اور اس فتنہ وفساد سے نجات پائی جو لوگوں کو درپیش ہے۔ بتحقیق کہ مانند پارہ ہائے شبِ تار فساد وفتنہ ہائے عظیم نے لوگوں کی جانب رخ کیا ہے۔'' یہ فرما کر دیر تک اہلِ بقیع کے لئے طلبِ مغفرت کی۔ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بقیع میں اہلِ قبور کے لیے دُعا سے فارغ ہو کر حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ مجھے لگتا ہے کہ میرا وقتِ وفات قریب ہے۔ پھر فرمایا یا علی! حق تعالیٰ نے مجھے خزانہ ہائے دُنیا پر مُخیَّر فرمایا ہے کہ میں چاہوں تو ہمیشہ دُنیا میں رہوں یا چاہوں تو بہشت میں رہوں، مگر میں نے لِقائے پروردگار (دیدارِ خدا) کو اختیار کیا ہے۔ جب میں انتقال کروں تو تم میرے سَتر کو ڈھانپ دینا کیونکہ جس کی نظر پڑ جائے گی وہ اندھا ہو جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرض شدید ہو گیا تھا اس کے باوجود تیسرے روز مسجد میں تشریف لائے۔ نقاہت کی وجہ سے چلنے میں دشواری کا سامنا تھا اس لیے دایاں ہاتھ دوشِ جناب علی علیہ السلام پر اور بایاں ہاتھ حضرت فضل بن عباس کے کندھے پر تھا۔ یہاں تک کہ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ [2] حضرت رِسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد کے منبر پر تشریف رکھنے کے بعد فرمایا، ''اے گروہِ مردم! اب وہ وقت قریب ہے کہ میں تم سے رخصت ہو جاؤں۔ جس کسی کا مجھ سے کوئی عہد ہو وہ

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۱۰

[2] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۱۰

آئے اور مجھ سے لے لے اور جس کسی کا کوئی قرض میرے ذمہ ہو وہ مجھ سے وصول کر لے۔ اے گروہِ انسان! کسی متنفس اور خدا کے درمیان سوائے اللہ کی بندگی کے عمل کے کوئی وسیلہ نہیں جس کے سبب سے کوئی عملِ خیر واقع ہو یا کوئی شر اُس سے دفع ہو۔ اے لوگو! کوئی مدعی یہ دعویٰ نہ کرے کہ وہ بغیر عمل کے رہائی پائے گا اور کوئی یہ آرزو نہ کرے کہ بغیر اللہ کی بندگی کے وہ رضائے الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں اُس خدا کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ نیک عمل اور رحمتِ حق تعالیٰ سے عذابِ الٰہی سے نجات ہے اور مَعصِیَت سے جہنم ہے۔ خداوندا! میں نے تیری رِسالت پہنچا دی۔'' یہ فرمایا اور منبر سے نیچے تشریف لائے پھر لوگوں کے ساتھ بسہولت نماز ادا فرمائی اور حضرت اُمّ سلمہ کے گھر تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں ایک یا دو روز رہے تھے کہ حضرت عائشہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے گھر لے گئیں۔ [1]

مرض میں شدت آ گئی تھی اس کے باوجود حضرت بلال رضی اللہ عنہ نمازِ فجر کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لینے حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت ضعف و ناتوانی سے قدم اُٹھاتے ہوئے چل دیئے اور اس طرح مسجد پہنچے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ہاتھ امیر المومنین علی علیہ السلام کے کندھے پر اور دوسرا فضل بن عباس کے کندھے پر تھا۔ جب محراب کے قریب تشریف لائے تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ حضرت ابوبکر نے نماز شروع کرا دی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دستِ مبارک سے اشارہ فرما کر اُنہیں پیچھے ہٹایا اور خود داخلِ محراب ہوئے اور دوبارہ نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد گھر تشریف لائے اور حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور مسلمانوں کی ایک جماعت کو طلب کیا اور فرمایا کہ کیا میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا کہ اُسامہ کے لشکر کے ساتھ جاؤ؟ سب نے اقرار کیا اور کہا کہ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو یہ حکم دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم نے میرے حکم کی اِطاعت کیوں نہیں کی؟ حضرت ابوبکر نے کہا کہ میں گیا تھا لیکن اس لئے لوٹ آیا کہ اپنا عہد تازہ کروں۔ حضرت عمر بولے کہ میں اس لیے نہ گیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیمار پرسی کروں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ حکم دیا کہ لشکرِ اسامہ کے ہمراہ چلے جاؤ۔ پھر شدتِ مرض سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت ایسی ہوگئی کہ مسلمان رونے لگے اور آوازِ نوحہ و گریہ برزنان و فرزندانِ حضرت اور صدائے غُل و شورِ مردان و زنانِ مسلمانان بلند ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور فرمایا، ''دوات اور کتفِ گوسفند لاؤ کہ میں تمہارے لئے ایک نامہ لکھوں کہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔'' [2]

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۱۰

[2] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۱۲

حدیثِ قِرطاس

وقتِ رِحلت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دوات اور کتف گوسفند لاؤ کہ میں تمہارے لیے ایک نامہ لکھ دوں تا کہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو جاؤ تو اصحاب میں سے ایک شخص اُٹھ کھڑا ہُوا تا کہ دوات اور کتفِ گوسفند لائے۔ کسی نے کہا کہ واپس آ جاؤ پھر نازیبا الفاظ استعمال کیے اور کہا کہ ہم کو کتابِ خدا ہی کافی ہے۔ اس پر جو لوگ وہاں موجود تھے اُن میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ کچھ نے کہا کہ قلم لایا جائے اور بعض نے کہا کہ نہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طلب کیا ہے کیا ہم وہ لائیں؟ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان بیہودہ باتوں کے بعد جو میں نے تم سے سُنی ہیں، اب مجھے دوات و قلم کی حاجت نہیں لیکن میں تمہیں وصیّت کرتا ہوں کہ میرے اہلِ بیت سے نیک سلوک کرنا اور روگردانی نہ کرنا۔

علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں کہ حدیثِ دوات و کاغذ صحیح بخاری و مسلم اور جمیع کتب معتبرہ اہلِ سنت میں ہے اور مُتعدّد طریقوں سے مذکور ہے۔ اہلِ سنت نے ابنِ عباس سے اس طرح روایت کی ہے کہ ابنِ عباس اس قدر روئے کہ اُن کے آنسوؤں سے مسجد کا منبر بھیگ گیا اور کہا کہ روزِ پنجشنبہ! اور کون سا پنجشنبہ؟ وہ جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مرض شدید ہُوا اور حکم دیا کہ قلم دوات اور کاغذ لاؤ کہ میں تمہارے لئے ایک وصیّت لکھوں کہ اس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ لوگوں نے آپس میں حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب نزاع کی۔ کسی نے کلامِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (معاذ اللہ) ہَذیان سے نسبت دی اور بروایتِ دیگر کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مرض کی شدت ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے وہ ہم کو اور تم کو کافی ہے۔ یہ سُن کر لوگوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ بعضوں نے کہا کہ کاغذ اور قلم لانا چاہیئے تا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے لئے ایک ایسی وصیّت لکھیں کہ اس کے بعد تم گمراہ نہ ہو اور بعضوں نے دوسرے قول کو پسند کیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک آوازیں بلند ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دِل تنگ ہو کر فرمایا کہ میرے پاس سے اُٹھ جاؤ۔ ابنِ عباس کہتے تھے کہ مصیبت اور بدترین مصیبت وہ تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تحریرِ وصیّت سے مانع ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رُوبرُو آوازیں بلند کیں یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتقال فرمایا۔ [1]

واقعہ قرطاس کو کئی مؤرخین نے لکھا ہے مثلاً معروف محقق و مؤرخ مولانا شبلی نعمانی نے اسے اپنی

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۱۲، ۱۱۳

کتاب الفاروق میں رقم کیا ہے۔[1] علامہ علی نقی نقوی نے تاریخ اسلام میں بحوالہ ارشادات، اعلام الوریٰ، صحیح بخاری اور مسند احمد بن حنبل لکھا ہے۔[2]

اور علامہ محمد باقر مجلسی نے جلاء العیون میں بیان کیا ہے۔[3]

ان کے علاوہ بھی کئی محققین و مؤرخین و مؤلفین نے اس واقعے کو کتبِ سیر میں درج کیا ہے۔

واقعہ قرطاس میں کئی پہلو قابلِ غور ہیں، مثلاً:

۱) وہ کون سی ایسی بات تھی جسے لکھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قلم دوات اور کاغذ طلب کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے لئے ایسی چیز لکھوں تا کہ تم آئندہ گمراہ نہ ہو جاؤ؟ اور وہ بھی ایسے موقع پر فرما رہے ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اُمت سے رخصت ہو رہے ہیں۔

۲) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رِحلت کے بعد اُمت کے گمراہ ہو جانے کا امکان کس تنازع پر ہو سکتا تھا جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی تحریر کے ذریعے نمٹا دینا چاہتے تھے؟

۳) کسی کو قلم دوات اور کاغذ لائے جانے پر اعتراض کیوں تھا؟ کیوں کہا کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے؟ یعنی وہ کیوں نہیں چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری اور اہم وصیّت زیرِ قلم آئے؟

۴) کیا اُن کو علم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا لکھنا چاہتے تھے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری خطبہ

علامہ باقر مجلسیؒ لکھتے ہیں کہ تمام اہلِ مدینہ اور مہاجر و انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری زیارت کے لئے مسجد میں حاضر ہوئے۔ تمام مرد و زن روتے پیٹتے تھے، بعض واویلا کرتے تھے اور ''اِنَّا لِلّٰہ'' کہتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (اُس وقت) آخری خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ کبھی ضعف و ناتوانی کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو جاتے اور (ذرا تو قُّف کے بعد) پھر خطبہ شروع فرماتے۔ اثنائے خطبہ میں ارشاد فرمایا، ''اے گروہِ مہاجر و انصار اور جو شخص اس وقت یہاں موجود ہے، آدمیوں اور جنّات، سب سے میرا خطاب ہے کہ جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں تم اُن لوگوں کو بھی پہنچا دو جو یہاں موجود نہیں ہیں اور حق کو نہ چُھپاؤ کہ

---

[1] مولانا شبلی نعمانی (متوفی: ۱۹۱۴ء، لکھنؤ) الفارق صفحہ ۶۷ مطبوعہ دار الاشاعت کراچی طبع اوّل ۱۹۹۱ء

[2] علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام صفحہ ۵۱۹ تا ۵۲۵

[3] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۱۱

میں اب جاتا ہوں اور تم میں کتابِ خدا چھوڑے جاتا ہوں جو کہ منور بنُورِ ہدایت ہے اور جس چیز کی اُمت محتاج ہو اُس سب کا بیان اس میں ہے اور حُجّتِ خدا تم پر ہے میری طرف سے اور میں تم میں ''علمِ اکبر'' چھوڑے جاتا ہوں، کہ وہ نشانِ راہِ دِین اور نُورِ ہدایت ہے اور وہ علی بنِ ابی طالب (علیہ السلام) میرا وصی ہے، وہ اللہ کی مضبوط رَسی ہے۔ لازم ہے کہ تم سب اُس سے مُتمَسّک رہو، اُس سے پراگندہ (متذبذب، متردّد، منتشر) نہ ہو اور نعمتِ خدا کو یاد کرو۔ اے لوگو! علی بن ابی طالب (علیہ السلام) علم وحکمت میں خدا کا خزانہ ہے، جو شخص اس کو دوست رکھے اس نے عہدِ خدا کو وفا کیا اور جو اس سے دشمنی کرے وہ قیامت کے دن اندھا اور بہرا محشور ہوگا۔ [1]

وصیّت برائے تجہیز و تکفین

جناب سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ یا علی! مجھے غسل تم دینا، تمہارے سوا اور کوئی مجھے غسل نہ دے کہ اندھا ہو جائے گا۔ علی علیہ السلام نے اس کا سبب دریافت کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبرائیل (علیہ السلام) نے ربِ جلیل کا ارشاد اسی طرح بیان کیا ہے کہ تمہارے انتقال کے بعد جس کی نظر تمہارے بدن پر پڑے گی وہ اندھا ہو جائے گا۔ حضرت علی علیہ السلام نے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اکیلا کیسے غسل دے سکوں گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبرائیل و میکائیل و اسرافیل و عزرائیل و اسماعیل (علیہم السلام) جو کہ آسمانِ اوّل پر موکل ہیں، میرے غسل میں تمہاری مدد کریں گے۔ علی علیہ السلام نے عرض کی کہ پانی کون دے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ فضل بن عباس، لیکن اُس کو چاہیے کہ اپنی آنکھیں بند رکھے کہ میرے بدن پر نظر نہ پڑے کیونکہ سوائے تمہارے، سب مردوں اور عورتوں پر حرام ہے کہ میرے بدن پر نظر کریں۔ اے علی! جب تم مجھے تختے پر رکھنا اور میرے بدن کو دھونا تو پانی کے چالیس ڈول میرے بدن پر ڈالنا۔ جب غسل سے فارغ ہونا تو یہاں تک توقُّف کرنا کہ جبرائیل (علیہ السلام) تم کو اجازت دیں۔ پھر مجھے اُسی جگہ دفن کرنا جہاں میری رُوح قبض ہو اور کفن تین جاموں کا دینا جن میں سے ایک جامہ یمنی ہو۔ تمہارے سوا کوئی دوسرا میری قبر میں نہ آئے۔ فاطمہ اور حسنین (علیہم السلام) کے ہمراہ مجھ پر نماز پڑھنا اور پچھتر (۷۵) مرتبہ تکبیر کہنا۔ تمہارے بعد میرے گھر کے مرد جوق در جوق مجھ پر نماز پڑھیں اور اُن کے بعد

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۱۴

خواتین اور پھر (باقی) تمام لوگ مجھ پر نماز پڑھیں۔[1] (واضح رہے کہ یہاں نماز سے مراد دُرود وسلام ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ میں دُرود وسلام ہی پڑھا گیا جس کی تفصیل آنے والے صفحات پر باب ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ'' میں ہے۔ مؤلف)

روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے جو مجھ پر نماز پڑھے گا وہ خداوند جبار ہے جو کہ عرشِ عظمت وجلال پر مجھ پر صلوٰۃ بھیجے گا۔ بعدازاں جبرائیل ومیکائیل واسرافیل (علیہم السلام) لشکر ہائے ملائکہ کے ساتھ کہ جن کی گنتی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، مجھ پر نماز پڑھیں گے۔ اُن کے بعد وہ ملائکہ نماز پڑھیں گے جو عرشِ الٰہی کو احاطہ کیے ہوئے ہیں، پھر ساکنانِ ہر آسمان ایک دوسرے کے بعد مجھ پر نماز پڑھیں گے۔ اُن کے بعد میرے جمیع اہل بیت (علیہم السلام) اور میری بیبیاں، بحسبِ مراتب اشارہ اور سلام (دُرود وسلام) مجھ پر کریں گے جو حق اشارہ اور سلام کرنے کا ہے۔ پھر تم لوگ جوق درجوق اس گھر میں آنا اور مجھ پر صلوٰۃ بھیجنا اور سلام کرنا اور مجھے آزار نہ دینا اور لازم ہے کہ سب سے پہلے آدمیوں سے وہ مجھ پر نماز پڑھے گا جو میرے اہل بیت (علیہم السلام) میں سے (سب سے زیادہ) مجھ سے قریب ہوگا، اُس کے بعد میرے اہل بیت (علیہم السلام) کی عورتیں اور لڑکے اور اُن کے بعد اور لوگ نماز پڑھیں گے۔[2]

بھائی اور بیٹی سے آخری گفتگو

وقتِ رحلت جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ علیہا السلام، حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام کو بلایا۔ باقی لوگوں کو گھر سے باہر بھیج دیا اور حضرت اُمّ سلمہؓ کو حکم دیا کہ دروازے کے قریب کھڑی رہیں اور کسی کو دروازے کے پاس نہ آنے دیں۔ پھر فرمایا، یا علی! میرے نزدیک آؤ کہ اب وقتِ وداع ہے، پھر اپنی نُورِدیدہ حضرت فاطمہ علیہا السلام کا ہاتھ اپنے منہ پر رکھا اور دستِ مبارک سے اُن کا ہاتھ پکڑا اور حسرت ویاس سے دونوں کو دیکھا۔ جناب سیّدہ علیہا السلام اپنے پدرِ بزرگوار کے سینے سے لپٹ گئیں اور بوسے لینے لگیں۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور جگر خراش نالۂ آہ بلند تھا۔

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسن وحسین (علیہما السلام) کو گود میں لیا پھر فاطمہ علیہا السلام کا ہاتھ علی علیہ السلام کے ہاتھ میں دیا اور فرمایا، ''یا علی! یہ امانتِ خدا اور امانتِ رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے کہ بحرمتِ خدا اور بحرمتِ رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۲۵، ۱۲۶

[2] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۴۹، ۱۵۰

اس کے حق میں رعایت کرنا۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ بہترین زنانِ گذشتگان و آئندگان ہے اور یہ خدا کے نزدیک مریم (علیہا السلام) سے زیادہ بزرگ ہے۔ یا علی! واضح ہو کہ جس سے میری بیٹی راضی ہے میں اُس سے راضی ہوں اور اسی طرح پروردگار اور ملائکہ بھی اُس سے خوش ہیں جس سے فاطمہ (علیہا السلام) خوش ہے۔ اے علی! وائے اُس پر جو اس پر ظلم و ستم کرے اور عذابِ جہنم و ہلاکت اُس کے لئے جو اس کا حق غصب کرے، اس کا دِل دُکھائے اور اس کی ہتکِ عزت کرے۔'' یہ فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب فاطمہ علیہا السلام کو آغوشِ مبارک میں لے لیا۔ اُس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور ریشِ مبارک پر بہنے لگے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سر مبارک اپنے سینے سے لگا لیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رونے سے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فاطمہ زہرا (علیہا السلام) کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور حسنین (علیہما السلام) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قدمہائے مبارک چوم رہے تھے اور اپنی آنکھوں سے مَل رہے تھے اور بصدائے بلند رو رہے تھے۔ اُس وقت جبرائیل (علیہ السلام) بھی وہاں موجود تھے اور میں اُن کے رونے کی آواز بھی سُن رہا تھا۔ گریۂ فاطمہ (علیہا السلام) سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا زمین و آسمان بھی گریہ و فغاں کر رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے فاطمہ! نہ رو کیونکہ یہاں جس قدر یاور (مددگار، حمایتی) اور ہم نشیں یعنی ملائکہ بیٹھے ہیں اُن کو تیرے رونے سے تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اس وقت جبرائیل و میکائیل و صاحبِ اسرارِ خُدا اسرافیل (علیہم السلام)، سبھی تیرے رونے سے رو رہے ہیں۔ اے فرزندۂ پسندیدہ اور نورِ دیدہ! نہ رو کہ تمام آسمان و زمین کو تم نے رُلا دیا، اور مہر و ماہ اور مقربانِ درگاہ کو آہ و حسرت سے تیرہ و تاریک کر دیا۔ اے دختر گرامی! جمیع آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے اور عرشِ اعلیٰ و ساکنانِ عالم بالا تیرے رونے سے روئے اور تیری نالہ و زاری سے گریہ و فغاں میں آئے۔ اے فاطمہ! بخدا اُس وقت تک جمیع خلائقِ عالم پر بہشت حرام ہے جب تک کہ میں اُس میں داخل نہ ہو لوں اور میرے بعد اے دُختر، خوش خوش اور زیور و جامہ ہائے بہشت پہنے تُو داخلِ بہشت ہو گی۔ اے فاطمہ! نعمت ہائے بہشت تجھے مبارک ہوں، بخدا تو سب زنانِ بہشت سے بہتر ہے۔ اے بیٹی! بروزِ قیامت، جہنم ایسا خروش کرے گا کہ جمیع ملائکہ، مقربین اور تمام پیغمبر اُس کی دہشت سے بیہوش ہو جائیں گے۔ اُس وقت حق تعالیٰ جہنم کو حکم کرے گا کہ اے جہنم! تجھے میری عزت کی قسم ساکن ہو جا اور تھم جا کہ فاطمہ (علیہا السلام) بنت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جانبِ بہشت گذر جائے اور تیرا غبار و دھواں اُس کے دامنِ عزت تک نہ پہنچنے پائے۔ اے بیٹی! تُو اس طرح

بہشت میں داخل ہوگی کہ تیرے دائیں جانب حسن (علیہ السلام) اور بائیں جانب حسین (علیہ السلام) ہوں گے اور علمِ حمد علی (علیہ السلام) کے ہاتھ میں ہوگا۔'' [1]

روایت ہے کہ جب جناب فاطمہ علیہا السلام، حسنین علیہما السلام کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس حال میں دیکھا تو بیتاب ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مُنہ پر گر پڑیں اور بہت روئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے فاطمہ! نہ رو، صبر کر۔'' یہ سُن کر حضرت سیّدہ علیہا السلام اُٹھیں۔ اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چشم ہائے مبارک سے آنسو جاری تھے۔ تین مرتبہ فرمایا، ''خداوندا! یہ میرے اَہل بیت (علیہم السلام) ہیں اور میں ان کو تیرے اور ہر مومن کے سپرد کرتا ہوں۔'' [2]

شیخ مفیدؒ نے روایت کی ہے کہ جناب فاطمہ علیہا السلام، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمال پر نظر فرماتیں، روتیں، کچھ بیان کرتیں اور شعر کہتیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آوازِ جناب سیّدہ علیہا السلام سُنی تو آنکھیں کھول دیں۔ جناب سیّدہ علیہا السلام کو اپنے قریب بلایا اور کان میں کوئی راز کہا جسے سُن کر جناب سیّدہ فاطمہ علیہا السلام شاد ہو گئیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رِحلت کے بعد امیر المومنین علی علیہ السلام نے حضرت سیّدۃ نساء العالمین علیہا السلام سے پوچھا کہ وہ راز کیا تھا جسے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے کان میں کہا تو آپ کا غم خوشی میں بدل گیا اور قلق و اضطراب ختم ہو گیا؟ جناب سیّدہ فاطمہ علیہا السلام نے فرمایا کہ میرے پدر بزرگوار نے مجھے یہ خبر دی، ''میرے وصال کے بعد، میرے اَہل بیت (علیہم السلام) میں سے سب سے پہلے جو مجھ سے ملاقات کرے گا وہ تُو ہے اور تیری مدتِ حیات، میرے بعد بہت زیادہ نہیں ہوگی۔'' پس یہ سُن کر شدتِ اندوہ و غم میرا جاتا رہا کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ مدتِ مفارقتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیادہ نہ ہوگی۔ [3]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی یہ روایت یوں بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشتدادِ مرض کے وقت سیّدہ فاطمۃ الزہرہ علیہا السلام کو اپنے قریب بلایا۔ جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تشریف لائیں تو فرمایا ''مَرْحَبًا بِابْنَتِیْ'' (خوش آمدید میری بیٹی) اور اپنے پہلو میں بٹھایا۔ صحت کی حالت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت کریمہ تھی کہ جب حضرت فاطمہ علیہا السلام کو دیکھتے تو کھڑے ہو جاتے، متوجہ و مستقبل ہو کر اُن کا بوسہ

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۲۰ تا ۱۲۶

[2] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۳۷ بحوالہ: بشارت المصطفیٰ

[3] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۳۷، ۱۳۸

لیتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے لیکن اُس وقت جب وہ آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے کان میں کچھ فرمایا تو وہ رونے لگیں، اس کے بعد پھر کان میں کچھ کہا تو وہ خوش ہو کر ہنسنے لگیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے فاطمہ علیہا السلام سے کہا کہ میں نے کسی رونے والے کو ہنستا اور کسی غم کو خوشی کے ساتھ معاون و متصل نہیں دیکھا جیسا کہ آج دیکھا ہے۔ تو اس کا سبب کیا ہے؟ سیّدہ فاطمہ علیہا السلام نے فرمایا کہ یہ میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان راز کی بات ہے اس لئے میں اسے ظاہر نہیں کر سکتی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں، حضرت فاطمہ علیہا السلام نے اُس راز کو ظاہر نہیں فرمایا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دُنیا سے کوچ فرما گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد میں نے پھر اُن سے دریافت کیا کہ وہ بات کیا تھی؟ اُس وقت اُنہوں نے فرمایا کہ پہلی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میری اجل قریب آ گئی ہے۔ یہ سُن کر میں رونے لگی۔ دوسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری اہل بیت (علیہم السلام) میں سے سب سے پہلے تم مجھے ملو گی۔ اس پر میں ہنسنے لگی۔ پھر فرمایا کہ کیا تمہیں پسند نہیں کہ تم جنتی عورتوں کی سردار ہو۔ پہلی روایت دلالت کرتی ہے کہ خوشی و خندہ پہلے ملنے پر ہے اور نساء اہلِ جنّت میں افضلیت اُس پر زائد ہے۔ مشہور قول کے مطابق سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کی وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد اور بعض کے مطابق تین ماہ بعد ہے۔ [1]

ہزار ہا ابوابِ علم

ابنِ بابویہؒ و شیخ مفیدؒ و شیخ طوسیؒ و صفار شیخ طبرسیؒ اور ابنِ شہر آشوبؒ نے بسند ہائے متواترہ حضرت امیر المومنین، امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہم السلام و اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری مرض میں جناب علی علیہ السلام کسی ضروری کام کو تشریف لے گئے تھے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے یاور، میرے دوست اور میرے بھائی کو بلاؤ۔ پس حضرت فاطمہ علیہا السلام نے جناب علی علیہ السلام کو بلایا۔ جب علی علیہ السلام آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کو اپنے سینے سے لگایا اور اپنا دہن مبارک جناب علی علیہ السلام کے کان پر رکھ کر اپنا جامہ اُنہیں اوڑھایا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پسینہ اُن پر اور اُن کا پسینہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیر تک جناب علی علیہ السلام سے راز و نیاز فرماتے رہے۔ اکثر لوگ مکان کے پیچھے جمع تھے۔ حضرت ابوبکر و حضرت عمر بھی دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ جب علی علیہ السلام باہر آئے تو لوگوں نے پوچھا کہ کون سا راز تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ سے کہا؟ علی علیہ السلام نے فرمایا کہ ہزار

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ باب ۲ ص ۴۸۶

بابِ علم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تعلیم فرمائے اور ہر ایک باب سے ہزار باب کھلتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ (جب علی علیہ السلام باہر آئے تو) حضرت خضر علیہ السلام نے اُن کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی دہلیز پر دیکھا تو پوچھا کہ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ سے کوئی راز کہا ہے؟ علی علیہ السلام نے کہا کہ ہاں! علم کی ہزار قسمیں مجھے تعلیم فرمائی ہیں اور ہر قسم سے ہزار دوسری قسمیں نکلتی ہیں۔ [1]

اسی ضمن میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ جب جناب علی علیہ السلام حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کو اپنے لحاف میں چھپا کر اپنی آغوشِ مبارک میں لے لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جناب علی علیہ السلام سے راز کہہ رہے تھے یہاں تک کہ روحِ مقدس بدنِ اطہر سے مفارقت کر گئی۔ اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ حضرت علی علیہ السلام کے جسم پر تھا۔ [2]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ، حضرت صفیہ اور تمام ازواجِ مطہرات کو وصیّت کی اور پھر فرمایا، ''میرے بھائی علی (علیہ السلام) کو بلاؤ۔'' حضرت علی علیہ السلام آئے اور سرہانے بیٹھ گئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر مبارک کو اپنے زانو پر رکھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے علی (علیہ السلام) فلاں یہودی کے چند درہم میرے ذمے ہیں جو اُس سے لشکرِ اُسامہ کی تیاری کے لئے قرض لیے تھے۔ اُس قرض کو میری طرف سے تم اُتارنا اور فرمایا اے علی (علیہ السلام) تم اُن اشخاص میں پہلے ہو گے جو حوضِ کوثر پر مجھ سے ملیں گے اور میرے بعد بہت سی ناگوار باتیں تمہیں پیش آئیں گی مگر تم دِل تنگ نہ کرنا اور صبر کرنا اور جب تم دیکھو کہ لوگ دُنیا کو پسند کرتے ہیں تو تم آخرت کو اختیار کر لینا۔'' حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ سے گفتگو فرما رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لعابِ دہن مبارک مجھ پر پہنچ رہا تھا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال مُتغیّر ہو گیا۔ حاکم اور ابنِ سعد طریقِ مُتعدّدہ سے روایت کرتے ہیں کہ آخر وقت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سرِ مبارک حضرت علی علیہ السلام کے زانو پر تھا۔ [3]

ابن بابویہؒ نے بسند معتبر، امیر المومنین جناب علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وقتِ وفات ہُوا تو مجھے بلایا اور فرمایا، ''یا علی! تم میرے وصی اور میرے خلیفہ ہو، میری حیات اور

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۳۱

[2] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۳۱

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی)، مدارج النبوت، ج ۲ باب ۲ ص ۵۰۰ بحوالہ: حاکم و ابن سعد

میری وفات میں، میرے اہل بیت میں اور میری اُمت میں۔ تمہارا دوست میرا دوست اور میرا دوست خدا کا دوست، اور تمہارا دشمن میرا دشمن اور میرا دشمن خدا کا دشمن۔ یا علی! جو تمہارا منکرِ امامت میرے بعد میں ہے وہ منکرِ رِسالت میری حیات میں ہے۔ یا علی! تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ پس مجھے قریب بلایا اور ہزار بابِ علم مجھ پر کھول دیئے کہ ہر باب سے ہزار باب مفتوح ہوئے۔'' بروایتے، جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا کہ ہزار بابِ حلال وحرام اور جو کچھ اب تک گذرا اور جو کچھ تا قیامت گذرے گا مجھے تعلیم فرمائے کہ ہر باب سے ہزار باب مجھ پر مفتوح ہوئے (کھولے گئے)، یہاں تک کہ مرگ وبلاہائے مردم پر مطلع ہُوا اور حکم ہائے حق جو درمیان مردم ضروری ہیں اُن کو جان لیا۔[1]

سپردگی میراث

وقتِ آخر، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب امیر علیہ السلام سے فرمایا، ''یا علی (علیہ السلام)! تم میری میراث لوکہ یہ تم سے مخصوص ہے اور کسی کو اس میں نزاع نہیں ہے۔ میری وصیّت قبول کرو اور میرے وعدوں پر عمل کرو اور میرے قرض کو ادا کرو۔ یا علی (علیہ السلام)! تم میرے خلیفہ ہو میرے اہل بیت (علیہم السلام) میں سے ہو اور میرے بعد لوگوں پر میری رِسالت کی تبلیغ کرو۔'' جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ سرِ مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدتِ مرض سے میرے دامن میں کانپ رہا ہے تو میں بیتاب ہو گیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ کر حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روئے مبارک پر ٹپکے، میرا دل تڑپنے لگا اور میں حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کوئی جواب نہ دے سکا۔ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دوسری مرتبہ اِعادہ فرمایا اور پھر رِقّت نے مجھ پر جوش کیا اور میں نے بصدائے ضعیف میں کہا، ''ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے پدر و مادر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر فدا ہوں، میں نے قبول کیا۔'' حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''مجھے بٹھاؤ۔'' میں نے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بٹھایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پشت مبارک کو میرے سینے سے لگایا اور فرمایا، یا علی! تم ہی میرے وصی اور خلیفہ ہو میرے اہل بیت (علیہم السلام) اور میری اُمت میں۔ پھر بلال سے فرمایا، ''بلال! جاؤ اور میرا خود جسے ذوالجبیں کہتے ہیں اور میری زِرّہ جسے ذات العقول کہتے ہیں اور میرا جھنڈا جسے عقاب کہتے ہیں اور میری شمشیر جسے ذوالفقار کہتے ہیں اور میرا عمامہ جسے سحاب کہتے ہیں اور دوسرا عمامہ جسے اضحیہ کہتے ہیں اور میری چادر اور میرا ابرقہ اور میرا عصائے کوچک اور میری چھڑی جسے ممشوق کہتے ہیں لے آؤ۔'' حضرت عباس کہتے ہیں کہ میں نے وہ ابرقہ

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۳۱

پہلے نہ دیکھا تھا اور جب وہ قریب آیا تو یوں لگتا تھا کہ اُس کا نور آنکھوں کو خیرہ کر دے گا۔ تب حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ''یا علی! جبرائیل یہ جامہ میرے لئے لائے تھے۔ پھر دو جوڑی نعلینِ عربی کی طلب فرمائی اور وہ پیراہن جو شبِ معراج پہنا تھا اور وہ پیراہن جو بروزِ اُحد پہنا تھا اور وہ ٹوپی جو عید کے دن پہنتے تھے اور وہ ٹوپی جو پہن کر اصحاب میں رونق افروز ہوتے تھے، اور فرمایا، ''اے بلال! میرے دونوں خچر جن میں ایک کا نام شیبا اور دوسرے کا نام دُل دُل ہے لے آؤ اور میرے دو ناقے جن میں ایک کا نام غضبا اور دوسرے کا نام صہبا ہے اور میرے دو گھوڑے جن میں ایک کا نام جناح اور دوسرا حیزوم ہے، لے آؤ۔ جناح وہ گھوڑا تھا جو مسجد کے دروازے پر حاضر رہتا تھا اور حضرت جس کسی کو کہیں جانے کا حکم دیتے تھے وہ اُس پر سوار ہو کر جاتا تھا اور حیزوم وہ گھوڑا تھا جس پر بروز جنگِ اُحد سوار تھے اور جبرائیل کہتے تھے، ''چل اے حیزوم!'' اور اپنا دراز گوش طلب فرمایا جسے یعفور کہتے تھے۔ جب بلال نے اُن سب کو حاضر کیا تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عباسؓ کو بلایا اور فرمایا کہ علی (علیہ السلام) کی جگہ اب تم بیٹھو کہ میں اپنی پیٹھ کا تکیہ کروں اور مجھ سے فرمایا کہ یا علی! اُٹھو اور ان سب پر میری زندگی میں قبضہ کرو کہ یہ جماعتِ مردم جو اِس وقت یہاں حاضر ہیں، سب گواہ ہو جائیں اور میرے بعد کوئی تم سے نزاع نہ کر سکے۔'' امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا، ''میں اُٹھا حالانکہ (غم کی وجہ سے) میرے پاؤں میں چلنے کی طاقت نہ تھی۔ پس نہایت دِقّت سے وہ تبرکات لے کر اپنے گھر آیا اور جب پھر خدمت میں حاضر ہُوا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظرِ مبارک مجھ پر پڑی تو اپنے دستِ حق پرست سے انگشتری مبارک نکال کر میرے ہاتھ میں پہنا دی۔ اُس وقت گھر مسلمانوں اور بنی ہاشم سے بھرا ہُوا تھا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باوجود اُس ضعف کے کہ سرِ اقدس ہلانا دشوار تھا، سرِ مبارک کو دائیں بائیں حرکت دی اور بآوازِ بلند فرمایا (کہ سب نے سنا)، ''اے گروہ مسلمانان! علی (علیہ السلام) میرا بھائی ہے اور میرا وصی اور میرا خلیفہ میرے اہل بیت اور کرامت میں ہے۔ اور علی (علیہ السلام) میرا قرض ادا کرے گا اور میرے وعدوں کو وفا کرے گا۔ اے فرزندانِ ہاشم و فرزندانِ عبدالمطلب اور اے گروہ مسلمانان! علی (علیہ السلام) سے دشمنی نہ کرنا اور اس کے اَمر کی مخالفت نہ کرنا کہ گمراہ ہو جاؤ گے اور علی (علیہ السلام) پر حسد نہ کرنا اور اس کو چھوڑ کر دوسری طرف نہ جانا کہ کافر ہو جاؤ گے۔'' حضرت علی (علیہ السلام) کہتے ہیں، ''پھر مجھ سے فرمایا کہ مجھے لٹا دو اور لیٹتے ہی بلالؓ سے فرمایا کہ میرے دونوں فرزندان حسن (علیہ السلام) اور حسین (علیہ السلام) کو لے آؤ۔ جب حسن اور حسین (علیہما السلام) آ گئے تو حضرت

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں کو سینے سے لگایا اور بوستانِ رسالت کے دونوں پھولوں کو سونگھنے اور پیار کرنے لگے۔ میں نے اس خیال سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آرام میں خلل نہ ہو حسنین (علیہما السلام) کو الگ کرنا چاہا لیکن حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یا علی! رہنے دو کہ میں اِن کو سونگھوں اور یہ مجھے سونگھیں اور یہ اپنا توشہ میری ملاقات سے اور میں اپنا توشہ اِن کو دیکھنے سے حاصل کروں کیونکہ یہ دونوں میرے بعد عظیم مصیبتوں اور بلاؤں میں گھر جائیں گے اور خدا اُن پر لعنت کرے جو اِن پر ظلم وستم کرے۔ پھر فرمایا، ''خدایا! میں نے ان دونوں کو تیرے اور علی (علیہ السلام) کے سپرد کیا۔'' [1]

ملکُ الموت

ابنِ شہر آشوب نے حضرت ابنِ عباس (رضی اللہ عنہ) سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدتِ مرض سے حالتِ خواب میں تھے کہ ناگاہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ جناب سیّدہ فاطمہ زہرا علیہا السلام نے فرمایا کہ کون ہے؟ آواز آئی، ''میں ایک غریب شخص ہوں اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرنے آیا ہوں، کیا مجھے گھر میں داخل ہونے کی اجازت ہے؟'' جناب سیّدہ علیہا السلام نے فرمایا، ''خدا تجھ پر رَحمت کرے! چلا جا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیل ہیں اور تجھ سے بات نہ کرسکیں گے۔'' یہ سُن کر وہ شخص چلا گیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر آیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا، ''ایک غریب حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔'' اُس وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالتِ بیداری میں آئے، آنکھیں کھولیں اور جناب سیّدہ علیہا السلام سے فرمایا، ''اے فاطمہ (علیہا السلام)! کیا تم جانتی ہو کہ یہ شخص کون ہے؟'' جناب فاطمہ علیہا السلام نے فرمایا، ''اے پدرِ بزرگوار! میں نہیں جانتی۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''یہ جماعت کو مُنتشر کرنے والا اور لذتوں کو برطرف کرنے والا ہے، اے فاطمہ (علیہا السلام)! یہ ملکُ الموت ہے، اس نے مجھ سے پہلے کبھی کسی سے اجازت نہیں لی اور نہ ہی میرے بعد کسی سے لے گا۔ مجھے جو مقام اپنے پروردگار کے حضور حاصل ہے اُسی کی وجہ سے یہ اجازت مانگ رہا ہے۔ اے فاطمہ (علیہا السلام)! اسے اندر آنے کی اجازت دو۔'' جناب سیّدہ زہرا علیہا السلام نے فرمایا، ''خدا تم پر رَحمت کرے، گھر میں آجاؤ۔'' پس مثلِ نسیمِ تُند، ملکُ الموت گھر میں داخل ہوئے اور اہلِ بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلام بھیجا، کہا، ''اَلسَّلامُ عَلیٰ اَھْلِ بَیْتِ رسُوْلِ اللہ○'' [2]

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۲۸ تا ۱۳۱

[2] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۴۸

یوں بھی روایت ہے کہ وقتِ وفاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ایک شخص نے حاضرِ خدمت ہونے کی اجازت چاہی۔ جناب امیر المومنین علیہ السلام باہر تشریف لائے اور اُس سے پوچھا کہ کیا کام ہے؟ اُس شخص نے کہا کہ میں حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ جناب علی علیہ السلام، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اُس شخص کے لئے اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اُسے کہو کہ آجائے۔ جب وہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سرہانے بیٹھا تو عرض کی کہ یا پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں حق تعالیٰ کی طرف سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اُس شخص نے کہا کہ میں ملک ُالموت ہوں، مجھے خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اختیار دیا ہے کہ خواہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دُنیا میں تشریف رکھیں یا لِقائے پروردگار (اپنے پروردگار کا دیدار) قبول فرمائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبرائیل کو آنے دو تا کہ میں اُس سے مشورہ کرلوں۔ جب جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے تو عرض کی کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لئے دُنیا سے آخرت بہتر ہے کیونکہ حق تعالیٰ آخرت میں ایسے قرب و کرامت اور منزلت کے درجے اور شفاعت عطا فرمائے گا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بہت خوش ہوں گے۔ لِقائے دُنیا سے بہتر اور برتر لِقائے پروردگار ہے۔ یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملک ُالموت سے فرمایا کہ اُس کام کو بجالاؤ جس پر تم خدا کی طرف سے مامور و مقرر ہو۔ [1]

رِحلتِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اکثر علمائے خاصہ و عامہ، شیعہ و سنی کا کہنا ہے کہ سیّد الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وصال دوشنبہ (بروز پیر) کو ہُوا۔ بعض علمائے شیعہ کا بیان ہے کہ اُس دن ماہِ صفر کی اٹھائیس تاریخ تھی اور بعض علمائے اہلِ سنت ربیع الاوّل کی پہلی، کچھ دوسری، چند آٹھویں، کوئی دسویں اور کئی بارہویں تاریخ کہتے ہیں، محمد بن یعقوب کلینیؒ بھی اسی قول کے قائل ہیں۔ [2] حضرت ابنِ عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چالیس (۴۰) سال کی عمر میں وحی نازل ہوئی چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکّہ میں تیرہ (۱۳) اور مدینہ میں دس (۱۰) سال رہے پھر تریسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں وفات پائی۔ ایک جگہ کہا کہ پینسٹھ (۶۵) برس کی عمر میں وفات پائی۔ [3] حضرت

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۴۹ بحوالہ: کشف الغمہ
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۴۹۸

[2] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ص ۱۳۸ بحوالہ: کشف الغمہ

[3] ابوعیسیٰ محمد ترمذی (متوفی: ۲۷۹ ہجری، ترمذ) جامع ترمذی، ج ۲، حدیث ۳۳۹۷، ص ۵۲۲

انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تریسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں وفات پائی۔ [۱]
حضرت عائشہ سے بھی یہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تریسٹھ (۶۳) برس کی عمر میں وفات پائی۔ [۲]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غسل

شیخ مفیدؒ اور شیخ رضی الدینؒ نے بسندِ معتبر حضرت ابنِ عباس (رضی اللہ عنہ) سے روایت کی ہے کہ جب حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دارفنا سے عالم بقا کی طرف رِحلت فرمائی تو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غسل کی طرف متوجہ ہوئے، حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) حاضر تھے اور فضل بن عباس (رضی اللہ عنہ) جناب امیر علیہ السلام کی مدد کر رہے تھے۔ جب غسل سے فارغ ہوئے تو علی علیہ السلام نے کفن پہنایا اور حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روئے اقدس پر گر پڑے، چہرہ مبارک کے بوسے لئے اور آہِ حسرت سینہ پُر درد سے کھینچی۔ [۳]

''بصائر الدرجات'' میں منقول ہے کہ جس دن جناب امیر علیہ السلام نے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غسل دیا حق تعالیٰ نے اُن پر کئی راز مُنکشِف کیے۔ بسندِ معتبر، جناب صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ حق تعالیٰ نے جناب امیر علیہ السلام کی آنکھیں روشن کر دیں اور جبرائیل علیہ السلام اور ملائکہ اور رُوح جو کہ شبِ قدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتے تھے، اُن سب کو آپ منتہائے آسمان سے زمین تک دیکھ رہے تھے اور وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غسل اور نماز اور قبر تیار کرنے میں جناب امیر علیہ السلام کی اِعانت کر رہے تھے۔ [۴]

جناب امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غسل کی طرف متوجہ ہُوا تو ملائکہ میرے مُعین و مددگار تھے۔ اُس وقت گھر اور اطرافِ خانہ صدائے ملائکہ سے بھرا ہُوا تھا۔ ایک گروہِ ملائکہ آسمان کی طرف جاتا اور دوسرا نیچے آتا اور میں اُن کی آوازیں سنتا تھا، وہ سب حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دُرود بھیجتے تھے۔ [۵]

شیخ طوسیؒ، شیخ طبرسیؒ اور جمیع محدثین نے روایت کی ہے کہ بروز شوریٰ جناب امیر المومنین علیہ السلام

---

[۱] ابوعیسیٰ محمد ترمذی (متوفی: ۲۷۹ ہجری، ترمذ) جامع ترمذی، ج ۲ حدیث نمبر ۳۳۹۹، ص ۵۲۲
[۲] ابوعیسیٰ محمد ترمذی (متوفی: ۲۷۹ ہجری، ترمذ) جامع ترمذی، ج ۲ حدیث نمبر ۳۴۲۷، ص ۵۲۲
[۳] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۵۱
[۴] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۵۲ بحوالہ: بصائر الدرجات
[۵] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۵۴

نے منافقین پر حجّت تمام کی اور ارشاد فرمایا کہ کیا تم میں سوائے میرے کوئی ایسا ہے جس نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملائکہ مقربین کے ہمراہ غسل دیا ہو؟ وہ ملائکہ اپنے ہمراہ خوشبو اور گلہائے بہشت لائے تھے اور اعضائے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک جانب سے دوسری جانب پھیرتے تھے اور میں اُن کی باتیں سنتا تھا۔ سب نے یہ سُن کر کہا سوائے آپ کے کوئی ایسا نہیں۔ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام، حضرت امام حسن علیہ السلام سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے خود پڑھی پھر اصحاب کو اجازت دی۔ دس دس افراد اندر داخل ہوتے اور جنازے کے گرد کھڑے ہو جاتے۔ جناب امیر علیہ السلام اُن کے بیچ کھڑے ہو کر یہ آیت پڑھتے تھے: [2]

''اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۵۶'' (بے شک اللہ اور اُس کے فرشتے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر دُرود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر دُرود و سلام بھیجو جس طرح بھیجنے کا حق ہے۔)

سب لوگ یہی آیت مبارکہ پڑھتے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دُرود بھیجتے اور باہر چلے جاتے، یہاں تک کہ جمیع اہلِ مدینہ اور اطرافِ مدینہ نے دُرود بھیجا۔ طبرسیؒ نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ دس دس آدمی جاتے اور بغیر امام (یعنی بغیر پیش نماز) اِسی طرح نماز پڑھتے تھے۔ صبح سے رات اور رات سے اگلی صبح تک اور پھر رات تک، یہاں تک کہ مدینہ اور اطرافِ مدینہ سے تمام چھوٹے بڑے مردوں اور عورتوں نے اِسی طرح نماز پڑھی۔ اور کلینیؒ نے بسندِ معتبر امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتقال کیا تو جمیع ملائکہ، مہاجرین و انصار فوج در فوج آئے اور نماز پڑھی۔ [3]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جناب امیر المومنین علیہ السلام رسول اللہ

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۵۷

[2] سورۃ الاحزاب، آیت ۵۶

[3] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ص ۱۵۳

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غسل و کفن سے فارغ ہوئے تو مجھے، ابوذرؓ، مقدادؓ اور حضرت فاطمہ علیہا السلام اور حسنین علیہما السلام کو گھر لے گئے۔ آپ علیہ السلام آگے کھڑے ہوئے اور میں نے پیچھے صف باندھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز پڑھی۔ پس دس دس نفر کو داخلِ حُجرہ فرماتے اور لوگ دُرود بھیجتے اور باہر آتے، یہاں تک کہ مہاجرین و انصار بھی فارغ ہوئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز وہی تھی جو جناب امیر علیہ السلام نے بیان فرمائی تھی۔ [1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفن

طبرسیؒ نے معتبر سند سے روایت کی ہے کہ جب سب لوگ نماز سے فارغ ہوئے تو جناب امیر المومنین علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لحد میں داخل ہوئے اور فضل بن عباسؓ کو بھی قبر کے اندر لے گئے۔ راوی نے جناب امیر علیہ السلام سے پوچھا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جنازہ کس جگہ رکھا گیا تھا؟ فرمایا کہ قبر کی پائنتی رکھا اور وہاں سے داخلِ قبر کیا۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحلت فرمائی تو جبرائیل علیہ السلام اور ملائکہ اور رُوح جو کہ شبِ قدر میں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے تھے، سب غسل دینے اور نماز پڑھنے میں جناب علی علیہ السلام کی اِعانت کر رہے تھے اور قبر کھود رہے تھے، اور بخدا سوائے ملائکہ کے کسی اور نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبرِ اطہر نہیں کھودی یہاں تک کہ جناب علی علیہ السلام داخلِ قبر ہوئے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لحد میں اُتارا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر میں اینٹیں دیں اور قبرِ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سنگریزہ ہائے سرخ بھی بچھائے گئے۔ [2]

شیخ مفیدؒ، شیخ طوسیؒ، شیخ طبرسیؒ اور جمیع محدثین فریقین روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دُنیا سے رحلت فرمائی تو منافقین مہاجرین و انصار نے اہل بیت رسول (علیہم السلام) کو اُسی حال پر چھوڑ دیا اور اُن کی تعزیت کو آئے نہ متوجہ بہ تجہیز و تکفینِ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوئے۔ اسی وجہ سے اُن میں سے اکثر کو نماز جنازہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میسر نہ ہوئی۔ جناب امیر علیہ السلام نے بریدہ کو اُن کے پاس بھیجا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز پڑھنے حاضر ہوں مگر وہ نہ آئے یہاں تک کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دفن کر دیا گیا۔ اور جب صبح ہوئی تو جناب سیّدہ علیہا السلام نے فریاد کی کہ ''واسوء صباحاً'' یعنی اے روزِ بد آ کہ تیرا دن ہے۔ اور لوگوں نے غنیمت جانا کہ جناب امیر علیہ السلام تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہیں اور بنی ہاشم حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مصیبتِ جدائی میں بے

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۵۳ بحوالہ: کتاب احتجاج اور کتاب سلیم بن قیس

[2] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۵۲ تا ۱۵۴

قرار ہیں تو اُن سب نے آپس میں اتفاق کیا کہ حضرت ابوبکر کو خلیفہ کریں جیسا کہ اُنہوں نے حالتِ حیاتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مشورہ کیا تھا۔ انصار نے چاہا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ کریں تو وہ مہاجرین کی برابری نہ کر سکے اور مغلوب ہو گئے۔ پھر بَیعَت حضرت ابوبکر کی تمام ہوئی تو ایک شخص اُس وقت جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں آیا۔ علی علیہ السلام اُس وقت بیلچہ ہاتھ میں لئے ہوئے قبرِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو درست فرما رہے تھے۔ اُس نے کہا کہ لوگوں نے حضرت ابوبکر سے بَیعَت کر لی ہے تا کہ جب آپ فارغ ہو جائیں تو خلافت طلب نہ کر سکیں۔ یہ سُن کر آپ نے بیلچہ ہاتھ سے زمین پر رکھ دیا اور یہ آیات تلاوت کیں:

''الٓمّٓ ① اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ② وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ③ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ④''[1]

(الم۔ کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اس بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ یہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور اُن کا امتحان نہیں ہوگا۔ بیشک ہم نے ان سے پہلے والوں کا بھی امتحان لیا ہے اور اللہ تو بہر حال یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان میں کون لوگ سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں۔ کیا برائی کرنے والوں کا خیال یہ ہے کہ ہم سے آگے نکل جائیں گے یہ بہت غلط فیصلہ کر رہے ہیں۔)''[2]

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

❁

[1] سورۃ العنکبوت، آیت ۱ تا ۴

[2] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) جلاء العیون، ج ۱ ص ۱۵۶

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور بنو ہاشم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیّت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور تدفین میں مصروف تھے [1] کہ انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں ایک جلسہ مُنعَقِد کیا جس کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین مقرر کرنا تھا۔ [2] حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو یہ معلوم ہوا تو وہ فوراً ابو عبیدہ جراح، عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عثمان بن عفان کے ساتھ سقیفۂ بنی ساعدہ پہنچ گئے۔ وہاں کافی تنازعات و اختلافات اور بحث و مباحثہ کے بعد حضرت ابوبکر کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلیفہ نامزد کیا گیا اور کچھ ہی عرصہ قبل غدیر کے مقام پر حضرت علی علیہ السلام کے حق میں ہونے والے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلانِ خلافت اور علی علیہ السلام کے ہاتھ پر اُن سب کی بَیعَت کے اعلان کو یکسر بھلا دیا گیا۔ [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رِحلت کے بعد امام علی علیہ السلام سخت ترین مصائب و آلام میں گھِر گئے۔ سب سے پہلے ایک جماعت نے آپ علیہ السلام کے گھر پر حملہ کیا اور جبری بَیعَت لینے کی کوشش کی مگر آپ نے انکار کر دیا۔ [4] اس حملے میں بنتِ رسول حضرت فاطمہ علیہا السلام کی شان میں سخت گستاخی کی گئی۔ اُن کے گھر کے دروازے کو جلایا گیا اور پھر دروازے کو دھکا دیا گیا۔ دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑی ہونے کی وجہ سے وہ دیوار اور جلتے ہوئے دروازے کے درمیان دب کر شدید زخمی ہوگئیں، پسلی ٹوٹ گئی اور شکم اطہر میں موجود بچہ ساقط ہوگیا۔ حملہ آوروں میں سے ایک نے سیّدہ علیہا السلام کو نیام والی تلوار سے زدوکوب کیا۔ امام علی علیہ السلام نے اُس کا گریبان پکڑ لیا اور چاہا کہ قتل کر دیں لیکن معاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیّت یاد آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر صبر کی تاکید فرمائی تھی۔ پس آپ علیہ السلام نے فرمایا، ''میں اس کی قسم کھا کر

---

[1] شیخ مفیدؒ (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد)، ج ۱ ص ۱۸۶

[2] علامہ مجدد شیخ محمد رضا مظفر، (متوفی: ۱۳۸۳ ہجری، نجف اشرف) السقیفہ ۱۴۱۵، ص ۹۵ تا ۹۷

[3] ابنِ ابی الحدید (متوفی: ۱۲۵۸ء، بغداد) شرح نہج البلاغہ، ج ۶ ص ۸

[4] شیخ محمد بن حسن طوسی (متوفی: ۴۶۰ ہجری، نجف اشرف) تلخیص الشافی، ج ۳ ص ۷۶

علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) بحار الانوار، ج ۳ ص ۲۰۷

علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۴۲۸

ابوالحسن علی بن حسین مسعودی (متوفی: ۹۵۶ء، قاہرہ) مروج الذہب و معادن الجواہر (تاریخ المسعودی)، ج ۲ ص ۶۰

کہتا ہوں جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی بنا کر عزت بخشی، اگر اللہ نے مجھ سے پہلے ہی سے عہد نہ لے لیا ہوتا تو تم لوگ میرے گھر میں داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس پر حملہ آوروں نے حضرت علی علیہ السلام کے گلے میں رسی ڈال دی اور اُنھیں کھینچ کر باہر لے گئے۔ حضرت فاطمہ علیہا السلام نے مداخلت کی تو حملہ آوروں نے آپ علیہا السلام کو تازیانے سے پیٹا۔[1] بروایتے، اُنھوں نے امام علی علیہ السلام پر حملہ کیا اور آپ علیہ السلام کی چادر آپ کے گلو مبارک میں ڈال کر آپ کو گھسیٹا اور اسی حالت میں سقیفہ لے جا کر بَیعَت کا مطالبہ کیا۔ آپ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں خلافت کے لئے تم سے زیادہ اس کا اہل ہوں اس لئے تمہاری بَیعَت نہیں کروں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم میری بَیعَت کرو، اس لئے کہ تم نے انصار کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رشتہ دار بتا کر اُن سے خلافت لے لی اور اب ہم سے خلافت کو غصب کرنا چاہتے ہو۔[2]

جناب سیّدہ فاطمہ علیہا السلام اُن مظالم کی تاب نہ لاتے ہوئے کچھ عرصہ بعد شہید ہو گئیں اور امام علی علیہ السلام سیاسی اُمور سے دامن بچا کر علمی اور سماجی کاموں میں مشغول ہو گئے، مثلاً قرآن کی جمع آوری، فقرا کی خبر گیری، غربا پروری، زراعت و شجر کاری، نہروں کی کھدائی اور مساجد کی تعمیر وغیرہ۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) بحار الانوار، ج ۳ ص ۲۰۷
علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) مراۃ العقول فی شرح اخبار ال الرسول، ج ۵ ص ۳۲۰

[2] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۴۲۷
بحوالہ: ابنِ قتیبہ دینوری (متوفی: ۸۸۹ء، بغداد) الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۱۱-۲۸

سیّدۃ النساء العالمین (علیہا السلام) کی رِحلت

حضرت سیّدۃ النساء العالمین (علیہا السلام)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وِصال کے بعد پیش آنے والے اذیت ناک واقعات میں جسمانی اور روحانی طور پر مجروح ہونے اور کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد آخر کار سنہ ۱۱ ہجری کو اس دُنیا سے مُنہ موڑ گئیں۔[۱] بروایتے جب جناب سیّدہ علیہا السلام نے اپنا آخری وقت قریب محسوس کیا تو حضرت اُمّ ایمن اور حضرت اسماء بنتِ عمیس کو طلب کیا اور کہا کہ علی (علیہ السلام) کو خبر کرو۔ امیر المومنین (علیہ السلام) تشریف لائے تو آپ نے اپنے لیے تابوت بنوانے کی خواہش کی، چند اہم معاملات سے متعلق وصیّت کی اور فرمایا کہ جنھوں نے مجھ پر ظلم کیا اور میرا حق غَصب کیا اُن میں سے کسی کو میرے جنازے پر مت آنے دیجئے گا اور مجھے رات کے وقت دفن کیجئے گا۔[۲] بقولے، امیر المومنین علیہ السلام نے حضرت اسماء بنت عُمیس کی مدد سے آپ علیہا السلام کو غسل دیا[۳] اور خود ہی نماز جنازہ پڑھائی۔[۴] آپ علیہا السلام کے جنازے میں شریک ہونے والے افراد کی تعداد اور ناموں میں اختلاف ہے تاہم تاریخی مصادر میں امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام، عباس بن عبد المطلب، مقداد، سلمان، ابوذر، عمار یاسر، عقیل، زبیر، عبد اللہ بن مسعود اور فضل بن عباس (رضی اللہ عنہم) کے نام مشہور ہیں۔[۵] امیر المومنین علیہ السلام نے جناب سیّدہ کی قبر کو مخفی رکھنے کے لئے تدفین

---

[۱] شیخ محمد بن حسن طوسی (متوفی: ۴۶۰ ہجری، نجف اشرف)، مصباح المتہجد، ۱۴۱۱ھ، ص ۷۹۳

[۲] شیخ عباس قمی (متوفی: ۱۳۵۹ ہجری، نجف اشرف) منتہی الآمال فی تواریخ النبی والآل سیرت معصومین (علیہم السلام) مترجم سیّد صفدر حسین نجفی، ج ۱ ص ۱۷۴
شیخ صدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے) علل الشرایع، ج ۱ ص ۱۸۵
محمد بن علی ابنِ شہر آشوب (متوفی: ۵۸۸ ہجری، حلب) مناقب آلِ ابی طالب، ج ۳ ص ۱۳۷

[۳] ابوالحسن احمد بن یحییٰ بن جابر بن داؤد البلاذری (متوفی: ۹۹۲ء، بغداد) انساب الاشراف، ج ۲ ص ۳۴
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ الامم والملوک، ۱۴۰۳ھ، ج ۲ ص ۴۳۷ تا ۴۴۷

[۴] علی بن عیسیٰ اربلی (متوفی: ۶۹۲ تا ۶۹۳ ہجری، بغداد) کشف الغُمّۃ، ۱۴۲۱ھ، ج ۲ ص ۱۲۵

[۵] ابوصادق سُلیم بن قیس عامری ہلالی کوفی (متوفی: ۷۶ ہجری) کتاب سلیم بن قیس، ۱۴۲۰ھ، ص ۳۹۳
فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ، ۱۴۱۷ق، ج ۱، ص ۳۰۰
شیخ صدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے)، الخصال، ۱۴۰۳ھ، ص ۳۶۱
شیخ محمد بن حسن طوسی (متوفی: ۴۶۰ ہجری، نجف اشرف) اختیار معرفۃ الرجال، ۱۴۰۴ھ، ج ۱ ص ۳۳ تا ۳۴

کے بعد آثارِ قبر مٹا دیے۔ [1]

مصادر میں مندرجہ ذیل مقامات آپ علیہ السلام کے مقام دفن کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں:

۱) جناب سیّدہ علیہا السلام کا اپنا گھر جو بنی اُمیّہ کے زمانے میں مسجد نبوی کی توسیع کے دوران مسجد کا حصّہ بن گیا۔ [2]

۲) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روضہ مبارک کے اندر۔ [3]

۳) مسجد نبوی میں قبرِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور منبرِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان۔ [4]

۴) قبرستانِ جنت البقیع میں۔ [5]

۵) علی علیہ السلام کے بھائی حضرت عقیل بن ابی طالب کے گھر میں۔ [6]

بروایتے جنت البقیع کے قبرستان بقیع کے پہلو میں حضرت عقیل کا ایک بڑا سا گھر تھا۔ [7] جو حضرت فاطمہ بنت اسد (علیہا السلام)، عباس بن عبد المطلب (رضی اللہ عنہ) اور شیعوں کے آئمہ (علیہم السلام) کے دفن ہونے کے بعد زیارت گاہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ [8]

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسیؒ (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد)، ۱۴۰۳ق، ج ۴۳، ص ۱۹۳

[2] محمد بن یعقوب کلینی (متوفی: ۹۴۱ء، بغداد)، الکافی، ۱۳۶۳ش، ج ۱ ص ۴۶۱

شیخ مفید (متوفی: ۴۱۲ ہجری، کاظمین، عراق)، الاختصاص، ۱۴۱۴ق، ص ۱۸۵

شیخ صدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے)، من لا یحضرہ الفقیہ، ۱۴۰۴ق، ج ۱ ص ۲۲۹ و ج ۲ ص ۵۷۲

شیخ محمد بن حسن طوسی (متوفی: ۴۶۰ ہجری، نجف اشرف)، تہذیب الاحکام، ۱۴۰۷ق، ج ۶ ص ۹

عمر ابن شَبّہ نمیری (متوفی: ۸۷۷ء سامراء) تاریخ المدینہ المنورہ؛ اخبار المدینہ النبویہ، ۱۴۱۰ق، ج ۱ ص ۱۰۶ و ۱۰۷

[3] فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد)، اعلام الوریٰ، ۱۴۱۷ق، ج ۱، ص ۳۰۰

[4] شیخ صدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے)، من لا یحضرہ الفقیہ، ۱۴۰۴ق، ج ۲ ص ۵۷۲

شیخ محمد بن حسن طوسی (متوفی: ۴۶۰ ہجری، نجف اشرف)، تہذیب الاحکام، ۱۴۰۷ق، ج ۶ ص ۹

ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد)، امامی، دلائل الامامہ، ۱۴۱۳ق، ص ۱۳۶

محمد بن علی ابنِ شہر آشوب (متوفی: ۵۸۸ ہجری، حلب)، مناقب آل ابی طالب، ۱۳۷۶ق، ج ۳ ص ۱۳۹

[5] شیخ صدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے)، من لا یحضرہ الفقیہ، ۱۴۰۴ق، ج ۲ ص ۵۷۲

[6] عمر ابن شَبّہ نمیری (متوفی: ۸۷۷ء سامراء) تاریخ المدینۃ المنورہ، ۱۴۱۰ھ، ج ۱ ص ۱۰۵

[7] محمد بن عمر بن واقدی (متوفی: ۸۲۳ء، بغداد) طبقات الکبری، ۱۴۱۰ق، ج ۴ ص ۳۳

[8] علی بن احمد سمہودی (متوفی: ۱۵۰۶ء، مدینہ منورہ) وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ، ۱۹۷۱م، ج ۳ ص ۹۲ تا ۹۵

حضرت اُمّ البنین علیہا السلام سے شادی

حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کی شہادت کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بھائی عقیل سے جو نسب شناسی کے ماہر تھے، فرمایا کہ عرب کی کوئی ایسی خاتون تلاش کیجئے جو پہلوانوں کو جنم دے تا کہ اُس سے میرے لئے بہادر اور شجاع فرزند پیدا ہو۔ حضرت عقیل نے حضرت فاطمہ بنت حزام (حضرت اُمّ البنین علیہا السلام) کا نام تجویز کیا اور کہا کہ عربوں میں بنی کلاب کے مردوں جیسا کوئی دلیر مرد نہیں۔ اُن کے خاندان میں کئی عظیم پہلوان اور جنگجو تھے جن کی شہرت عرب میں زبان زدِ عام و خاص تھی۔ اُنہیں میں عامر بن مالک بن جعفر بن کلاب بھی گزرے ہیں جن کا لقب ''مُلاعب الاسنة'' تھا۔ اُن کے بارے میں زمانۂ جاہلیت کا شاعر اوس بن حجر کہتا ہے، ''یُلاَعِبُ اَطْرَافَ الْاَسِنَّةِ عَامِرٌ، فَرَاحَ لَهُ حَظُّ الْكَتَائِبِ اَجْمَعِ'' (عامر نیزے کی نوک کو مزاق سمجھتا تھا اور اکیلا ایک لشکر کے ساتھ مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔) مؤرخین کے مطابق بنی کلاب شجاعت و بہادری اور اخلاقی فضائل میں بہت مشہور تھے اور یہی خصوصیات دیکھ کر حضرت علی علیہ السلام حضرت فاطمہ بنت حزام سے ازدواج پر آمادہ ہوئے۔[1] حضرت فاطمہ کے والد کا نام حزام بن خالد[2] اور والدہ کا نام لیلی یا ثمامہ بنت سہیل بن عامر بن مالک تھا۔[3] امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت اُمّ البنین علیہا السلام حضرت فاطمہ علیہا السلام کے بعد امام علی علیہ السلام کی پہلی زوجہ تھیں۔[4] اور حضرت علی علیہ السلام سے پہلے آپ غیر شادی شدہ تھیں۔[5] شادی کے کچھ عرصہ بعد آپ نے حضرت علی علیہ السلام سے عرض کی کہ آپ کو ''فاطمہ'' نام سے نہ پکارا جائے تا کہ حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کا نام سُن کر اُن کے بچوں کو اپنی والدہ ماجدہ کی یاد نہ ستائے اور وہ غمزدہ نہ ہوں۔ چنانچہ اسی بنا پر امام علی علیہ السلام نے آپ کو ''اُمّ البنین'' (بیٹوں کی

---

[1] ابن عنبہ، عمدۃ الطّالب فی أنساب آل أبی طالب، ج۱، ص۳۵۷

مسعودی (متوفی: ۹۵۶ء، قاہرہ)، مروج الذہب و معادن الجواہر، ۱۳۷۴ش، ج۲، ص۶۷

[2] ابن عنبہ، عمدۃ الطّالب فی أنساب آل أبی طالب، ج۱، ص۳۵۷

مسعودی (متوفی: ۹۵۶ء، قاہرہ)، مروج الذہب و معادن الجواہر، ۱۳۷۴ش، ج۲، ص۶۷

[3] ابنِ عنبہ (متوفی ۸۲۸ ہجری، کرمان) عُمْدَةُ ألطّالِب فی أنْسابِ آلِ أبی طالب، ص۳۵۶

غفاری، تعلیقات بر منتقل الحسین، ص۱۷۴

[4] محمد ابراہیم کلباسی (متوفی: ۱۲۲۴ء، اصفہان)، الخصائص العباسیہ، ۱۳۸۷ش، ص۶۵

[5] علامہ الاوردبادی (متوفی: ۱۳۸۰ ہجری، نجف اشرف)، موسوعہ العلامہ الاوردبادی، ۱۴۳۶ق، ج۷، ص۴۷-۴۹

ماں) کا نام دیا۔[1]

حضرت اُمّ البنین حضرت عباس، حضرت عبداللہ، حضرت جعفر اور حضرت عثمان (علیہم السلام) کی والدہ تھیں۔ آپ کے یہ چاروں بیٹے عاشورا کے دن اپنے بھائی امام حسین علیہ السلام کی نصرت میں شہادت کے درجے پر فائز ہوئے۔[2] مؤرخین نے حضرت اُمّ البنین علیہا السلام کی شجاعت، فصاحت اور اہلِ بیت علیہم السلام کے ساتھ والہانہ محبت کی تعریف کی ہے۔ علما کے مطابق حضرت اُمّ البنین علیہا السلام نے خود کو خاندانِ رسالت کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا اور اسی بنا پر اہل بیت علیہم السلام بھی آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ بروایتے حضرت اُمّ البنین نے حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد کسی اور سے شادی نہیں کی۔[3]

حضرت عباس علیہ السلام کی ولادت

حضرت عباس علیہ السلام، امام علی علیہ السلام کے پانچویں اور حضرت اُمّ البنین علیہا السلام کے پہلے یعنی سب سے بڑے بیٹے تھے۔[4] حضرت عباس علیہ السلام کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔[5] یہ اختلاف امام علی علیہ السلام کی شہادت کے وقت حضرت عباس علیہ السلام کی عمر کی بنا پر ہے جو کہ بعض نے سولہ سال اور بعض نے اٹھارہ سال بیان کی ہے۔[6] جب کہ کچھ نے آپ کی عمر چودہ سال لکھی اور آپ کو نابالغ قرار دیا۔[7] مشہور قول کے مطابق آپ ۲۶ ہجری کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔[8] اردو بادی کے مطابق قدیم منابع میں آپ کی ولادت کے

---

[1] وکی شیعہ ڈاٹ نیٹ (ur.wikishia.net) بحوالہ: علی ربانی خلخالی، چہرہ درخشان قمر بنی ہاشم، ۱۳۷۶ش، ج۱ ص۶۹

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۳۱۰ھ، بغداد)، تاریخ الامم والملوک، ۱۳۸۷ق، ج۵، ص۱۵۳

[3] وکی شیعہ ڈاٹ نیٹ (ur.wikishia.net)، بحوالہ: بخاری، سرّ السلسلہ العلویۃ، ص۸۸

[4] سید محسن امین عاملی (متوفی: ۱۳۷۱ ہجری، دمشق) اعیان الشیعہ، ۱۴۰۶ق، ج۷، ص۴۲۹
شیخ عباس قمی (متوفی: ۱۳۵۹ ہجری، نجف اشرف) نفس المہموم، ۱۳۷۶ش، ص۲۸۵

[5] علامہ الاوردبادی (متوفی: ۱۳۸۰ ہجری، نجف اشرف) حیاۃ ابی الفضل العباس، ۱۴۳۶ق، ص۶۱
وکی شیعہ ڈاٹ نیٹ (ur.wikishia.net)، بحوالہ محمودی، ماہ بی غروب، ۱۳۷۹ش، ص۳۱

[6] وکی شیعہ ڈاٹ نیٹ (ur.wikishia.net) بحوالہ: محمودی، ماہ بی غروب، ۱۳۷۹ش، ص۳۱، ۵۰

[7] وکی شیعہ ڈاٹ نیٹ (ur.wikishia.net)، بحوالہ: الناصری، مولد العباس بن علی، ۱۳۷۲ش، ص۶۲
وکی شیعہ ڈاٹ نیٹ (ur.wikishia.net) بحوالہ: طعمہ، تاریخ مرقد الحسین والعباس، ۱۴۱۶ق، ص۲۴۲

[8] وکی شیعہ ڈاٹ نیٹ (ur.wikishia.net) بحوالہ: زجاجی کاشانی، سقای کربلا، ۱۳۷۹ش، ص۸۹-۹۰
سید محسن امین عاملی (متوفی: ۱۳۷۱ ہجری، دمشق) اعیان الشیعہ، ۱۴۰۶ق، ج۷ ص۴۲۹

مہینے اور دن کے بارے میں کچھ نہیں ملتا ہے۔ صرف تیرہویں صدی ہجری میں لکھی گئی کتاب ''انیس الشیعہ'' میں آپ کی ولادت ۴ شعبان بیان کی گئی ہے۔ [۱]

مروی ہے کہ حضرت عباس علیہ السلام کی ولادت کے بعد امام علی علیہ السلام نے اُنھیں اپنی گود میں لیا اور ''عباس'' نام دیا۔ پھر کانوں میں اذان اور اقامت پڑھی، بازوؤں کا بوسہ لیا اور رونے لگے۔ حضرت اُمّ البنین علیہا السلام نے رونے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ تمہارے بیٹے کے دونوں بازو حسین (علیہ السلام) کی نصرت میں تن سے جُدا ہوں گے اور اللہ تعالی اس کے کٹے ہوئے بازوؤں کے بدلے اسے آخرت میں دو پر عطا کرے گا۔ [۲] حضرت عباس علیہ السلام کے دونوں بازوؤں کے کاٹے جانے امام علی علیہ السلام کے گریہ کرنے کا ذکر دیگر روایات میں بھی ملتا ہے۔ [۳]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[۱] علامہ الاوردبادی (متوفی: ۱۳۸۰ ہجری، نجف اشرف)، حیاۃ ابی الفضل العباس، ۱۴۳۶ق، ص ۶۴

[۲] محمد ابراہیم کلباسی (متوفی: ۱۲۲۴ء، اصفہان)، خصائص العباسیہ، ۱۴۰۸ق، ص ۱۱۹-۱۲۰

[۳] وکی شیعہ ڈاٹ نیٹ (ur.wikishia.net)، بحوالہ: ناصری، مولد العباس بن علی، ۱۳۷۲ق، ص ۶۱-۶۲
محمد ابراہیم کلباسی (متوفی: ۱۲۲۴ء، اصفہان)، خصائص العباسیہ، ص ۱۱۹-۱۲۰
وکی شیعہ ڈاٹ نیٹ (ur.wikishia.net) بحوالہ: خلخالی، چہرہ درخشان قمر بنی ہاشم، ۱۳۷۸ش، ص ۱۴۰

خلافت ثلاثہ کا زمانہ

خلافت اوّل کی مدت تقریباً دو سال تھی۔ امام علی علیہ السلام اسلام اور اہلِ اسلام کی بھلائی کی خاطر اُمورِ خلافت میں ہر ممکن حد تک خلیفہ کی مدد اور راہنمائی کرتے تھے۔ اہلِ سنت علما لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر اہم معاملات میں امام علی علیہ السلام سے مشورہ لیا کرتے تھے۔[1] اور آپ علیہ السلام کے مشوروں پر عمل کر کے مستفید ہوتے تھے۔ چنانچہ یعقوبی لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کے دَور میں جن افراد سے فقہ لی جاتی تھی اُن میں ایک حضرت علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) تھے۔[2] لیکن اس کے باوجود امام علی علیہ السلام کو دیگر مسلمانوں کی طرح مدینہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔[3]

حضرت ابوبکر نے اپنے بعد حضرت عمر کو خلیفہ مقرر کرنے کی وَصِیَّت کی جسے حضرت عثمان نے تحریر کیا۔ اُس وَصِیَّت میں واضح طور پر لکھا تھا کہ میں عمر بن خطاب کو تمہارا حاکم مقرر کرتا ہوں لہٰذا ان کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو۔[4] امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے شجاعت کے ساتھ اس طولانی مدت میں نہایت اندوہ کے ساتھ اس پر صبر کیا۔[5] حضرت عمر کی خلافت کی مدت دس سال تھی۔ حضرت علی علیہ السلام نے ہمیشہ اپنے گراں قدر مشوروں سے اُن کی بھی مدد کی۔[6]

علمائے اہلِ سنت لکھتے ہیں کہ امام علی علیہ السلام کے مشورے کے بغیر حضرت عمر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ وہ حضرت علی علیہ السلام کی فہم و فراست، صداقت و دیانت داری اور پرہیز گاری کے قائل تھے۔[7] حضرت عمر خود کہا کرتے تھے کہ علی علیہ السلام ہم سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔[8] حضرت سعید بن

---

[1] رسول جعفریان (متولد: ۱۹۶۴، ایران) تاریخ سیاسی اسلام، ج ۱ ص ۳۰۶

[2] احمد بن ابی یعقوب ابنِ واضح الیعقوبی (متوفی: ۸۹۷ء، مصر)، تاریخ یعقوبی، ج ۲ ص ۱۳۸

[3] سید ہاشم رسولی محلّاتی (متوفی: ۱۳۹۸ء، تہران) زندگانی امیر المومنین علیہ السلام، ص ۲۵۳

[4] احمد بن ابی یعقوب ابنِ واضح الیعقوبی (متوفی: ۸۹۷ء، مصر)، تاریخ یعقوبی، ج ۲ ص ۳۷

[5] نہج البلاغہ، خطبہ شقشقیہ

[6] ابن حجر عسقلانی (متوفی: ۱۴۴۹ء، قاہرہ) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۱۳۲۸ق، ج ۲ ص ۵۰۹
حافظ ابنِ البر (متوفی: ۱۰۷۱ء، شاطبہ)، الاستیعاب، ۱۳۲۸ق، ج ۳ ص ۳۹

[7] رسول جعفریان (متولد: ۱۹۶۴، ایران) تاریخ سیاسی اسلام، ج ۱ ص ۳۰۶

[8] ابن حجر مکی (متوفی: ۹۷۴ ہجری، مکہ) الصواعق المحرقہ، ج ۲ ص ۳۷۱

مسیب سے روایت ہے کہ حضرت عمر کے سامنے جب کوئی مشکل مقدمہ پیش ہوتا اور حضرت علی علیہ السلام موجود نہ ہوتے تو وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کرتے تھے کہ مقدمے کا فیصلہ کہیں غلط نہ ہو جائے۔ [1] سعید بن مسیب سے یہ بھی مروی ہے کہ صحابہ میں سوائے حضرت علی علیہ السلام کے کوئی یہ کہنے والا نہیں تھا کہ جو کچھ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھ لو۔ [2] روایت ہے کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ کے سامنے حضرت علی علیہ السلام کا ذِکر ہُوا تو اُنھوں نے فرمایا کہ علی علیہ السلام سے زیادہ مسائلِ شرعیہ کا جاننے والا کوئی اور نہیں ہے۔ [3] حضرت ابنِ مسعود کا قول ہے کہ ہم کہا کرتے تھے کہ اہلِ مدینہ میں علی علیہ السلام ہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔ [4] ابو سعید خدری اور قتادہ انصاری کا بیان ہے کہ سب لوگوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والے حضرت علی علیہ السلام ہی ہیں۔ [5] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے علی علیہ السلام کے جس فیصلے پر نظر ڈالی اُس کی اصل و بنیاد سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود پائی۔ [6] یہی وجہ تھی کی خلفا کے عہد میں بھی پیچیدہ اُمور کی گتھیاں آپ علیہ السلام ہی سلجھایا کرتے تھے اور اکثر اہم عدالتی فیصلے بھی آپ ہی کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[1] جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، ص ۲۹۰ بحوالہ: تاریخ الخلفاء، علی بن ابی طالب، ص ۱۳۵

[2] جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، ص ۲۹۰ بحوالہ: اسد الغابہ، ۴/ ۱۰۹

[3] جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، ص ۲۸۹ بحوالہ: الریاض النضرۃ، ۲/ ۱۵۹

[4] حافظ ابنِ البر (متوفی: ۱۰۷۱ء، شاطبہ)، ج ۳ ص ۱۱۰۳

جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، ص ۲۹۰ بحوالہ: الریاض النضرۃ، ۲/ ۱۶۷

[5] ابن حجر عسقلانی (متوفی: ۱۴۴۹ء، قاہرہ) فتح الباری، ج ۸ ص ۱۶۷

[6] شیخ مفید (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد) الامالی شیخ مفید، ج ۱ ص ۲۸۶

حضرت علی علیہ السلام کے چند فیصلے اور علمی جوابات

شتر مرغ کے انڈے

احرام کی حالت میں شکار کی طرح صحرائی پرندوں کے انڈے اُٹھانا اور کھانا بھی حرام ہے۔ محمد ابن زبیر سے روایت ہے کہ میں نے دمشق میں ایک عمر رسیدہ شخص سے کہا کہ کوئی آنکھوں دیکھا واقعہ سناؤ۔ اُس نے بتایا کہ ہم ایک مرتبہ حج کے لئے گئے اور حالتِ احرام میں شتر مرغ کے کچھ انڈے اُٹھا کر کھا لیے۔ حضرت عمر کو معلوم ہوا تو وہ ہمیں حضرت علی علیہ السلام کے پاس لے گئے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ انھوں نے جتنے انڈے کھائے ہیں اتنی تعداد میں اُونٹنیوں پر اُونٹ چھوڑے جائیں اور جو بچے پیدا ہوں وہ کفارہ میں دیے جائیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ کچھ اُونٹنیاں حاملہ نہ ہوں۔ فرمایا کہ انڈے بھی تو گندے نکل آیا کرتے ہیں۔ [1]

دینار

دو آدمیوں نے کسی کے پاس امانت رکھوائی۔ ایک آدمی کا ایک دینار تھا اور دوسرے کے دو دینار تھے۔ اُن میں سے ایک دینار گم ہوگیا۔ یہ معاملہ امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا تو فرمایا کہ جس کے دو دینار تھے اُسے ڈیڑھ دینار دے دو اور جس کا ایک دینار تھا اُسے آدھا دینار دے دو کیونکہ گم شدہ دینار سے متعلق واضح نہیں کہ وہ کس کا تھا اس لئے اُس کا نقصان دونوں میں آدھا آدھا تقسیم ہوگا۔ [2]

امین ضامن نہیں ہوتا

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام غسل کے لئے حمام میں تشریف لے گئے اور کپڑے حمام کے مالک کے پاس رکھ دیے۔ غسل کر کے نکلے تو دیکھا کہ کپڑے غائب تھے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ امین ضامن نہیں یعنی جس کے پاس امانت رکھی جائے وہ نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ [3] چنانچہ حمام کے مالک سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔

---

[1] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۱۹۰، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان

[2] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۱۶۸، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان

[3] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۱۹۰، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان

فریب کار

دو آدمیوں نے ایک قرشیہ عورت کے پاس سو دینار امانت رکھی اور کہا کہ امانت واپس لینے بھی ہم دونوں اکھٹے آئیں گے اور اگر ہم میں سے کوئی ایک آئے تو امانت واپس مت دینا۔ ایک سال بعد اُن میں سے ایک شخص عورت کے پاس گیا اور کہا کہ میرا ساتھی انتقال کر گیا ہے اس لئے امانت مجھے لوٹا دو۔ عورت نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ اُس شخص نے عورت کے عزیز و اقارب سے سفارش کروائی اور دباؤ ڈالا تو آخر کار وہ مان گئی اور امانت واپس کر دی۔ ایک سال اور گزرنے کے بعد دوسرا آدمی بھی عورت کے پاس پہنچ گیا اور امانت کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ عورت نے کہا کہ تمہارا ساتھی امانت واپس لے جا چکا ہے اور اُس نے بتایا تھا کہ تم فوت ہو چکے ہو۔ اُس نے کہا کہ میں تمہارے سامنے موجود ہوں اور یہ طے ہوا تھا کہ امانت واپس لینے ہم دونوں اکھٹے آئیں گے اور اگر ہم میں سے کوئی ایک آئے تو تم امانت واپس نہیں کرو گی۔ پس معاملہ بڑھا تو دونوں تصفیہ کے لئے حضرت عمر کے پاس گئے۔ حضرت عمر نے فیصلہ عورت کے خلاف کیا اور اُسے ادائے امانت کا ذمہ دار قرار دیا تو اُس نے کہا کہ میرا مقدمہ حضرت علی علیہ السلام کے آگے پیش کیا جائے، وہ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔ پس وہ امیر المومنین علیہ السلام کے رُوبرو پیش ہوئے تو آپ علیہ السلام اُن آدمیوں کی چالاکی سمجھ گئے کہ اس طرح وہ اس عورت سے دوبار رقم ہتھیانا چاہتے تھے۔ پس آپ نے مدعی سے کہا کہ کیا تم نے یہ طے کیا تھا کہ تم دونوں آؤ گے تو امانت واپس کی جائے گی؟ اُس نے کہا کہ جی ہاں ایسا ہی طے ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تم اپنے ساتھی کو لاؤ اور اپنی امانت واپس لے جاؤ۔ اُس فریب کار نے جب دیکھا کہ اُس کے فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے تو وہ اپنے دعوے سے دستبردار ہو گیا۔ [1]

جو تم چاہو اُسے دے دینا

ایک شخص کو اُس کے دوست نے دس ہزار درہم دیے اور وَصِیَّت کی کہ جب میرا بیٹا بالغ ہو جائے تو ان میں سے جو تم چاہو اُسے دے دینا اور باقی خود رکھ لینا۔ چنانچہ جب مرحوم کا بیٹا بالغ ہوا تو اُس شخص نے اُسے ایک ہزار درہم دیے اور نو ہزار خود رکھ لئے۔ بچہ فریاد لے کر امیر المومنین علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

---

[1] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۱۹۱، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان

آپ نے اُس شخص کو بلا کر پوچھا کہ تم نے کتنے دینار خود رکھے اور کتنے اسے دیے؟ اُس نے کہا کہ نو ہزار خود رکھے اور ایک ہزار اسے دیے۔ فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نو ہزار تم چاہتے تھے اس لئے تم نے رکھ لئے اور باقی اسے دے دیے۔ وَصِیَّت کے مطابق جو تم چاہتے ہو وہ اسے دینا ہے اور باقی تم نے رکھنا ہے، پس نو ہزار اسے دو اور ایک ہزار خود رکھو۔ [1]

ہیجڑے کی میراث

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں چند شامی حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہمارا باپ کثیر مال چھوڑ کر دُنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔ ہم چند بھائی ہیں جن میں سے ایک کے اندر مردانہ اور زنانہ دونوں طرح کی علامات موجود ہیں، یعنی اُس کے جنسی اعضا مرد اور عورت دونوں کی مانند ہیں۔ ہم اُسے بہن قرار دیتے ہوئے بھائی کا نصف حصّہ دینا چاہتے ہیں لیکن وہ مُصر ہے کہ اُسے بھائیوں کی طرح پورا حصّہ دیا جائے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ اُسے کہو کہ پیشاب کرے۔ اگر پیشاب مردانہ عضو سے نکلے تو اُسے بھائیوں کے مطابق حصّہ دیا جائے اور اگر زنانہ عضو سے نکلے تو بہن کے مطابق حصّہ دیا جائے۔ چنانچہ جب اُس نے پیشاب کیا اور پیشاب مردانہ عضو سے خارج ہوا تو اُسے دیگر بھائیوں کی طرح نصف حصّہ دیا گیا۔ جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر پیشاب دونوں حصّوں سے نکلے تو جس سے پہلے خارج ہو اُس کے مطابق اُسے حصّہ دیا جائے اور اگر دونوں جگہ سے ایک ساتھ اخراج ہو تو اُسے نصف حصّہ مرد کی میراث کا اور نصف حصّہ عورت کی میراث کا ادا کیا جائے۔ [2]

دوسرا اور ایک دھڑ والے کی میراث

جناب امیر علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ اگر کسی کے دوسرا اور ایک دھڑ ہو تو وہ میراث میں سے ایک حصّہ پائے گا یا دو؟ فرمایا کہ جب وہ سو رہا ہو تو اُسے شور کر کے جگاؤ۔ اگر دونوں سر بیک وقت بیدار ہوں تو ایک حصّہ پائے گا اور اگر ایک سوتا رہے لیکن دوسرا جاگ جائے تو دو حصّے پائے گا۔ [3]

---

[1] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۱۹۴، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان
جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، ص ۲۹۳ بحوالہ: عشرہ مبشرہ، کتاب العقائد، ص ۴۵
علی ابنِ حسین ابنِ عبداللہ ابنِ عساکر دمشقی (متوفی: ۵۷۱ھ، دمشق) تاریخ ابن عساکر، ۴۲/ ۵۷۷

[2] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۰۷، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان
شیخ حر عاملی (متوفی: ۱۶۹۴ء، مشہد) مستدرک الوسائل، ج ۱۷ ص ۲۲۱

[3] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۰۷، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان

کم سے کم مدتِ حمل

حضرت عمر کے پاس ایک عورت لائی گئی جس نے نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ جنم دیا تھا۔ حضرت عمر نے اُسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ امیر المومنین علیہ السلام کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اس عورت کو غلط قرار دے کر سنگسار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ ایک بچے کی ماں کے پیٹ میں رہنے اور دُودھ پینے کی مدت تیس ماہ مقرر ہے، ''وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ (اس کا حمل اور دُودھ چھڑانا تیس مہینوں میں ہوا۔)[1] اور قرآن کی رُو سے دُودھ پلانے کی مدت دو سال یعنی چوبیس مہینے ہے، ''وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ'' (اور مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔)''[2] پس، جب تیس مہینوں سے دُودھ پلانے کی مدت چوبیس ماہ منہا کی جائے تو باقی چھ ماہ بچتے ہیں جو حمل کی کم سے کم مدت ہے۔[3]

ایک مرحوم بوڑھے کا بچہ

روایت ہے کہ ایک ضعیف آدمی نے ایک جوان عورت سے عقد کیا جو مقاربت کے بعد انتقال کر گیا۔ عورت نے نو ماہ بعد ایک بچے کو جنم دیا۔ بچہ کچھ بڑا ہوا اور اُس کے باپ کے ترکے کی تقسیم کا وقت آیا تو اُس کے سوتیلے بھائی حسد میں مبتلا ہو گئے اور حضرت عمر کے پاس چند گواہ پیش کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ یہ بچہ اُن کے باپ کا نہیں بلکہ اپنی ماں کی غلط کاری کا نتیجہ ہے۔ حضرت عمر نے عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیا۔ اُس عورت نے یہ حکم سُنا تو حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کی اور ضعیف آدمی کے ساتھ اپنے عقد اور ازدواجی تعلق کا واقعہ بیان کیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ عورت ہر چیز واضح طور پر بیان کر رہی ہے لہٰذا اسے سزا دینے میں جلدی نہ کی جائے۔ پھر آپ نے اُس کے بیٹے کو بلایا اور اُس کے ہم عمر بچوں کو جمع کیا اور اُسے کہا کہ ان کے ساتھ مل کر کھیلو کودو۔ جب سب بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے تو آپ نے اچانک حکم دیا کہ سب بچے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔ بچے بیٹھ گئے تو آپ نے پھر حکم دیا سب بچے کھڑے ہو جائیں۔ تمام بچے فوراً کھڑے ہو گئے لیکن وہ لڑکا اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر آہستہ

---

[1] سورۃ الاحقاف، آیت: ۱۵

[2] سورۃ البقرہ، آیت: ۲۳۲

[3] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۲۵، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان

آہستہ کھڑا ہُوا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بچہ اپنے مرحوم بوڑھے باپ ہی کا ہے لہٰذا اسے اس کے باپ کے ترکے میں سے حصّہ دیا جائے اور اُس کے بھائیوں کو بہتان لگانے پر سزا دی جائے۔ حضرت عمر نے امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ نے یہ فیصلہ کس بنیاد پر کیا ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا ہاتھ ٹیک کر اُٹھنا اس کا ایک ناتواں اور ضعیف شخص کی اولاد ہونا ثابت کرتا ہے۔ جناب امیر المومنین علیہ السلام نے یہ عمل وہاں موجود لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے کیا تھا ورنہ اس اَمر کی وضاحت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول ہی کافی تھا کہ بچہ اُسی کا ہوگا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوگا۔ [1]

کس کا بیٹا کس کی بیٹی

روایت ہے کہ قاضی شریح کے پاس دو عورتیں نومولود بچے اور بچی کے ساتھ پیش کی گئیں۔ دونوں عورتوں میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا بیٹا اُس کا اور بیٹی دوسری عورت کی ہے۔ قاضی شریح کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو مقدمہ امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے زمین سے ایک تنکا اُٹھا کر فرمایا کہ اس کا فیصلہ کرنا تو اس تنکے کے اُٹھانے سے بھی آسان تر ہے۔ پس آپ نے دونوں عورتوں سے کہا کہ الگ الگ پیالوں میں اپنا اپنا دُودھ نکال کر لاؤ۔ دونوں نے دُودھ کے پیالے پیش کئے تو آپ نے اُن کا وزن کیا۔ جس کے دُودھ کا وزن زیادہ تھا آپ علیہ السلام نے لڑکا اُس کے حوالے کر دیا اور فرمایا کہ جس طرح عورت کی میراث، دِیَت اور شہادت مرد کے مقابلے کمتر ہوتی ہے اسی طرح لڑکی کا دُودھ بھی لڑکے کے دُودھ سے ہلکا ہوتا ہے۔ [2]

جرم ایک سزائیں مختلف

روایت ہے کہ حضرت عمر کے سامنے پانچ آدمی پیش کئے گئے جنہوں نے زنا کا اِرتکاب کیا تھا۔ حضرت عمر نے اُن سب پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام بھی وہاں موجود تھے، فرمایا کہ ان کی سزا یکساں نہیں ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ پھر آپ ہی ان کی سزا تجویز فرمائیں۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ ان میں سے ایک کو قتل کیا جائے، دوسرے کو سنگسار، تیسرے کو سو کوڑے مارے جائیں، چوتھے کو پچاس کوڑے اور پانچویں کو تعزیر کر کے چھوڑ دیا جائے۔ یہ سزا سن کر

---

[1] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۲۵، وسائل الشیعہ، ج ۲۱ ص ۱۶۹

[2] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۲۶، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان

حضرت عمر اور وہاں موجود سبھی لوگ متعجب ہو گئے۔ حضرت عمر نے مختلف سزاؤں کی وجہ دریافت کی تو امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا، ''پہلا شخص کافر ذِمّی ہے۔ (ذِمّی: وہ مشرک یا اہل کتاب جو اسلامی حکومت کی امان میں رہتا ہو اور اُس نے شرائط ذِمّہ (جزیہ) کو قبول کر لیا ہو، یعنی جزیہ گزار ہو۔) ذِمّی نے ایک مسلمان عورت کو بے آبرو کیا جس کی وجہ سے وہ ذِمّی نہیں رہا لہٰذا اُسے قتل کیا جائے گا۔ دوسرا شخص بیوی رکھتا ہے (شادی شدہ ہے) اس لئے اُسے سنگسار کیا جائے گا۔ تیسرا شخص بیوی نہیں رکھتا (غیر شادی شدہ ہے) اس لئے اُسے سو کوڑے مارے جائیں گے، چوتھا شخص غلام ہے اس لئے اُس کی سزا نصف ہوگی یعنی پچاس کوڑے اور پانچواں چونکہ مخبوط الحواس ہے اس لئے اُسے تعزیر کر کے چھوڑ دیا جائے۔ [1]

امیر المومنین امام علی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ زنا کے قریب نہ جاؤ کہ یہ سراسر بے حیائی اور بدچلنی ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ کسی مرد یا عورت کو اُس وقت تک سنگسار نہیں کیا جائے گا جب تک کہ چار گواہ وقوعِ فعل کی عینی شہادت نہ دیں۔ اگر گواہ موجود نہ ہوں اور فعل کا ارتکاب کرنے والا خود چار مرتبہ اقرار کرے تو اس صورت میں اُسے کوڑوں یا رَجم کی سزا دی جائے گی۔ اقرارِ جرم سے متعلق فرمایا کہ جو شخص کسی فعلِ قبیح کا مرتکب ہو تو وہ اس معاملے میں جو اُس کے اور اللہ کے مابین ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے، خدا کی قسم اللہ کی بارگاہ میں در پردہ توبہ کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ رسوائی مول لے اور اپنا پردہ چاک کرے۔ اور فرمایا کہ جو عورت مجبور اور بے بس کر دی گئی ہو اور مجبوری کا اظہار کرے تو اُس پر حد نہیں ہے، اور جو شخص کسی عورت کو بے دست و پا کر کے اُسے بے آبرو کرے تو اُس شخص کو قتل کیا جائے گا۔ اور فرمایا کہ حالتِ دیوانگی یعنی پاگل پن اور مخبوط الحواسی میں زنا کا ارتکاب کرنے والے پر حد جاری ہوگی نہ اُسے سنگسار کیا جائے گا کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دیوانہ مرفوع القلم ہے یہاں تک کہ دیوانگی زائل ہو۔ [2]

گالی پر تعزیر

اگر کوئی شخص کسی سے بدزبانی کرے اور اُسے گدھا، خنزیر، فاسق، فاجر، خبیث جیسے الفاظ کہے تو اُسے تعزیر کی جائے گی چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا، ''فَفِیْ هٰذَا كُلِّهِ الْاَدَبُ وَ لَا یَبْلُغُ بِهِ الْحَدَّ○'' یعنی ایسے الفاظ پر تعزیر کی جائے گی جو حد کی سزا سے کم ہوگی۔ [3]

---

[1] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۵۱، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان

[2] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۴۶ تا ۲۵۳

[3] مفتی جعفر حسین، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۵۷ بحوالہ: مستدرک الوسائل، ج ۱۸ ص ۱۰۳

بچے کا کیا قصور ہے؟

روایت ہے کہ حضرت عمر نے ایک حاملہ عورت کو زنا کے ارتکاب پر سنگسار کرنے کی سزا سنائی۔ امیر المومنین علیہ السلام کو معلوم ہُوا تو فرمایا کہ عورت تو سزا کی مستحق ہے مگر اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے اُس کا کیا قصور ہے؟ پس انتظار کرو اور بچے کی ولادت کے بعد سزا پر عمل درآمد کرنا۔[1] حضرت عمر نے اپنے فیصلے سے رُجوع کر لیا اور کہا، "لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ" یعنی اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔[2]

لاعلمی میں گناہ کا اِرتکاب

منقول ہے کہ ایک نومسلم شرابی کو حضرت ابوبکر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس نے شراب نوشی کا اقرار کر لیا لیکن یہ کہا کہ مجھے علم نہیں تھا کہ اسلام میں شراب کو حرام قرار دیا جا چکا ہے۔ حضرت ابوبکر نے اُس کا معاملہ حضرت عمر کے سامنے پیش کیا تو اُنھوں نے کہا کہ اس مسئلہ کو علی (علیہ السلام) ہی حل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں اصحاب اُس شخص کو لے کر حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ اسے مہاجرین وانصار کے پاس لے جاؤ اور اُن سے پوچھو کہ کیا کسی نے تحریمِ خمر کی آیت اس کے سامنے پڑھی ہے؟ اگر کسی نے پڑھی ہے تو یہ سزاوار ہے اور اگر نہیں پڑھی تو یہ قابلِ مواخذہ نہیں ہے۔ جب مہاجرین وانصار سے معلوم کیا گیا تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ آیتِ تحریمِ خمر اس کے رُوبرو پڑھی تھی۔ چنانچہ اُسے چھوڑ دیا گیا۔[3]

غلام کون؟

یمن کے ایک شخص نے اپنے بیٹے کو ایک طویل سفر پر بھیجا تو اُس کے ساتھ ایک غلام بھی روانہ کیا۔ راستے میں کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ لڑکے نے غلام کو مارا اور غلام نے اُسے گالیاں دیں۔ کوفہ پہنچ کر غلام نے دعویٰ کیا کہ یہ لڑکا میرا غلام ہے اور میں اسے بیچنا چاہتا ہوں۔ لڑکے نے کہا کہ یہ جھوٹ بولتا

---

[1] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۵۱، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان

[2] جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، ص ۲۹۱ بحوالہ: ابنِ البر (متوفی: ۱۰۷۱ء، شاطبہ) استیعاب، ۳/۲۰۶

[3] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۶۰، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان

ہے، یہ میرا غلام ہے اور میں اس کا آقا ہوں۔ دونوں میں تکرار بڑھی تو مقدمہ حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہُوا۔ آپ نے اپنے خادم قنبر سے فرمایا کہ کمرے کی دیوار میں دو بڑے سوراخ بناؤ اور ان دونوں سے کہو کہ اپنے اپنے سر ان سوراخوں سے باہر نکالیں۔ جب دونوں نے اپنے سر سوراخوں سے باہر نکال لئے تو آپ علیہ السلام نے قنبر سے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار لے آؤ۔ قنبر تلوار لایا تو آپ نے کہا، ''غلام کا سر کاٹ ڈالو۔'' یہ سنتے ہی غلام نے فوراً اپنا سر پیچھے کر لیا جبکہ لڑکا اُسی طرح کھڑا رہا۔ یوں آپ کی حکمتِ عملی سے معلوم ہو گیا کہ اُن دونوں میں غلام کون تھا اور آقا کون۔ [1]

حقیقی ماں

سہل بن سعد سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ دو عورتیں ایک بچے سے متعلق جھگڑا کرتی ہوئی حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اُن میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ وہ بچہ اُس کا ہے۔ آپ علیہ السلام نے اُن کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ برابر تکرار اور ہنگامہ آرائی کرتی رہیں۔ آپ علیہ السلام نے بظاہر زچ ہوتے ہوئے حکم دیا کہ آرا لایا جائے۔ اُنھوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ آپ آرا کیوں منگوا رہے ہیں؟ فرمایا کہ اس بچے کے دو ٹکڑے کر کے تم دونوں کو آدھا آدھا دے دوں گا۔ بچے کی حقیقی ماں تڑپ کر کہنے لگی یا امیر المومنین! یہ بچہ مجھے نہیں چاہیے، آپ اسے دو ٹکڑے نہ کیجئے اور اس عورت کو دے دیجئے۔ دوسری عورت خاموش کھڑی رہی۔ امیر المومنین علیہ السلام نے بچہ پہلی عورت کو دے دیا جو اُس کی حقیقی ماں تھی۔ [2]

جھوٹے گواہ

ایک مرتبہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس ایک شخص کو چوری کے جھوٹے الزام میں لایا گیا۔ اُس کے ساتھ دو گواہ بھی موجود تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کسی اور کام کی طرف متوجہ ہو گئے اور فرمایا کہ جب میرے پاس جھوٹا گواہ آتا ہے تو میں اُسے سخت سزا دیتا ہوں۔ کچھ دیر بعد آپ نے اُن دونوں گواہوں کو طلب کیا تو معلوم ہُوا کہ وہ فرار ہو چکے ہیں۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے ملزم کو بَری کر دیا۔ [3]

---

[1] جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، ص ۲۹۳ بحوالہ: عشرہ مبشرہ

[2] جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، ص ۲۹۳ بحوالہ: عشرہ مبشرہ

[3] ابن ابی شیبہ (متوفی: ۸۴۹ء، کوفہ) مصنف ابی شیبہ، ۱۴/ ۵۴۸، رقم: ۲۹۴۲۶

سترہ (17) اُونٹ

ایک مرتبہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس تین آدمی آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے پاس سترہ (17) اُونٹ ہیں، ہم میں سے ایک کا حصّہ کل اُونٹوں کا آدھا (1/2)، دوسرے کا حصّہ ایک تہائی (1/3) اور تیسرے کا نواں (1/9) ہے۔ آپ ہمارے درمیان یہ اُونٹ اس طرح تقسیم کر دیجئے کہ انہیں کاٹنا نہ پڑے۔ حضرت علی علیہ السلام نے بیت المال سے ایک (1) اُونٹ منگوا کر اُن سترہ (17) اُونٹوں میں شامل کر دیا، اب وہ اٹھارہ (18) ہو گئے۔ پہلا شخص جس کا حصّہ تمام اونٹوں میں آدھا (1/2) تھا اُسے آدھے یعنی نو (9) اُونٹ دے دیئے، دوسرا شخص جس کا حصّہ ایک تہائی (1/3) تھا اُسے اٹھارہ (18) کا ایک تہائی (1/3) یعنی چھ (6) اُونٹ دے دیئے، پھر تیسرا شخص جس کا حصّہ تمام اُونٹوں میں نواں (1/9) تھا اسے اُونٹوں کا نواں (1/9) حصّہ یعنی اٹھارہ (18) میں سے دو (2) اُونٹ دے دیئے۔ ایک (1) اُونٹ باقی بچا جسے آپ نے بیت المال میں واپس بھیج دیا۔ [1]

آٹھ (8) روٹیاں

دو شخص کھانا کھانے کے لئے بیٹھے تھے۔ ایک کے پاس پانچ (5) روٹیاں جبکہ دوسرے کے پاس تین (3) روٹیاں تھیں۔ ایک شخص اُدھر سے گزرا تو اُنھوں نے اُس کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شامل کر لیا اور تینوں نے وہ آٹھ (8) روٹیاں مل کر کھالیں۔ تیسرے شخص نے جاتے ہوئے اُنھیں آٹھ (8) درہم دیئے اور کہا کہ میں نے تمہارے ساتھ جو کھانا کھایا ہے یہ اُس کی قیمت ہے، تم اسے آپس میں بانٹ لو۔ رقم کی تقسیم پر اُن دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ پانچ (5) روٹیوں والے شخص نے کہا کہ میں پانچ (5) درہم لوں گا کیونکہ میری پانچ (5) روٹیاں تھیں اور تم تین (3) درہم لو کیونکہ تمہاری تین (3) روٹیاں تھیں۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں! رقم آدھی آدھی تقسیم ہو گی۔ دونوں کے درمیان جھگڑا بڑھا تو وہ اپنا معاملہ لے کر حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے (مشورہ دیتے ہوئے) تین (3) روٹیوں والے شخص سے فرمایا کہ تمہارا ساتھی تمہیں جو کچھ دے رہا ہے وہ قبول کر لو، اس میں تمہارا فائدہ ہے کیونکہ اس کی روٹیاں زیادہ اور تمہاری کم تھیں۔ وہ کہنے لگا کہ نہیں، میں تو صرف منصفانہ فیصلہ ہی قبول کروں گا۔ آپ علیہ السلام نے

---

[1] جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، ص ۲۹۴ بحوالہ: عشرہ مبشرہ

فرمایا کہ انصاف تو یہ ہے کہ تم ایک (1) درہم لو اور تمہارا ساتھی سات (7) درہم لے۔ اُس نے حیرت سے کہا کہ میرے ساتھی نے تو مجھے تین (3) درہم دینے چاہے لیکن میں راضی نہیں ہوا، آپ نے بھی مشورہ دیا تھا مگر میں نے قبول نہیں کیا اور اب آپ یہ فرما رہے ہیں کہ انصاف کے مطابق میرا حق ایک (1) درہم بنتا ہے تو آپ مجھے سمجھائیے کہ ایک (1) درہم کیسے؟ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ آٹھ (8) روٹیوں کے چوبیس (24) حصّے تم تین (3) آدمیوں نے کھائے۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ کس نے کم کھایا اور کس نے زیادہ؟ اس لئے یہ سمجھ لو کہ سب نے برابر برابر کھایا ہے (یعنی ہر ایک نے آٹھ (8) حصّے کھائے) تم نے اپنی تین (3) روٹیوں کے نو (9) میں سے آٹھ (8) حصّے کھائے، تمہارا ایک (1) حصّہ باقی بچا، اور تمہارے ساتھی نے اپنی پانچ (5) روٹیوں کے پندرہ (15) حصّوں میں سے آٹھ (8) حصّے کھائے اور اُس کے ساتھ (7) حصّے باقی بچے۔ اس طرح تیسرے شخص نے تمہاری روٹیوں میں سے ایک (1) حصّہ کھایا اور تمہارے ساتھی کے سات (7) حصّے کھائے، چنانچہ انصاف کے مطابق تم کو ایک (1) درہم اور تمہارے ساتھی کو سات (7) درہم ملیں گے۔ پس، اُس جھگڑالو کو صرف ایک (1) درہم ہی لینا پڑا۔ [1]

ایک دفعہ تو مجھے قتل کیا جا چکا ہے، دوبارہ کیوں؟

روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ مقتول کے بھائی نے حضرت عمر سے قصاص کا حکم لے کر قاتل پر تلوار چلائی اور اپنی دانست میں اُسے قتل کر دیا۔ قتل ہونے والے کے لواحقین اُسے اُٹھا کر گھر لائے تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی مرا نہیں اور اُس میں کچھ جان باقی ہے۔ اُس کا علاج معالجہ ہُوا اور وہ تندرست ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد قصاص لینے والے نے اُسے زندہ دیکھا تو پکڑ کر دوبارہ حضرت عمر کے پاس لے گیا۔ اُنھوں نے پھر اُسے قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اُس شخص نے شور مچایا کہ ایک دفعہ تو مجھے قتل کیا جا چکا ہے، دوبارہ کیوں؟ مگر اُس کی ایک نہ سنی گئی۔ اُسے قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام کا وہاں سے گزر ہُوا۔ آپ کو اُس شخص کی رُوداد معلوم ہوئی تو اُسے لے کر حضرت عمر کے پاس گئے اور فرمایا کہ اب اس کا قتل ناروا ہے کیونکہ ایک شخص کو دو مرتبہ قتل نہیں کیا جا سکتا۔ (یعنی ایک جرم کی پاداش میں

---

[1] جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، ص ۲۹۶ تا ۲۹۸ بحوالہ:
ابن حجر مکی (متوفی: ۹۷۴ ہجری، مکہ) الصواعق المحرقہ، ص ۱۲۹
حافظ ابنِ البر (متوفی: ۱۰۷۱ء، شاطبہ) استیعاب، ۳/ ۲۰۷

دو مرتبہ سزا نہیں دی جا سکتی۔) مقتول کے بھائی نے کہا کہ میں اسے قتل نہ کروں تو میرے بھائی کا خون رائیگاں جائے گا۔ فرمایا کہ تم اس پر تلوار چلا چکے ہو۔ اب تم اسی صورت میں اسے قتل کر سکتے ہو کہ جب یہ تمہارے وار کے بدلے تم پر تلوار چلائے۔ اگر تم زندہ بچ گئے تو پھر اسے قتل کر دینا۔ پس اُس شخص نے کہا کہ نہیں، میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا اور اُس کے قتل سے دستبردار ہو گیا۔ [1]

یہودی کے سوالات

امیر المومنین علیہ السلام سے ایک یہودی نے سوال کیا کہ وہ کیا چیز ہے جو اللہ کے لئے نہیں؟ اور وہ کیا چیز ہے جو اللہ کے ہاں نہیں ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جس کا اللہ کو علم نہیں ہے؟

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ چیز جو اللہ کے لئے نہیں ہے وہ ''شرک'' ہے، یعنی اُس کا کوئی شریک نہیں۔ جو چیز اللہ کے ہاں نہیں ہے وہ ''ظلم'' ہے، یعنی اللہ ظالم نہیں ہے۔ اور وہ چیز جس کا اللہ کو علم نہیں ہے وہ تمہارا یہ قول ہے کہ ''عزیز علیہ السلام'' اللہ کا بیٹا ہے۔ اللہ نہیں جانتا کہ اُس کا کوئی بیٹا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے، ''قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ'' (آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو اُسے معلوم نہیں۔ سورۃ یونس، آیت: ۱۸) [2]

عبادت بھی گناہ اور ترکِ عبادت بھی گناہ

امام علی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی عبادت ہے جو بجالائی جائے تو بھی گناہ اور نہ بجالائی تو بھی گناہ؟ فرمایا وہ نماز جو نشہ کی حالت میں پڑھی جائے۔ کیونکہ نماز ترک کرنا گناہ ہے اور نشہ کی حالت میں پڑھنا بھی گناہ ہے۔ [3]

شاہِ روم کے سوالات

منقول ہے کہ شاہِ روم نے اپنے قاصد کے ذریعے امام علی علیہ السلام سے ایک عجیب سوال پوچھا کہ اُس شخص کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو:

جنت کا طلب گار نہ ہو۔

---

[1] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۷۳ تا ۲۷۴

[2] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۹۵

[3] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۹۶

دوزخ سے خوفزدہ نہ ہو۔
اللہ سے نہ ڈرتا ہو۔
رکوع وسجود نہ بجالاتا ہو۔
خون اور غیر ذبیحہ جانور کا گوشت کھاتا ہو۔
بغیر دیکھے گواہی دیتا ہو۔
فتنہ کو دوست رکھتا ہو۔
حق سے کراہت کرتا ہو۔

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا شخص دراصل اللہ کا ولی ہے۔ وہ جنت کی طلب اور دوزخ کے خوف سے بالاتر ہو کر اللہ کی اِطاعت کرتا ہے۔ وہ اللہ کو عادِل مانتا ہے اس لئے اُس کے ظلم کی بنا پر اُس سے نہیں ڈرتا۔ نماز جنازہ پڑھتا ہے جس میں رکوع وسجود نہیں ہوتے۔ ٹڈی اور مچھلی کا گوشت کھاتا ہے جن کو ذبح نہیں کیا جاتا اور کلیجی کھاتا ہے جو خون ہے۔ اولاد کو دوست رکھتا ہے جو فتنہ ہے۔ جنت و دوزخ کو بغیر دیکھے اُن کی گواہی دیتا ہے، اور موت سے کراہت کرتا ہے جو برحق ہے۔ [1]

غیر جن وانس پر نزولِ وحی

امام علی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ وہ کون ہے جو انسان ہے نہ جن مگر اُس پر وحی نازل ہوئی؟ فرمایا کہ وہ شہد کی مکھی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشادِ پروردگار ہے، ''وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ'' (تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی۔ سورۂ نحل، آیت: ۶۸) [2]

وہ کون تھا جس نے اپنی قوم کو ڈرایا مگر وہ انسان تھا نہ جن؟

یہ سوال امام علی علیہ السلام سے یہودیوں کی ایک جماعت نے کیا۔ فرمایا کہ وہ ایک چیونٹی تھی جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر دیکھ کر کہا، ''يٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۸'' (اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان علیہ السلام اور اُن کا لشکر تمہیں کچل ڈالے اور اُنھیں خبر بھی نہ ہو۔ (سورۂ نمل، آیت: ۱۸)'' [3]

---

[1] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۹۷
[2] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۹۸
[3] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۹۷

صاحبِ قبر کو ساتھ لے کر گھومنے پھرنے والی قبر

امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی قبر تھی جو صاحبِ قبر کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی؟ فرمایا وہ مچھلی جس کے شکم میں حضرت یونس علیہ السلام رہے۔ [1]

ایک ہی دن پیدا ہونے اور مرنے والے مگر عمروں میں سو سال کا فرق

امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ وہ دو بھائی کون تھے جو ایک ہی دن پیدا ہوئے اور ایک ہی دن فوت ہوئے مگر ایک کی عمر پچاس سال اور دوسرے کی ڈیڑھ سو سال تھی؟

فرمایا کہ وہ دو بھائی حضرت عزیز علیہ السلام اور عزرہ تھے۔ اللہ نے عزیز علیہ السلام کو سو سال مردہ رکھا پھر زندہ کر دیا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے، ''فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ط'' (اس پر اللہ نے اُسے سو سال تک کے لئے موت دے دی۔ پھر اسے زندہ کیا۔ سورۃ البقرہ، آیت: ۲۵۹) [2]

باپ کی عمر کم اور بیٹے کی زیادہ

امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ وہ باپ اور بیٹا کون تھے جن میں باپ کی عمر کم جب کہ بیٹے کی زیادہ تھی؟

فرمایا وہ عزیز علیہ السلام اور اُن کے فرزند تھے۔ سو سال مردہ رہنے کے بعد جب وہ زندہ ہوئے تو اُن کی عمر چالیس سال تھی جب کہ اُن کی بیٹے کی عمر ایک سو بیس سال ہو چکی تھی۔ [3]

روزی کہاں سے آئے گی؟

امام علی علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ اگر کسی شخص کے ذرائع معاش اور وسائل روک کر اُسے گھر میں بند کر دیا جائے تو اُس کی روزی کدھر سے آئے گی؟ فرمایا، ''جدھر سے اُس کی موت آئے گی۔'' اور پوچھا گیا کہ خداوند عالم ان گنت مخلوق کا حساب کیسے لے گا؟ فرمایا، ''جس طرح ان گنت مخلوق کو روزی دیتا ہے۔''

---

[1] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۹۸

[2] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۹۹

[3] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۹۹

پھر پوچھا گیا کہ وہ کیسے حساب لے گا جب کہ انسان اُسے دیکھ بھی نہیں پائے گا؟ فرمایا، ''جیسے وہ اُنھیں روزی دیتا ہے مگر وہ اُسے دیکھ نہیں پاتے۔'' [1]

زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ؟

امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ کتنا ہے؟ فرمایا کہ بس اتنا ہے کہ آنکھ اُسے طے کر سکے اور مظلوم کی فریاد وہاں تک پہنچ سکے۔ [2]

امام علی علیہ السلام کی حاضر جوابی

ایک شخص جو امام علی علیہ السلام کا بظاہر دوست تھا مگر بباطن عِنا در کھتا تھا، بڑھ چڑھ کا آپ کی تعریفیں کیے جا رہا تھا۔ آپ علیہ السلام نے اُس سے فرمایا، ''جو تمہاری زبان پر ہے میں اُس سے کم ہوں اور جو تمہارے دِل میں ہے میں اُس سے زیادہ ہوں۔'' [3]

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ علیہ السلام دو طویل القامت اشخاص کے درمیان چل رہے تھے۔ اُن میں سے ایک نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ یا علی! آپ ہمارے درمیان اس طرح ہیں جیسے لفظ ''لَنَا'' (ل ن ل) کے درمیان ''ن''۔ آپ علیہ السلام نے فوراً جواب دیا کہ میں تم دونوں کے درمیان نہ ہوتا تو تم ''لَا'' ہوتے۔ یعنی کچھ بھی نہیں۔ [4]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[1] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۳۰۰ تا ۳۰۱

[2] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۳۰۱

[3] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۳۰۳

[4] مفتی جعفر حسین (متوفی ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۲ ص ۳۰۳

خِلافت

تیسری خِلافت کے بعد تین دن تک مَسندِ خِلافت خالی رہی۔ اس عرصہ میں لوگوں نے حضرت علی (علیہ السلام) کو منصبِ خِلافت قبول کرنے کے لیے سخت مجبور کیا۔ آپ (علیہ السلام) نے بہت پہلوتہی کی لیکن مہاجرین وانصار کے اصرار پر بالآخر آمادہ ہوگئے۔[1] حضرت عثمان کی رِحلت کے تیسرے دن ۲۱ ذی الحجہ دوشنبہ کے دن مسجد نبوی میں آپ (علیہ السلام) کے دستِ مبارک پر بَیعَت ہوئی اور کئی مسلمان آپ (علیہ السلام) کی طرف اُمنڈ پڑے۔ یوں پچیس سالہ گوشہ نشینی کے بعد مسلمانوں کے شدید اصرار اور اتمامِ حُجّت کے لیے خلافت کی ذمہ داریاں اُٹھانے پر نہ چاہتے ہُوئے تیار ہُوئے۔ احتجاجِ طبرسی میں منقول ہے کہ جب لوگوں نے علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) کی بَیعَت کر لی تو آپ امام حسن (علیہ السلام) اور امام حسین (علیہ السلام) کے ساتھ مسجد میں تشریف لائے اور امام حسن (علیہ السلام) سے فرمایا کہ بیٹا! اُٹھو اور حاضرین سے خطاب کرو تا کہ میرے بعد قریش تمھیں فراموش نہ کر دیں۔ چنانچہ امام حسن (علیہ السلام) منبر پر گئے اور حمد وثنائے پروردگار کے بعد فرمایا کہ میں نے اپنے جد رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا کہ وہ علم کا شہر ہیں اور علی (علیہ السلام) اس کا دروازہ ہیں، تو کیا کوئی شخص بغیر دروازے کے شہر میں داخل ہوسکتا ہے؟ حضرت علی (علیہ السلام) کھڑے ہُوئے اور امام حسن (علیہ السلام) کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔ پھر امام حسین (علیہ السلام) سے فرمایا کہ بیٹا! تم بھی اُٹھو اور خطاب کرو تا کہ میرے بعد قریش تمھیں بھول نہ جائیں۔ چنانچہ امام حسین (علیہ السلام) منبر پر تشریف لے گئے اور حمد و ثنائے پروردگار اور محمد وآلِ محمد (علیہم السلام) پر دُرود وسلام کے بعد فرمایا، ''میں نے رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے ہُوئے سُنا ہے کہ بے شک علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) ہدایت کا شہر ہیں لہٰذا جو شخص اس شہر میں داخل ہُوا وہ ہدایت یافتہ ہوگیا اور جو اس شہر سے دُور ہُوا وہ ہلاک ہوگیا۔'' حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) اپنی جگہ سے اُٹھے اور امام حسین (علیہ السلام) کو پیار کیا، اور لوگوں سے فرمایا، ''اے لوگو! گواہ رہنا کہ رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے یہ بچے تمھارے درمیان اُن کی امانت ہیں اور میں بھی انھیں تمھارے درمیان امانت کے طور پر چھوڑ جاؤں گا۔ یاد رہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم سے اپنی امانت کے بارے میں ضرور سوال کریں گے۔''[2] اس روایت کو شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی نے سیر اعلام النبلا میں، ابو جعفر محمد بن یعقوب بن اسحٰق المعروف شیخ

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری، (متوفی: ۹۲۳ء، بغداد، عراق)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۱۷

[2] ابو جعفر محمد بن جریر طبری، (متوفی: ۹۲۳ء، بغداد، عراق)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۱۷

مفیدؒ نے الارشاد میں اور کلینی نے الکافی میں نقل کیا ہے۔ [1]

امیر المومنین علی (علیہ السلام) کے خلیفہ بنتے ہی وہی ہُوا جو آپ پہلے سے جانتے تھے۔ کچھ نے تو بَیعَت ہی توڑ ڈالی، اُن کا آپ (علیہ السلام) نے کوئی مُواخذہ نہ کیا، اور بعض اصرار کرنے لگے کہ گزشتہ دَورِ خلافت کے تمام عاملین کو اُن کے سابقہ عہدوں پر برقرار رکھا جائے۔ اگرچہ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ بات حضرت علی (علیہ السلام) کے مفاد میں جاتی تھی مگر آپ کی سیاست ذاتی مفاد کے لیے نہیں تھی۔ آپ (علیہ السلام) کے پیشِ نظر تو دینِ حق کی سربلندی اور اُمّتِ مسلمہ کی خیر خواہی تھی چنانچہ فرمایا، ''سیاستِ دُنیا کے لحاظ سے بے شک یہی بہتر ہے جو تم کہتے ہو مگر جب میں جانتا ہوں کہ وہ ظالم اور نااہل ہیں تو اُنھیں اپنی طرف سے حکومت کا پروانہ بھیج کر میں کیوں اُن کے مظالم میں شریک بنوں؟'' [2] اُدھر معاویہ نے خلیفہ سوم کے قتل کی تہمت آپ (علیہ السلام) پر لگا کر شام والوں کو آپ کے خلاف خوب مشتعل کر دیا۔ بروایتے دمشق کی جامع مسجد میں ماتمی جلسے مُنعَقِد کیے گئے، اور خلیفہ کا خون آلودہ کُرتہ، اور اُن کی زوجہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی اُنگلیاں منبر پر آویزاں کی گئیں جسے دیکھ کر پچاس ساٹھ ہزار کا مجمع نالہ وزاری کرتا تھا اور جوشِ رقت میں اُن سے کہا جاتا تھا کہ اب تمھیں علی (علیہ السلام) سے اس خون کا بدلہ لینا ہے۔ [3] اس شورش کے سرکردگان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے امام علی (علیہ السلام) کی بعنوانِ خلیفہ بَیعَت کی تھی، اور پھر بعد میں بَیعَت توڑ کر آپ کے مخالفین کے ساتھ مل گئے تھے۔ اُنھیں میں طلحہ وزبیر بھی شامل تھے جو خلافت کی کرسی پر نظریں جمائے ہُوئے تھے لیکن خلافت نہ ملی تو یہ خواب دیکھنے لگے کہ علی (علیہ السلام) خلافت کے معاملات میں اُن سے مُشاوَرت کیا کریں گے لیکن مذکورہ اُمور میں سے کوئی ایک بھی رُونما نہ ہُوا تو اُن کی دِلی خُصُومت آشکار ہوگئی اور وہ باقاعدہ عَلَمِ بغاوت بُلند کر کے جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

---

[1] سید ہاشم رسولی محلّاتی (متوفی: ۱۳۹۸ء، تہران) لمحاتِ جاویداں حیات امام علیہ السلام، ص ۴۴ تا ۴۵ بحوالہ احتجاج طبرسی

[2] علامہ شیخ محمد حسین نجفی (ولادت: ۱۹۳۲ء، سرگودھا)، سعادت الدارین فی مقتل حسین (علیہ السلام)، ص ۱۰۷
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۹۲۳ء، بغداد، عراق)، تاریخ طبری، ج ۵ ص ۱۵۹

[3] علامہ شیخ محمد حسین نجفی (ولادت: ۱۹۳۲ء، سرگودھا)، سعادت الدارین فی مقتل حسین (علیہ السلام)، ص ۱۰۷
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی: ۹۲۳ء، بغداد، عراق)، تاریخ طبری، ج ۵ ص ۱۶۳

جنگِ جمل

حضرت علی (علیہ السلام) ابھی اس فتنے سے نمٹنے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ مکہ مکرمہ سے اطلاع آئی کہ طلحہ و زبیر نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ کو آمادہ کر کے آپ کے خلاف محاذ قائم کر لیا ہے۔[1] چنانچہ مکہ کے حاکم نے آپ کو لکھا کہ طلحہ و زبیر یہاں آئے اور حضرت عائشہ کو اپنے ساتھ (بصرہ) لے گئے۔[2] امیر المومنین علی (علیہ السلام) یہ جان کر منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ دیا۔ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ لوگو! اُنھیں میری خلافت بُری لگی ہے اور وہ بصرہ چلے گئے ہیں پس اُن کی طرف جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ (علیہ السلام) نے لشکر کی علمداری حضرت محمد بن حنفیہ (رضی اللہ عنہ) کے سُپرد کی، میمنہ پر حسن (علیہ السلام)، اور میسرہ پر حسین (علیہ السلام) کو مُتعیّن کیا۔ سواروں کی سرداری حضرت عمار یاسر (رضی اللہ عنہ) اور پیادوں کی نمائندگی حضرت محمد بن ابی بکر (رضی اللہ عنہ) کے حوالہ کی اور مقدمۃُ الجیش کا سردار حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) کو مقرر کیا۔[3]

جنگِ جمل کے نام سے مشہور یہ جنگ مسلمانوں کے درمیان ہونے والی پہلی جنگ تھی جو ۱۰ جمادی الثانی، ۳۶ ہجری بمطابق ۴ دسمبر، ۶۵۶ عیسوی کو ہوئی۔[4] اور بروایتے جمادی الاوّل میں جمعرات کے دن صبح سے ظہر تک ہوئی۔[5]

رفاعہ بن ایاس اپنے والد سے اور وہ اُس کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ہم جمل کے دن حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ آپ نے طلحہ بن عبیداللہ کی طرف ملاقات کا پیغام بھیجا۔ پس طلحہ اُن کے پاس آیا۔ آپ نے کہا، ''میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں، کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جس کا میں مولا ہوں اُس کا علی مولا ہے، اے اللہ! جو علی کو دوست رکھے تو اُسے دوست رکھ اور جو اُس سے عداوت رکھے تو اُس سے عداوت رکھ؟'' طلحہ نے کہا، ''ہاں! سُنا ہے۔'' حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا، ''تو پھر میرے

---

[1] سبط ابن الجوزی (متوفی: ۶۵۴ ہجری، دمشق)، تذکرۃ الخواص، ۷۹

[2] شمس الدین سبط ابنِ جوزی (۶۵۴ھ، بغداد، عراق)، تذکرۃ الخواص، ۷۹

[3] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان)، چودہ ستارے، ص ۱۵۹

[4] آزاد دائرۃ المعارف ویکی پیڈیا بحوالہ:

ابوالحسن احمد بن یحییٰ بن جابر بن داؤد البلاذری (متوفی: ۹۹۲ء، بغداد) انساب الاشراف، ج ۲ ص ۱۶۳-۱۶۴

ابوجعفر محمد بن جریر طبری، (متوفی: ۹۲۳ء، بغداد، عراق) تاریخ طبری، ج ۴، ص ۴۶۸

[5] شمس الدین سبط ابنِ جوزی، (متوفی: ۶۵۴ھ، بغداد، عراق)، تذکرۃ الخواص، ص ۸۹

ساتھ کیوں جنگ کرتے ہو؟'' طلحہ نے کہا، ''مجھے یہ بات یاد نہیں تھی۔''[1]

علامہ سیّد رضی جعفر نقوی لکھتے ہیں کہ ۳۶ ہجری میں جنگِ جمل ہوئی جس میں سرکار سیّد الشہدا (علیہ السلام) نے اپنے پدرِ بزرگوار امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب (علیہ السلام) کے ساتھ حق کی سربلندی کے لیے میدانِ کارزار میں قدم رکھا، اور دادِ شجاعت دیتے ہُوئے کُشتوں کے پُشتے لگا دیے۔ بیس ہزار سے زیادہ کی تعداد پر مشتمل وہ دشمنانِ دِین جنھوں نے گزشتہ سات آٹھ مہینوں سے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا، چند گھنٹے بھی ذوالفقارِ حیدری کی کاٹ برداشت نہ کر سکے چنانچہ دوپہر کے وقت شروع ہونے والی جنگ شام تک اختتام کو پہنچ گئی۔[2] اس معرکہ کے اختتام پر جب فریقِ مخالف شکست سے دوچار ہو چکا تو امیر المومنین (علیہ السلام) نے حضرت عائشہ کے لیے ایک خیمہ نصب کروایا۔ ہشام بن محمد سے منقول ہے کہ امیر المومنین حضرت علی (علیہ السلام) نے حضرت عائشہ کے لیے بہترین اسبابِ سفر تیار کرایا، بہت سامال بھی اُنھیں پیش کیا اور اُن کے ساتھ اُن کے سگے بھائی عبدالرحمٰن کو روانہ کیا۔ عبدالرحمٰن کے علاوہ تیس جوان اشرافِ بصرہ اور قبیلہ ہمدان اور عبدالقیس کی بیس دیندار عورتیں بھی ساتھ تھیں جن کو مردانہ لباس یعنی عمامہ وغیرہ پہنا دیا گیا تھا اور تلواریں حمائل کرا دی گئیں تھیں۔ اُنھیں حکم دیا گیا کہ چہروں پر ڈھاٹے باندھ لو، اُمّ المومنین کے ساتھ رہو اور کسی مرد کو اُن کے قریب نہ آنے دو۔ وہ خواتین اسی طرح حضرت عائشہ کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ مدینہ پہنچنے پر حضرت عائشہ سے پوچھا گیا کہ واپسی کا سفر کیسا رہا؟ کہنے لگیں خدا کی قسم بہت اچھا رہا، اُس (علی علیہ السلام) نے دیا اور بہت دیا لیکن (افسوس کہ) غیر مردوں کو میرے ساتھ کر دیا جو میری جان پہچان والے نہ تھے۔ یہ بات اُن عورتوں تک پہنچی تو وہ حضرت عائشہ کے پاس آئیں اور بتایا کہ مردانہ لباس میں ہم ہی تھیں۔ حضرت عائشہ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور کہا کہ خدا کی قسم اے ابوطالب (علیہ السلام) کے بیٹے! تیرا کرم واقعی بہت زیادہ ہوتا ہے۔[3]

---

[1] محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (متوفی: ۱۰۱۴ء، نیشاپور)، ۳:۳۷۱، رقم: ۵۵۹۴

أحمد بن الحسین أبو بکر البیهقی (متوفی: ۱۰۶۶ء، نیشاپور)، کتاب الاعتقاد والهدایة: ۳۷۳

ابنِ عساکر دمشقی (متوفی: ۵۷۱ھ، دمشق)، تاریخ دمشق الکبیر، ۲۷: ۷۶

نور الدین علی بن ابی بکر بن سلیمان هیثمی (متوفی: ۸۰۷ھ ہجری، قاهرہ) مجمع الزوائد ۹:۱۰۷

علاء الدین علی بن حسام الدین متقی هندی (متوفی: ۱۵۶۷ء مکه) کنز العمال، ۱۱: ۳۳۲، رقم: ۳۱۶۶۲

[2] علامہ سیّد رضی جعفر نقوی، مولا حسین (علیہ السلام) ص ۱۰۰

[3] علامہ سبط ابن جوزی (متوفی: ۶۵۴ ہجری، دمشق) تذکرۃ الخواص (اردو ترجمہ) ص ۹۲

جنگِ صفین

جنگِ جمل کے بعد امیر المومنین علی (علیہ السلام) بصرہ سے کوفہ روانہ ہُوئے اور اسی سال یعنی ۳۶ ہجری میں رجب کی ۱۲ تاریخ کو کوفہ میں داخل ہُوئے۔ آپ نے جزیر بن عَبد اللہ بَجَلی کے ہاتھ معاویہ کو خط روانہ کیا جس میں بَیعَت کا مطالبہ کیا گیا تھا مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور اُسی سال ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر لے کر آپ (علیہ السلام) کے مقابلے پر صفین میں وارد ہُوا۔ حضرت علی (علیہ السلام) کے لشکر میں نوّے ہزار مجاہدین تھے جن میں سے سترہ بدری مہاجرین اور ستر بدری انصار یعنی کل ستاسی بدری افراد تھے۔ ان کے علاوہ ایک ہزار آٹھ سو صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) تھے، جن میں سترہ اصحاب (رضی اللہ عنہم) وہ تھے جنہوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دستِ مبارک پر درخت کے نیچے ''بیعتِ رضوان'' کی تھی۔ حضرت علی (علیہ السلام) کے ساتھیوں میں سے حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ)، حضرت اویس قرنی (رضی اللہ عنہ) اور اصحابِ بدر (رضی اللہ عنہم) میں سے پچیس صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے اُس جنگ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ بروایتے، اہلِ عراق کے مقتولین کی تعداد بیس ہزار تھی جبکہ اہلِ شام میں سے ستر ہزار افراد مارے گئے۔ [1]

عبداللہ بن قیس سے مروی ہے کہ میں جنگ صفین میں حضرت علی (علیہ السلام) کے ساتھ تھا، ابوالاعور سلمٰی نے نہرِ فرات پر قبضہ کرلیا تھا تاکہ امیر المومنین (علیہ السلام) کی فوج تک پانی نہ پہنچ سکے۔ جب لوگوں نے شدتِ پیاس سے مجبور ہوکر آپ سے شکایت کی تو آپ نے چند سواروں کو قبضہ چھڑانے کے لیے روانہ کیا مگر وہ ناکام لوٹ آئے۔ حسین (علیہ السلام) نے عرض کی کہ اے پدرِ بزرگوار! مجھے اجازت دیجئے کہ میں جاکر اُنہیں فرات سے بھگاؤں۔ پس اجازت ملتے ہی حسین (علیہ السلام) چند ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہُوئے، اور قابضین کے ساتھ جنگ کی۔ کئی منافق واصلِ جہنم ہُوئے باقی فرات کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ حسین (علیہ السلام) نے اپنے سواروں کو فرات کے کنارے متعین کیا اور خود جناب امیر (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہو کر فتح کی نوید سنائی۔ [2] صفین کے اس معرکہ میں حضرت ابوالفضل عباس (علیہ السلام) بھی امام حسین (علیہ السلام)

---

[1] علامہ سبط ابن جوزی (متوفی: ۶۵۴ ہجری، دمشق) تذکرۃ الخواص (اردو ترجمہ) ص ۹۲ تا ۹۳
علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) علمدارِ کربلا حضرت عباس (علیہ السلام) ص ۳۱
بحوالہ: شجرہ طوبیٰ نجف اشرف ۱۳۵۴ھ الوامج الاحزان، ج ۱ ص ۹

[2] علامہ محمد باقر مجلسی، (متوفی: ۱۱۱۰ھ) بحار الانوار، ج ۱۰ (در حالات امام حسین علیہ السلام) حصّہ اوّل، ص ۱۰۵

کے ہمرکاب تھے۔ اُس وقت اُن کی عمر صرف گیارہ سال تھی لیکن وہ مردوں کی طرح کامل تھے اور بروایتے بلند کامتی میں اپنے زمانے کے تمام لوگوں سے ممتاز تھے اور جب گھوڑے پر سوار ہوتے تو آپ کے پاؤں زمین پر خط دیتے جاتے تھے۔ علامہ محمد باقر خراسانی لکھتے ہیں، ''حضرت عباس (علیہ السلام) اُس دن اپنے بھائی حسین (علیہ السلام) کے جلو میں مُعین و مددگار کی حیثیت سے تھے جس روز معاویہ کے لشکر کافرات سے قبضہ اُٹھانا اور اپنا قبضہ بٹھانا مقصود تھا۔'' [1]

علامہ نجم الحسن کراروی بحوالہ ''ریاض القدس''، لکھتے ہیں کہ جب امام حسین (علیہ السلام) کے بھائیوں کو خبر ہوئی کہ وہ میدانِ جنگ میں اُتر رہے ہیں تو آپس میں کہنے لگے کہ حسین (علیہ السلام) ابنِ فاطمہ (علیہا السلام) عازمِ میدانِ جنگ ہوں لیکن ہم لوگ بیٹھے رہیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ غرض سب آ گئے، اور دُور تک آپ کے ہمرکاب رہے۔ حضرت عباس (علیہ السلام) بھی آپ کو میدانِ جنگ کی طرف رخصت ہوتے ہوئے دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ اگرچہ اُس وقت وہ کم سن تھے لیکن بہت دلیری اور بے تابی کے ساتھ بھائی کی مدد کو بڑھے۔ امیر المومنین (علیہ السلام) کے اصحاب کا بیان ہے کہ ناگاہ ایک برق سی چمکی اور ایک سوار اس طرح ایک سَمت سے نکلا کہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون ہے۔ آناً فاناً وہ لشکر کی صفوں کے درمیان جا گُھسا۔ اُس جرّار کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ اُس نے کمال غیظ و غضب سے نیزے کو حرکت دی اور دشمن کے جوانوں کو نوکِ سناں پر اُٹھا اُٹھا کر پھینکنے لگا۔ وہ یکے بعد دیگرے اُن کو ہلاک کرنے لگا یہاں تک کہ اُس نے تھوڑی ہی دیر میں نوے اشقیا کو واصلِ جہنم کر دیا۔ اُس کے شیرانہ حملوں کی وجہ سے لشکر میں شور و غل مچ گیا کہ یہ دلیر کون ہے؟ معلوم ہُوا کہ قمرِ بنی ہاشم، فرزندِ حیدر کرار، عباس حق شناس (علیہ السلام) ہے۔ [2] حضرت عباس (علیہ السلام) نے اس جنگ میں ابنِ شعثاء اور اُس کے سات بیٹوں کو جہنم واصل کیا۔ ابنِ شعثاء وہ شخص تھا جسے اہلِ شام اُس کی طاقت اور دلیری کے سبب کئی آدمیوں کے برابر سمجھتے تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت عباس (علیہ السلام) اپنے چہرے پر نقاب ڈالے میدانِ جنگ میں اُترے۔ آپ کی ہیبت اور شجاعت کی وجہ سے کسی کو آپ کے مقابلے کی

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان)، علمدارِ کربلا عباس (علیہ السلام)، ص ۳۱، ۳۶، ۳۷
بحوالہ: کبریت احمر، جز ۱۰ ص ۶۵، طبع ایران ۱۳۴۳ء

[2] سیّد نجم الحسن کراروی، (متوفی: ۱۹۸۲ء) علمدارِ کربلا عباس (علیہ السلام)، ص ۳۹ تا ۴۰ بحوالہ: تحفہ یوسفیہ، ص ۵۵
شیخ صدر الدین واعظ قزوینی (متوفی: ۱۳۳۰، ایران) ریاض القدس ص ۱۲۵

جرأت نہ ہوئی تو حاکمِ شام نے اپنے ایک بہادر ابنِ شعثا سے کہا کہ تُو اس جوان کے مقابلے پر جا۔ ابنِ شعثا نے جواب دیا کہ اہلِ شام مجھے ہزاروں کے برابر سمجھتے ہیں اس لیے اس نوجوان کے مقابلے پر جانا مجھے زیب نہیں دیتا، میں اپنے بیٹے کو روانہ کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے ایک بیٹے کو بھیجا جو جاتے ہی نقاب پوش کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ پھر اُس نے اپنے دوسرے بیٹے کو بھیجا۔ وہ بھی جاتے ہی مارا گیا۔ یہاں تک کہ اُس نے یکے بعد دیگرے اپنے ساتوں بیٹوں کو میدانِ جنگ میں اُتارا لیکن سبھی فرزندِ حیدر کرار (علیہ السلام) کی تلوار کا لقمہ بن گئے۔ ابنِ شعثاء کا ضبط جاتا رہا اس لیے خود قدم بڑھایا لیکن شیرِ خدا کے شیر دِل بیٹے عباس (علیہ السلام) نے آناً فاناً اُسے بھی جہنم رسید کر دیا تو مخالف فوج کو سانپ سُونگھ گیا اور کسی کو میدانِ کارزار میں اُترنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لوگوں کو شُبہ ہُوا کہ نقاب کے پیچھے علی (علیہ السلام) ہیں لیکن جب وہ بنفسِ نفیس رَزْم گاہ میں تشریف لائے اور نوجوان کے چہرے سے نقاب سرکائی تو لوگوں نے دیکھا کہ یہ علی (علیہ السلام) نہیں بلکہ اُن کی شجاعت کے وارث عباس ابنِ علی (علیہ السلام) ہیں۔[1] اس جنگ میں امام حسین (علیہ السلام) میمنہ (لشکر کا دایاں حصّہ) کے سپہ سالار تھے۔[2]

جنگِ نہروان

جنگِ صفین کے بعد سنہ ۳۸ ہجری کو ماہِ صفر میں جنگِ نہروان واقع ہوئی۔ یہ جنگ امام علی (علیہ السلام) اور مارقین نامی گروہ کے درمیان لڑی گئی جو خوارِج کے نام سے مشہور تھا۔ اس جنگ میں خوارِج کو ذِلت آمیز شکست ہوئی، اور اُن کے سبھی لوگ جن کی تعداد تقریباً چار ہزار تھی، مارے گئے۔ بروایتے، صرف دس خارجی فرار ہونے میں کامیاب ہُوئے جن میں سے ایک عبدالرحمٰن بن ملجم ملعون تھا۔[3]

---

[1] سیّد عبدالرزاق موسوی مقرم (متوفی: ۱۳۹۱ھ)، العباس (علیہ السلام)، ۱۴۲۷ق، ص ۲۴۲
علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان)، علمدارِ کربلا عباس (علیہ السلام)، ص ۴۰
علامہ محمد باقر خراسانی تلمیذ ملا حسین نوری، کبریت الاحمر، ج ۳ ص ۲۵ طبع ایران ۱۳۴۳ھ

[2] ابو محمد احمد بن اعثم الکوفی، (متوفی: ۳۱۴ھ)، الفتوح ۱۴۱۱، ج ۳ ص ۲۴
محمد بن علی ابنِ شہر آشوب، (متوفی: ۵۸۸ھ، حلب)، المناقب، ج ۳ ص ۱۶۸

[3] آزاد دائرۃ المعارف ویکی پیڈیا بحوالہ تفسیر احسن التفاسیر، حافظ محمد سیّد احمد حسن، التوبہ: ۵۸

امام علی علیہ السلام کی شہادت

۱۹ رمضان، ۴۰ ہجری کو نمازِ فجر کی ادائیگی کے دوران عبدالرحمٰن بن ملجم (لعنۃ اللہ علیہ) نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے آپ (علیہ السلام) پر حملہ کر دیا۔ آپ شدید زخمی ہُوئے اور دو دن بعد ۲۱ رمضان کو شہید ہو گئے۔ روایت ہے کہ امام علی (علیہ السلام) کے قتل کی سازش کے تحت عبدالرحمٰن ابنِ ملجم کوفہ آیا اور قبیلہ ''تیم الرباب'' کے ہاں گیا جہاں اُس کی ملاقات اُس قبیلے کی ایک عورت ''قطام بنتِ شجنہ بن عدی بن عامر'' سے ہوئی۔ قطام، جسے قطامہ بھی کہا جاتا تھا، کا باپ اور بھائی نہروان کی جنگ میں حضرت علی (علیہ السلام) کے مقابل قتل ہو گئے تھے چنانچہ وہ امام علی (علیہ السلام) کی سخت مخالف تھی۔ اُس نے اپنی شادی کو امام علی (علیہ السلام) کے قتل کے ساتھ مشروط کر رکھا تھا چنانچہ جب ابنِ ملجم نے اُس سے شادی کی خواہش کی تو اُس نے کہا، ''میرا مہر تین ہزار دینار اور علی (علیہ السلام) کا قتل ہوگا۔'' ابنِ ملجم نے کہا، ''میں تو کوفہ میں آیا ہی علی (علیہ السلام) کے قتل کے لیے ہوں۔''[۱]

وہ چالیس ہجری کا ماہِ رمضان تھا۔ امام علی (علیہ السلام) روزہ افطار کرنے عبداللہ بن جعفر اور اپنی اولاد کے ہاں باری باری جایا کرتے تھے۔ آپ بہت کم کھاتے اور استفسار پر فرماتے کہ میں چاہتا ہوں کہ جب میرا آخری وقت آئے تو میرا پیٹ خالی ہو۔[۲] اُنیسویں شبِ رمضان آپ اپنی صاحبزادی حضرت اُمّ کلثوم علیہا السلام کے ہاں تشریف لے گئے۔ اُنھوں نے جَو کی دو روٹیوں کے ساتھ نمک اور دُودھ کا پیالہ پیش کیا تو فرمایا کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی میں کبھی نہیں چاہا کہ میرے دسترخوان پر ایک وقت میں دو قسم کے کھانے ہوں۔ بیٹی! دُنیا کے حلال میں حساب ہے اور حرام میں عِقاب (عذاب) ہے۔ اگر تم نہیں چاہتیں کہ تمہارا بابا دیر تک اس کا حساب دیتا رہے تو ان دو چیزوں میں سے ایک اُٹھا لو۔ چنانچہ حضرت اُمّ کلثوم علیہا السلام نے دُودھ کا پیالہ اُٹھا لیا اور آپ نے چند نوالے نمک کے ساتھ لئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول عبادت میں مصروف ہو گئے۔ اُس رات آپ بار بار نگاہ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے اور فرماتے کہ خدا کی قسم! میں جھوٹ نہیں کہتا اور نہ ہی مجھے غلط بتایا گیا ہے، یہی وہ رات ہے جس کا مجھ سے وعدہ

---

[۱] رسول جعفریان (متولد: ۱۹۶۴، ایران)، آئمہ اہل بیت (علیہم السلام)، ص ۱۱۶
بحوالہ: محمد بن عمر بن واقدی (متوفی: ۸۲۳ء، بغداد) طبقات الکبریٰ، ج ۳ ص ۳۵

[۲] عزالدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) تاریخ کامل، ج ۳ ص ۱۹۵

کیا گیا ہے۔[1] آپ حالتِ اضطراب میں سورۃ یٰسین کی تلاوت کرتے کبھی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○ (ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے) پڑھتے اور کبھی لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ○ (نہیں ہے کوئی قوّت اور طاقت مگر عظمت والا اللہ) اور اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لِیْ فِی الْمَوْتِ○ (الٰہی موت کو میرے لئے بابرکت قرار دے) پڑھتے۔ حضرت اُمّ کلثوم علیہا السلام یہ کیفیت دیکھ کر پریشان ہو گئیں اور وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ بیٹی آخرت کا سفر درپیش ہے اور اللہ کی بارگاہ میں جانے والا ہوں۔ بیٹی کا اضطراب بڑھ گیا، کہا بابا! آج آپ مسجد نہ جائیں، جعدہ بن ہبیرہ سے کہیے کہ وہ نماز پڑھا دیں۔ فرمایا، ''قضائے الٰہی سے مَفَر نہیں۔'' پس آپ مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ گھر کے صحن میں آئے تو پالتو بطخیں پر پھڑ پھڑاتی اور شور مچاتی ہوئی راہ میں حائل ہو گئیں۔ کسی نے اُنھیں بھگانا چاہا تو فرمایا کہ انھیں کچھ نہ کہو، ابھی کچھ دیر بعد آہ و بکا اور نالہ شیون کی صدائیں بلند ہوں گی۔ پھر حضرت اُمّ کلثوم علیہا السلام سے فرمایا کہ بیٹی! ان بے زبانوں کے آب و دانہ کا خیال رکھنا اور اگر ایسا نہ کر سکو انھیں آزاد کر دینا کہ زمین پر چل پھر کر اپنا پیٹ پال سکیں۔ حضرت اُمّ کلثوم علیہا السلام نے بادیدۂ تر بابا کو الوداع کہا، امام حسن علیہ السلام نے چاہا کہ مسجد تک ساتھ جائیں مگر امام علی علیہ السلام نے منع کر دیا۔ ابھی رات کی تاریکی موجود تھی جب آپ مسجد میں پہنچے۔ آپ کچھ دیر مصروفِ عبادتِ پروردگار رہے پھر اذانِ فجر دی۔ اذان کے بعد آپ لوگوں کو نماز کے لئے بیدار کرنے لگے تو ابنِ ملجم کو دیکھا جو مسجد میں اَوندھا لیٹا سو رہا تھا۔ آپ نے اُسے اُٹھایا اور فرمایا کہ اُٹھ نماز پڑھ اگرچہ میں جانتا ہوں تو کس ارادے سے آیا ہے اور تُو نے اپنے دامن میں کیا چھپا رکھا ہے؟ پس امیر المومنین علیہ السلام نماز کے لئے محرابِ مسجد میں کھڑے ہوئے اور پہلی رکعت کے سجدے سے سر اُٹھایا تو شبیب بن بجرہ نے آپ پر تلوار کا وار کیا جو مسجد کے ستون سے ٹکرا کر خالی گیا۔ دوسرا وار ابنِ ملجم نے کیا۔ زہر میں بجھی ہوئی اُس کی تلوار حضرت علیہ السلام کے سرِ اقدس کو شگافتہ کر گئی۔ فرمایا، ''بِسْمِ اللّٰہِ وَعَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ○ فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ○'' (اللہ کے نام سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دِین پر۔ ربِ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔) امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کو خبر ملی تو مسجد پہنچے جہاں لوگ آہ و بکا کر رہے تھے۔ امام حسن علیہ السلام نے امیر المومنین علیہ السلام کو خون میں بھیگا ہُوا دیکھا تو پوچھا کہ بابا! کس نے آپ کا خون بہایا

---

[1] علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۲۰۵، ناشر مرکز افکار اسلامی، پاکستان
بحوالہ: ابن حجر مکی (متوفی: ۹۷۴ ہجری، مکہ) الصواعق المحرقہ، ج ۲ ص ۱۳۴

ہے؟ فرمایا کہ پہلے نماز پڑھاؤ۔ چنانچہ امام حسن علیہ السلام نے نماز پڑھائی، امیر المومنین علیہ السلام نے خود بیٹھ کر نماز ادا کی۔ نماز کے بعد امام حسن علیہ السلام سے فرمایا کہ ابنِ ملجم مرادی نے میرا خون بہایا ہے۔ اگر میں زندہ رہا تو جو چاہوں اُسے سزا دوں اور چل بسا تو قِصاص میں تم اُس پر صرف ایک ہی ضرب لگانا کیونکہ اُس نے مجھے ایک ہی ضرب لگائی تھی، اور قتل کے بعد اُس کے ہاتھ پاؤں مت کاٹنا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مُثلہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور اس کی اسیری کے دوران اسے وہی کھلانا پلانا جو تم خود کھاؤ پیو گے۔ لوگ حضرت علیہ السلام کو اُٹھا کر گھر لائے۔ آپ کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور نقاہت کی وجہ سے غشی طاری ہونے لگی۔ امام حسن علیہ السلام نے دُودھ کا پیالہ پیش کیا تو کچھ نوش کرنے کے بعد فرمایا کہ ابنِ ملجم کو بھی دُودھ شربت دیا جائے۔ کوفہ کے طبیب جمع ہو چکے تھے۔ اُن میں سے ایک ماہر طبیب اثیر ابنِ عمرو سکونی نے زخم کا جائزہ لے کر کہا کہ زہر آلود تلوار سے مغزِ سر متاثر ہُوا ہے اور جسم میں زہر پھیل چکا ہے اس لئے جانبر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ امام علی علیہ السلام نے اُنیسویں اور بیسویں شب نہایت اذیت میں گزاری اور اکیسویں رات میں کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے جانِ آفریں بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دی۔ [1]

اہلِ سنت کے نامور عالم دین قاضی محمد سلیمان منصور پوری، اپنی تالیف ''رَحمۃٌ لِّلعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)'' میں امیر المومنین علی علیہ السلام کی شہادت کے بیان میں بکر بن حماد القاہری کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جن کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

ابنِ ملجم سے کہنا (گو میں جانتا ہوں) کہ تقدیر سب پر غالب ہے
مگر اے کم بخت! تُو نے اسلام کے ارکان کو ڈھایا
وہ شخص جو زمین پر چلنے والوں میں سب سے افضل تھا
اسلام اور ایمان میں سب سے اوّل تھا
اور قرآن وسُنّت کے جاننے میں سب سے اعلم تھا
تُو نے اُسے قتل کیا
وہ دامادِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اُن کا دوست و ناصر تھا
جس کے مناقب کے نُور اور برہان روشن ہیں

---

[1] مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور)، سیرت امیر المومنین علیہ السلام، ج ۱ ص ۸۲۵ تا ۸۳۰

جو علی، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایسا تھا جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہارون علیہ السلام
جو لڑنے میں شمشیر براں اور دلیر شیر تھا جب خوب گھمسان کا رَن پڑ جاتا
میں اُس کے قاتل کا خیال کرتا ہوں اور روتے ہوئے کہتا ہوں
اے اللہ! تُو پاک ہے، تیری قدرت عجیب ہے
میں اُس کے قاتل کی بابت یہی کہوں گا کہ
وہ بشر نہیں جو قیامت سے ڈرتا ہو بلکہ شیطان ہے
اپنے قبیلہ مراد میں سب سے زیادہ بد بخت
اور میزان میں سب سے زیادہ زیاں کار
(وہ تو) عاقر ناقے جیسا تھا جس نے صالح علیہ السلام کے ناقے کو مارا
اور قوم ثمود پر ملک حجر میں تباہی لانے کا سبب ٹھہرا
معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام پر وار کرنے سے اُس کا مقصد یہی ہوگا
کہ وہ خود جہنم کی آگ کا ایندھن بن سکے [1]

اَللّٰھُمَّ الْعَنْ قَتَلَۃَ أَمِیر الْمُؤْمِنِین عَلی ابْن اَبِی طَالب عَلَیْہ السَّلاَم



[1] قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری (متوفی: ۱۹۳۰ء، بھارت) کتاب: رَحمۃ لّلعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۲ ص ۳۳۸

ماخذ

القرآن الحکیم

آیت اللہ سید علی حسینی سیستانی (متولد: ۱۹۳۰ء، مشہد، ایران) آسان مسائل

آیت اللہ جعفر سبحانی (متولد: ۱۹۲۹ء، تبریز) دی میسیج (The Message)

آیت اللہ سید احمد مستنبط، مناقبِ اہل بیت، ترجمہ: اَلقطرۃُ مِن بِحارِ مَناقبِ النبیِّ وَالعترۃِ

ابنِ ابی الحدید (متوفی: ۱۲۵۸ء، بغداد) شرح نہج البلاغہ

ابنِ ابی عاصم اللالبنانی (متوفی: ۲۸۷ء) کتاب السنۃ ظلال الجنۃ

ابنِ خلدون (متوفی: ۱۴۰۶ء، قاہرہ) تاریخ ابنِ خلدون

ابنِ عماد حنبلی (متوفی: ۱۶۷۹ء، مکہ) شذرات الذھب فی اخبار من ذھب

ابنِ قتیبہ دینوری (متوفی: ۸۸۹ء، بغداد) الامامیۃ و السیاسۃ

ابنِ ابی شیبہ (متوفی: ۸۴۹ء، کوفہ) المصنف

ابنِ ابی حاتم رازی (متوفی: ۹۳۸ء، طوس) تفسیر القرآن العظیم

ابنِ الوردی (متوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۹ء، حلب) تاریخ ابن الوردی

ابنِ حجر عسقلانی (متوفی: ۱۴۴۹ء، قاہرہ) فتح الباری

ابنِ حجر عسقلانی (متوفی: ۱۴۴۹ء، قاہرہ) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ

ابنِ حجر مکی (متوفی: ۹۷۴ ہجری، مکہ) الصواعق المحرقہ

ابنِ صباغ مالکی (متوفی: ۱۴۵۱ء، یروشلم) الفصول المھمۃ فی معرفۃ احوال الآئمہ

ابنِ قیم جوزیہ (متوفی: ۱۳۵۰ء، دمشق) زاد المعاد

ابنِ مغازلی شافعی (متوفی: ۴۸۳ ہجری، بغداد) مناقب حضرت علی (علیہ السلام)

ابوالحسن احمد بن یحییٰ بن جابر بن داؤد البلاذری (متوفی: ۹۹۲ء، بغداد) انساب الاشراف

ابوالقاسم سلیمان ابن احمد ابن الطبرانی المعروف طبرانی (متوفی: ۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الصغیر

ابوالقاسم سلیمان ابن احمد ابن الطبرانی المعروف طبرانی (متوفی: ۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الاوسط

ابوالقاسم سلیمان ابن احمد ابن الطبر انی المعروف طبرانی (متوفی:۹۷۱ء، اصفہان) المعجم الا کبیر
ابوجعفر محمد بن عمرو بن موسیٰ عقیلی (متوفی:۳۲۲ہجری، مکہ) ضعفاء الکبیر
ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری (متوفی:۴۰۵ہجری، نیشاپور) مستدرک حاکم
ابوعبداللہ محمد بن یزید ابنِ ماجہ (متوفی:۸۶۶ء، قزوین) سنن ابنِ ماجہ
ابوعیسیٰ محمد ترمذی (متوفی:۲۷۹ہجری، ترمذ) جامع ترمذی
ابومنصور الدیلمی (متوفی:۵۵۸ہجری، ہمدان) مسند الفردوس
ابوالحسن علی بن حسین مسعودی (متوفی:۹۵۶ء، قاہرہ) التنبیہ والاشراف
ابوالحسن علی بن حسین مسعودی (متوفی:۹۵۶ء، قاہرہ) اثبات الوصیہ
ابوالحسن علی بن حسین مسعودی (متوفی:۹۵۶ء، قاہرہ) مروج الذہب و معادن الجواہر (تاریخ المسعودی)
ابوالقاسم بُستی (متوفی:۴۲۰ہجری، گیلان) المراتب فی فضائل امیر المومنین
ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی (متوفی:۸۴۱ء، بغداد) کافی
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی:۳۱۰ھ، بغداد) امامی، دلائل الامامہ
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی:۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ طبری
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی:۳۱۰ھ، بغداد) تاریخ الامم والملوک
ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ، بغداد) نوادر المعجزات
ابوزکریا الازدی (متوفی:۳۳۴ہجری، موصل) تاریخ موصل، کتاب الثالث عشر
ابوصادق سُلَیم بن قیس عامری ہلالی کوفی (متوفی:۷۶ہجری) کتاب سلیم بن قیس
احمد بن ابی یعقوب ابنِ واضح الیعقوبی (متوفی:۸۹۷ء، مصر) تاریخ یعقوبی
احمد بن حسین ابوبکر بیہقی (متوفی:۱۰۶۶ء، نیشاپور) کتاب الاعتقاد والھدایۃ
احمد بن شعیب نسائی (متوفی:۳۰۳ہجری، مکہ) السنن الکبریٰ
احمد بن شعیب نسائی (متوفی:۳۰۳ہجری، مکہ) خصائص نسائی
احمد بن علی ابنِ عنبہ (متوفی ۸۲۸ہجری، کرمان) عُمْدَۃُ ألطّالِب فی أنْسابِ آلِ أبی طالب
احمد بن محمد بن حنبل (متوفی:۸۵۵ء، بغداد) المسند

احمد بن محمد بن حنبل (متوفی: ۸۵۵ء، بغداد) فضائل الصحابہ
اسماعیل ابوالفداء (متوفی ۱۳۳۱ء، حماۃ، شام) تاریخ ابوالفداء
الشیخ عبدالواحد المظفر (متوفی: ۱۳۱۰ء، نجف اشرف) الموسوعہ بطل العلقمی
امیر سید جمال الدین محدث دہلوی، روضۃ الاحباب
پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری (متوفی: ۱۹۸۸، پاکستان) اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ
جلال الدین احمد، خلفائے راشدین، مکتبہ: المدینۃ العلمیہ، دعوتِ اسلامی
جلال الدین سیوطی (متوفی: ۱۵۰۵ء، قاہرہ) الدر المنثور فی التفسیر بالماثور
جلال الدین سیوطی (متوفی: ۱۵۰۵ء، قاہرہ) خصائص سیوطی
جمال الدین مزی (متوفی: ۱۳۴۱ء دمشق) تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الأطراف
حافظ ابنِ البر (متوفی: ۱۰۷۱ء، شاطبہ) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب
حافظ ابنِ البر (متوفی: ۱۰۷۱ء، شاطبہ) الدرر فی اختصار المغازی والسیر
حافظ ابوبکر البزار (متوفی: ۹۰۵ء، رملہ) البحر الزخار
حافظ شمس الدین ذہبی (متوفی: ۱۳۴۸ء، دمشق) العبر فی خبر من غبر
حافظ محمد بن یوسف گنجی شافعی (متوفی: ۶۵۸ ہجری، دمشق) کفایۃ الطالب
حاکم نیشاپوری (متوفی: ۴۰۵ ھجری، نیشاپور) المستدرک علی الصحیحین
حسین بن محمد دیاربکری (متوفی: ۹۸۲ ھجری، مکہ) تاریخ الخمیس
خطیب بغدادی (متوفی: ۴۶۳ ہجری، بغداد) تاریخ بغداد
ڈاکٹر محمد طاہر القادری (متولد: ۱۹۵۱ء، جھنگ، پاکستان) السیف الجلی علیٰ منکر ولایۃ علی علیہ السلام
ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (متوفی: ۱۹۹۷ء، لاہور) کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
ڈاکٹر محمد حمید اللہ (متوفی: ۲۰۰۲ء، امریکہ) رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیاسی زندگی
ڈاکٹر مولوی عبدالعلیم احراری (متوفی: ۱۹۷۶ء، بھارت) سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مستشرقین
ذبیح اللہ محلاتی (متوفی: ۱۳۶۴ ش، رے) ریاحین الشریعہ
رسول جعفریان (متولد: ۱۹۶۴، ایران) تاریخ سیاسی اسلام

رسول جعفریان (متولد: ۱۹۶۴، ایران) آئمہ اہل بیت (علیہم السلام)
سلیمان بن اشعث سجستانی ابوداؤد (متوفی: ۸۸۸ء، بصرہ) سنن ابوداؤد
سیّد مرتضیٰ زبیدی (متوفی: ۱۲۰۵ھ، قاہرہ) تاج العروس
سیّد نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) تاریخ اسلام
سیّد نجم الحسن کراروی (متوفی: ۱۹۸۲ء، پاکستان) چودہ ستارے
سیّد نورالدین جزائری (متوفی: ۱۱۵۸ق، ایران) الخصائصة الزینبیة
سید محسن امین عاملی (متوفی: ۱۳۷۱ ہجری، دمشق) اعیان الشیعه
سید ہاشم بحرانی (متوفی: ۱۱۰۷ یا ۱۱۰۹ق، بحرین) غایة المرام و حجة الخصام
سید ہاشم رسولی محلّاتی (متوفی: ۱۳۹۸ء، تہران) لمحاتِ جاویداں حیات امام علیہ السلام
سید ہاشم رسولی محلّاتی (متوفی: ۱۳۹۸ء، تہران) زندگانی امیر المومنین (علیہ السلام)
سیف اللہ مدرس گرجی مختصری از باورہای اہلسنت
شاہ عبدالعزیز دہلوی (متوفی: ۱۲۳۹ ہجری، دہلی بھارت) تحفة اثنا عشریة
شاہ معین الدین احمد ندوی (متوفی: ۱۹۷۴، بھارت) تاریخ اسلام
شمس الدین ذہبی (۱۳۴۸ء، دمشق) سیر اعلام النبلاء
شمس الدین سخاوی (متوفی: ۱۴۹۷ء مدینہ) استجلاب ارتقاء الغرف بحب أقرباء الرسول
شہاب الدین ابوعبداللہ یاقوت الحموی (متوفی: ۱۲۲۹ء، حلب) معجم البلدان
شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی (متوفی: ۱۵۱۷ء، قاہرہ) المواهبُ اللدنية
شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی (متوفی: ۱۲۷۰ ہجری، بغداد) الخريدة الغيبية
شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی (متوفی: ۱۲۷۰ ہجری، بغداد) روح المعانی
شیخ ابوالحسن نجفی (متوفی: ۱۳۴۹ ہجری، رے) مجمع النورین
شیخ ابی جعفر الصدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے) علل الشرائع
شیخ ابی جعفر الصدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے)، عیون اخبار الرضا علیہ السلام
شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی (متوفی: ۱۰۳۴ ہجری، بھارت) مکتوبات

شیخ حر عاملی (متوفی: ۱۶۹۴ء، مشہد) مستدرک الوسائل
شیخ صدرالدین واعظ قزوینی (متوفی: ۱۳۳۰، ایران) ریاض القدس
شیخ صدوق ابنِ بابویہ (متوفی: ۹۹۱ء، رے) من لا یحضرہ الفقیہ
شیخ عباس قمی، منتہی الآمال فی تواریخ النبی و الآل سیرت معصومین (علیہم السلام)
شیخ عباس قمی (متوفی: ۱۳۵۹ ہجری، نجف اشرف) نفس المہموم
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: ۱۶۴۲ء، دہلی، بھارت) مدارج النبوت (اردو)
شیخ محمد بن حسن طوسی (متوفی: ۴۶۰ ہجری، نجف اشرف) تلخیص الشافی
شیخ محمد بن حسن طوسی (متوفی: ۴۶۰ ہجری، نجف اشرف) تہذیب الاحکام
شیخ محمد بن حسن طوسی (متوفی: ۴۶۰ ہجری، نجف اشرف) مصباح المتہجد
شیخ مفید (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد) الارشاد، اردو ترجمہ سیّد موسیٰ رضا، ناشران نظامی پریس بک ڈپو، لکھنؤ
شیخ مفید (متوفی: ۱۰۲۲ء، بغداد) الامالی شیخ مفید
شیخ مفید (متوفی: ۴۱۲ ہجری، کاظمین، عراق) الاختصاص
شیخ مومن بن حسن شبلنجی (متوفی: ۱۲۹۰ ہجری، مصر) نُور الابصار
صالح بن عبداللہ غامدی، الاکتفاء فی اخبار الخلفاء
صدرالدین ابراہیم بن محمد جوینی (۷۲۲ ہجری، عراق) فرائد السمطین فی فضائل المرتضی والبتول والسبطین
ضیاء الدین المقدسی (متوفی: ۶۴۳ ہجری، دمشق) الاحادیث المختارہ
عباس محمود عقاد (متوفی: مارچ ۱۹۶۴ء قاہرہ) عبقریۃ الامام علی علیہ السلام
عبدالرحمٰن ابن جوزی (متوفی: ۱۲۰۱ء، بغداد) سیرتِ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ترجمہ الوفا باحوال المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
عبدالرحمن بن عبدالسلام صفوری شافعی (متوفی: ۸۹۴ ہجری) المحاسن المجتمعہ
عبدالرحمن محبی، فضائل حج
عبدالملک ابنِ ہشام (متوفی: ۸۳۳ء، مصر) السیرۃ النبویۃ
عزالدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) اسد الغابہ

عزالدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) جامع الاصول
عزالدین ابنِ اثیر جزری (متوفی: ۶۳۰ ہجری، موصل) تاریخ کامل
علاء الدین علی بن حسام الدین متقی ہندی (متوفی: ۱۵۶۷ء مکہ) کنز العمال
علامہ الاوردبادی (متوفی: ۱۳۸۰ ہجری، نجف اشرف) حیاۃ ابی الفضل العباس
علامہ الاوردبادی (متوفی: ۱۳۸۰ ہجری، نجف اشرف) موسوعہ العلامہ الاوردبادی
علامہ باقر مجلسی (متوفی: ۱۱۱۰ ہجری، اصفہان) جلاء العیون (اردو) ناشران عباس بک ایجنسی لکھنؤ
علامہ حسین بخش جاڑا (متوفی: ۱۹۹۰ء پاکستان) تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف
علامہ سیّد ذیشان حیدر جوادی (متوفی: ۲۰۰۰ء، لکھنؤ) نقوشِ عصمت
علامہ شیخ سلیمان قندوزی (متوفی: ۱۸۷۷ء، استنبول) ینابیع المودۃ
علامہ علی نقی نقوی (متوفی: ۱۹۸۸ء، لکھنؤ) تاریخ اسلام
علامہ مجدد شیخ محمد رضا مظفر، (متوفی: ۱۳۸۳ ہجری، نجف اشرف) السقیفہ
علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، بغداد) مراۃ العقول فی شرح اخبار ال الرسول
علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی: ۱۶۹۸ء، اصفہان) حیاتُ القلوب
علامہ مرتضیٰ جعفر عاملی (متوفی: ۱۴۴۱ ہجری) الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
علامہ مفتی جعفر حسین (متوفی: ۱۹۸۳ء، لاہور) سیرت امیر المومنین علیہ السلام
علی ابنِ حسین ابنِ عبداللہ ابنِ عساکر دمشقی (متوفی: ۵۷۱ھ، دمشق) تاریخ دمشق/ تاریخ ابن عساکر
علی بن احمد سمہودی (متوفی: ۱۵۰۶ء، مدینہ منورہ) وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ
علی بن برہان الدین حلبی (متوفی: ۱۶۳۵ء، قاہرہ) السیرۃ الحلبیہ
علی بن عمر دارقطنی (متوفی: ۹۵۵ء، بغداد) المؤتلف و المختلف
علی بن عیسیٰ اربلی (متوفی: ۶۹۲ تا ۶۹۳ ہجری، بغداد) کشفُ الغُمَّۃ
علی ربانی خلخالی، چہرہ درخشان قمر بنی ہاشم
عمادُ الدین ابن کثیر (متوفی: ۱۳۷۳ء، دمشق) تاریخ ابن کثیر (البدایۃ والنہایۃ)
عمر ابن شَبّہ نمیری (متوفی: ۸۷۷ء سامراء) تاریخ المدینہ المنورہ؛ اخبار المدینہ النبویہ

عمر رضا کحالہ، (متوفی: ۱۴۰۳ھ، دمشق)، اعلام النساء
فخر الدین رازی (متوفی: ۱۲۱۰ء، ہرات) تفسیر کبیر/تفسیر قرآن ''مفاتیح الغیب''
فضل بن حسن طبرسی (متوفی: ۸۴۸ ہجری، مشہد) اعلام الوریٰ
قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری (متوفی: ۱۹۳۰ء، بھارت) کتاب: رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
محب الدین طبری (متوفی: ۶۹۴ء، مکہ) ذخائر العقبی فی مناقب ذوی القربی
محب الدین طبری (متوفی: ۶۹۴ء، مکہ) فیض القدیر
محب الدین طبری (متوفی: ۶۹۴ء، مکہ) ریاض النضرہ فی مناقب عشرہ مبشرہ
محمد ابراہیم کلباسی (متوفی: ۱۲۲۴ء، اصفہان) الخصائص العباسیہ
محمد ابنِ سعد (متوفی: ۲۳۰ ہجری، بغداد) طبقات ابنِ سعد
محمد بن اسحاق فاکہی (متوفی: ۲۷۲ تا ۲۷۹ ھجری، سعودیہ) اخبار مکہ
محمد بن اسماعیل بخاری (متوفی: ۸۷۰ء، خرتنگ، ازبکستان) صحیح بخاری
محمد بن اسماعیل امیر صنعانی (متوفی: ۱۱۸۲ ھجری، صنعاء یمن) الروضۃ الندیہ
محمد بن طلحہ الشافعي (متوفی: ۶۵۲ ھجری، دمشق) مطالب السؤول فی مناقب آل الرسول
محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (متوفی: ۱۰۱۴ء، نیشاپور) مستدرک
محمد بن عبدالواحد موصلی، النعیم المقیم لعترۃ النبا العظیم
محمد بن علی شوکانی یمنی (متوفی: ۱۸۳۴ء، صنعا) تفسیر فتح القدیر
محمد بن علی ابنِ شہر آشوب (متوفی: ۵۸۸ ہجری، حلب) مناقب آل ابی طالب
محمد بن عمر بن واقدی (متوفی: ۸۲۳ء، بغداد) التاریخ وَ المغَازِی والمَبْعث
محمد بن عمر بن واقدی (متوفی: ۸۲۳ء، بغداد) طبقات الکبری
محمد بن محمد جزری شافعی (متوفی: ۱۴۲۹ء، شیراز) حصن حصین
محمد بن مکرم ابنِ منظور (متوفی: ۷۱۱ھ، قاہرہ) لسان العرب
محمد بن یعقوب کلینی (متوفی: ۹۴۱ء، بغداد) کتاب الکافی
محمد بن یوسف زرندی حنفی (متوفی: ۷۵۰ ہجری، شیراز) معارج الوصول

محمد حسیب قادری، سیرت حضرت سیدنا علی المرتضی علیہ السلام
محمد حسین طباطبائی (متوفی: ۱۹۸۱ء، قم، ایران) تفسیر المیزان
محمد حسین ہیکل (متوفی: ۱۹۵۶ء، قاہرہ) حیاۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
محمد عمر سربازی (متوفی: ۱۳۸۵ق، پادیک) پرسش و پاسخ های ارزشمند برای جوانان
محمد ابراہیم آیتی (متوفی: ۱۳۴۳ ہجری، قم، ایران) تاریخ پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
محمدی اشتہاردی، حضرت زینب (علیہا السلام) فروغ تابان کوثر
محمدی ری شہری (متوفی: ۲۰۲۲ء تہران، ایران) دانشنامہ امیر المومنین علیہ السلام
محمود ابن عمر الزمخشری (متوفی: ۵۳۸ھ، ترکمانستان) کشاف
مستطاب مجمع الفضائل ترجمہ مناقب ابن شہر آشوب اردو ترجمہ: مولانا سید ظفر حسن، ظفر شمیم پبلی کیشنز، کراچی
مسلم بن حجاج (متوفی: ۸۷۵ء نیشاپور) صحیح مسلم
مصطفی بن حسن جنابی (متوفی: ۹۹۹ ہجری، حلب) البحر الزخار والعیلم التیار
مصطفی سباغی (متوفی: ۱۳۶۱ ہجری، ایران) زندگانی حضرت علی (علیہ السلام)
ملا فتح اللہ کاشانی (متوفی: ۹۸۸ق، کاشان) منہج الصادقین
مؤمن بن حسن شبلنجی (متوفی: ۱۲۹۰ ہجری، شبلنجا، مصر) نور الابصار
مولانا شبلی نعمانی (متوفی: ۱۹۱۴ء، لکھنؤ) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
مولانا کریم الدین حنفی (متوفی: ۱۸۷۹ء، لاہور) ترجمہ تاریخ ابوالفداء
مولانا صفی الرحمن مبارکپوری (متوفی: ۲۰۰۶ء مبارکپور، بھارت) الرحیق المختوم
نصیر الدین، السیوف المشرقۃ ومختصر الصواقع المحرقۃ
نواب صدیق حسن خان قنوجی (متوفی: ۱۸۹۰ء، بھوپال) فتح البیان فی مقاصد القرآن
نور الدین علی بن ابی بکر بن سلیمان ہیثمی (متوفی: ۸۰۷ ہجری، قاہرہ) کشف الاستار
نور الدین علی بن ابی بکر بن سلیمان ہیثمی (متوفی: ۸۰۷ ہجری، قاہرہ) موارد الظمآن
نور الدین علی بن ابی بکر بن سلیمان ہیثمی (متوفی: ۸۰۷ ہجری، قاہرہ) مجمع الزوائد
وکی پیڈیا آزاد دائرۃ المعارف

وکی پیڈیا(ur.wikpedia.org)
وکی شیعہ ڈاٹ نیٹ(ur.wikishia.net)
وکی فقہ مذہبی انسائکلو پیڈیا
ولی الدین خطیب تبریزی (متوفی: ۷۴۰ ہجری، بغداد) مشکوۃ المصابیح
ولی اللہ دہلوی (متوفی: ۱۷۶۲ء، دہلی بھارت) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء
یوسف بن فرغلی سبط ابن جوزی (متوفی: ۶۵۴ ھجری، دمشق) تذکرۃ الخواص
یوسفی غروی، (ولادت: ۱۳۲۷ھ، نجف اشرف) موسوعۃ التاریخ الاسلامی، ۱۴۱۷

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ○



مؤلف: سید حماد رضا بخاری

سیّد حماد رضا بخاری کی دیگر کتب

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ (حیاتِ طیّبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (فضائل دُرود وسلام)

صَلُّوْا عَلَیْہِ وَآلِہٖ (فضائل دُرود وسلام)

امام علی علیہ السلام (حیات طیّبہ امام علی علیہ السلام)

ناخدا (حیاتِ طیّبہ امام حسین علیہ السلام)

رَبَّنَا (قرآنی دُعائیں اور منتخب مناجات)

نمازِ شب (نمازِ تہجد، طریقہ، فضائل)

دل کی باتیں (شاعری)

چوڑیاں (ڈرامہ)

Golden Bangles (English Play)

Anger Management (A book on management of anger)